لقد کان لکم في رسول الله اسوة حسنة

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



سیرۃ النبی ﷺ

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

تخریج شدہ ایڈیشن

حصہ اول

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس میں ولادت مبارکہ، آپ کی جہادی زندگی اور اسلام سے پہلے عرب کی تاریخ کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے، نیز سیرت نگاری کے فن پر مشتمل بہترین مقدمہ اس حصے کا خاصہ ہے۔

تالیف

علامہ شبلی نعمانی

علامہ سید سلیمان ندوی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ---------- علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------- اکتوبر 2012ء

قیمت ----------------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 042-37244973 فیکس: 042-37232369

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد-پاکستان فون: 041-2631204, 2034256

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ اول

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ دوم

عرض ناشر

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الأمین أما بعد:

نبی کریم ﷺ سے محبت وعقیدت کا فطری تقاضا ہے کہ آپ کی حیاتِ مقدسہ، آپ کے شمائل و خصائل، آپ کے اخلاق واحوال اور اقوال وافعال بیان کیے جائیں اور انہیں قلم بند کرکے ہر سو عام کیا جائے، کیونکہ آپ صورت اور سیرت کے لحاظ سے کامل ترین اور امت کے لیے اسوۂ بہترین ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۱)

''تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ کی زندگی) میں اسوۂ حسنہ ہے۔''

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نویسی کا آغاز عہد نزول وحی میں ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ ﴾ (۲۱/ الانبیاء:۱۰۷)

''اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۵۹)

''اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کے ذریعے سے آپ (اپنے ساتھیوں کے لیے) بہت نرم ہیں۔ اگر آپ تند خو، سخت دل ہوتے تو وہ آپ کے پاس سے ضرور منتشر ہو جاتے۔''

رسول اللہ ﷺ کس قدر عظمت وفضیلت کے حامل تھے کہ اللہ رب العزت نے آپ کی حیاتِ طیبہ کی قسم کھائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۷۲)

''آپ کی حیاتِ مقدسہ کی قسم! یہ لوگ اپنی مدہوشی میں سرگرداں ہیں۔''

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس میں رسول اللہ ﷺ کی بہت زیادہ تکریم وتعظیم ہے۔''
(تفسیر ابن کثیر ۳/ ۱۲۲)

یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان میں سے ہر ایک سیرت النبی ﷺ جیسے عظیم موضوع پر لکھنا اور اسے شائع کرنا سعادت اور اپنی نجات کا ساماں سمجھتا ہے۔ اس موضوع پر چند اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

① کتاب السیر والمغازی از محمد بن اسحاق بن یسار رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۵۱ھ)
② السیر لأبی اسحاق الفزاری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۸۸ھ)
③ سیرت ابن ہشام از عبدالملک بن ہشام بن ایوب المعافری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۱۳ھ)
④ الشمائل المحمدیۃ از امام محمد بن عیسیٰ الترمذی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۷۹)
⑤ السیرۃ النبویۃ وأخبار الخلفاء لابن حبان رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۵۴ھ)
⑥ جامع الآثار فی السیر ومولد المختار لابن ناصر الدین الدمشقی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۴۲ھ)

مکتبہ اسلامیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ قرآن، تفسیر، حدیث، تاریخ اور علمی وتحقیقی کتب کے ساتھ ساتھ نبی رحمت کی سیرت پر اردو کی قدیم اور معتبر ترین کتاب ''رحمۃ للعالمین'' بھی شائع کر چکا ہے۔ اب اسی موضوع سے متعلق برصغیر پاک و ہند کی معروف ومشہور کتاب سیرت النبی ﷺ از علامہ شبلی نعمانی وعلامہ سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، جو ایک منفرد اسلوب کی حامل ہے۔ ہم نے اس کتاب کی اشاعت میں درج ذیل امور کا خاص خیال رکھا ہے:

☆ قدیم نسخوں سے تقابل وموازنہ۔
☆ تقابل کے بعد تسامح کی تصحیح۔
☆ آیات قرآنیہ، احادیث اور روایات کی مکمل تخریج۔
☆ آیات واحادیث کی عبارت کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔
☆ جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب کی اضافی توضیحات وتشریحات کے آخر میں (ض) لکھ کر واضح کر دیا ہے، تاکہ قاری کو کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔
☆ ظاہری وباطنی حسن کا اعلیٰ شاہکار بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

کتاب کی تخریج وتصحیح محترم ڈاکٹر محمد طیب، پروفیسر حافظ محمد اصغر، فضیلۃ الشیخ عمر دراز اور فضیلۃ الشیخ محمد ارشد کمال حفظہم اللہ نے بڑی محنت سے کی ہے، جس کے لیے میں ان قابل قدر احباب وشیوخ کا ممنون ہوں۔ کمپوزر سیکشن کے محمد شہزاد، نعیم طارق اور حافظ محمد کلیم حفظہم اللہ کو بھی اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے جنہوں نے بڑی مہارت سے کمپوزنگ وڈیزائننگ کے فرائض سرانجام دیے ہیں۔ سرورق کی خطاطی معروف خطاط حافظ انجم محمود صاحب نے بڑے ذوق سے کی ہے جو یقیناً لائقِ تحسین ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں حافظ محمد عباد حفظہ اللہ کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی جہدِ مسلسل سے کتاب کی اشاعت ممکن ہوئی۔ جزاہ اللہ خیراً

اللہ تعالیٰ ہم سب کی محنت کو قبول فرمائے اور اسے ہماری نجات کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

محمد سرور عاصم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ طبع چہارم سیرۃ النبی ﷺ جلد اول

سیرت النبی ﷺ کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت بخشی وہ مصنف اور جامع دونوں کے لیے بڑی نعمت ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات کے بعد جب سیرۃ کا مسودہ مصنف کی وصیت کے مطابق اس ہیچ مداں کے ہاتھ آیا تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے استاد سے ہونی چاہیے، استاد کے مسودہ پر انگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا، اگر کبھی بہ ضرورت ایسی گستاخی کرنی پڑتی تھی تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا، مسودہ کا مبیضہ مصنف کے سامنے ہو چکا تھا، اس لیے اس مبیضہ کا مقابلہ مسودہ سے اور نہ مسودہ کا مقابلہ اصل ماخذوں سے میں نے کیا، بلکہ مصنف کی امانت جوں کی توں ناظرین کے سپرد کر دی، بہ جز اس کے کہ بعض مقامات پر مصنف کے اشاروں کے مطابق بعض چیزوں کا اضافہ ہلالین میں کر دیا جس کی تصریح دیباچہ میں موجود ہے۔

اس کے بعد اس نسخہ کی نقل در نقل چھپتی رہی اور مقابلہ اور تصحیح ماخذ کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن اس اثنا میں کبھی کبھی مراجعت کے وقت بعض مقاموں پر تصحیح اور اضافہ کی نئی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور اس کے مطابق ایک نسخہ پر یہ تصحیحات اور اضافے وقتاً فوقتاً کرتا رہا۔

اس دفعہ جب نئے نسخے کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے مسودہ کو اصل ماخذوں سے ملا کر دیکھا جائے اور مقابلہ اور مطابقت کی جائے، یہ بڑا مشکل کام تھا، بیسوں کتابوں کو پھر سے دیکھنا اور ہزاروں صفحوں کو الٹنا، متعدد مختلف روایتوں کو پرکھنا اور ضرورت کے مقام پر حاشیے لکھنا، خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی، مجھے یہ لکھنے میں بڑی خوشی ہے کہ لائق عزیز مولانا محمد اویس نگرامی ندوی اس کام میں میرے دست و بازو ثابت ہوئے، واقعات کی تلاش اور جانچ، روایتوں کی چھان بین اصل عبارتوں سے مسودہ کی تطبیق اور حدیث اور سیرت کی کتابوں کی طرف از سرِ نو مراجعت میں ان سے بڑی مدد ملی۔

کچھ مقام ایسے بھی تھے جہاں اس ہیچ مداں جامع کو مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا، اس دفعہ وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کر دیا، کہیں کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل یا دفعِ شبہہ کی ضرورت تھی، وہاں اس ضرورت کو پورا کیا گیا، بعض مسامحات پر تنبیہ مناسب تھی وہ کی گئی، کہیں فروتر ماخذ کا حوالہ تھا اور اثنائے مطالعہ میں اس سے بالاتر ماخذ ملا تو اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ دو چار مقام میں عدد کی غلطی جو اردو ہندسوں میں اکثر ہو جاتی ہے اصل مبیضہ میں بھی موجود تھی، مراجعت کے وقت ان کی غلطی معلوم ہوئی اور اب ان کی تصحیح کر دی گئی، مثلاً حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کی قیمت سوا روپے چھپ گئی تھی، حالانکہ وہ سوا سو ہے، اسی طرح غزوۂ احزاب میں کفار کے لشکر کی تعداد ۲۴ ہزار درج ہوئی تھی، حالانکہ وہ بعض روایات میں ۱۴ ہزار لیکن صحیح روایات میں ۱۰ ہزار ہے۔

مولانا کی زندگی میں اس کی تصنیف کے وقت ان کو بعض کتابیں قلمی ملی تھیں، جیسے روض الانف جس سے پورا استفادہ وقت طلب تھا، اب وہ چھپ گئی ہے، بعض کتابوں کی ان کو تلاش ہی رہی، مگر ان کو مل نہ سکی، جیسے کتاب البدایہ والنہایہ ابن کثیر، مصنف سے اکثر حسرت کے ساتھ سنا کہ افسوس تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی، وہ مل جاتی تو ساری مشکلیں حل ہو جاتیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب وہ چھپ کر عام ہو گئی، مستدرک حاکم اس وقت تک ناپید تھی، اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی، غرض ان کتابوں کے ہاتھ آ جانے سے بہت سے نئے معلومات بڑھ گئے، چنانچہ اس نسخہ کی تصحیح واضافہ میں ان سے کام لیا گیا۔

اس نسخہ کی تیاری میں جن خاص باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ پوری کتاب کے واقعات کو ازسرِ نو حدیث وسیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے اور اس میں جہاں نقص نظر آیا دور کیا گیا ہے۔

۲۔ تصحیحِ بیان، دفعِ شبہہ، رفعِ ابہام اور تشریح کے لیے بہت سے توضیحی حواشی بڑھائے گئے ہیں۔

۳۔ مصنف کا کوئی بیان اگر نقد اور تنبیہ کے قابل معلوم ہوا تو اس پر نقد اور تنبیہ کی گئی ہے۔

۴۔ کہیں کہیں حوالے چھوٹ گئے تھے، اس نسخہ میں ان کو بڑھا دیا گیا ہے، کہیں صرف کتابوں کے نام تھے، اس دفعہ ان کے صفحے یا باب بھی لکھ دیئے گئے۔

۵۔ جہاں صرف صفحوں کے حوالے تھے، ابواب اور فصول کے حوالے بھی دیئے گئے، تاکہ جس کے پاس ماخذ کی کتاب کا جو ایڈیشن ہو اس میں نکال کر دیکھ لیا جا سکے۔

۶۔ طبع اول کے بعد سے سیرت یا حدیث کی جو نئی کتابیں چھپی تھیں، ان سے استفادہ کر کے اگر کوئی نئی بات ان میں ملی ہے تو اس کا اضافہ کیا گیا۔

۷۔ اگر کوئی حوالہ پہلے کسی نیچے درجہ کا تھا اور بعد کو اس سے اعلیٰ درجہ کا حوالہ ملا تو بڑھایا گیا۔

۸۔ حضور انور ﷺ کے نام مبارک کے ساتھ صلعم کے اختصار کے بجائے پورا ﷺ لکھنے کا اہتمام کیا گیا تاکہ اس تساہل سے درود پڑھنے کی برکت سے ناظرین کو محرومی نہ ہو۔

غزوۂ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچ مداں کے خطا کار قلم سے حضرت

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی، جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے اور اب میں اپنی غلطی و نادانی کو مان کر اس عبارت کو قلم زد کر کے صحابی رسول ﷺ کی برأت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں۔

بندہ ہماں بہ کہ زتقصیرِ خویش   عذر بہ درگاہ خدا آورد

جن لوگوں کے پاس اس سے پہلے کے نسخے ہوں وہ اپنے نسخہ سے [1] ان سطروں کو کاٹ دیں تو بڑی مہربانی ہو، اب یہ موجودہ نسخہ طبع اول سے بہت سی باتوں میں بہتر ہو گیا ہے، اس موجودہ نسخہ میں انسانی استطاعت کے مطابق پوری طرح تصحیح کی بھی کوشش کی گئی ہے، تاہم انسان انسان ہے، خطا و نسیان اس کا خمیر ہے، کسی ناظرِ کتاب کو اب بھی کوئی غلطی معلوم ہو تو وہ ضرور مطلع فرما کر ممنونِ کرم کریں۔

آخر میں پاک پروردگار کی بارگاہ عالی میں دعا ہے کہ وہ میری خطا و نسیان سے درگزر فرما کر اس خدمت کو قبول کا شرف بخشے اور مسلمانوں کو اس سے بیش از بیش مستفید فرما کر اس گنہ گار کے لیے بخشائش کا ذریعہ بنائے، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہیچمداں

سید سلیمان ندوی

یکم جمادی الثانیہ ۱۳۶۴ھ

---

[1] یہ عبارت سیرۃ النبی ﷺ جلد اول طبع اول کے صفحہ ۲۵۵ کی سطر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ اور طبع مابعد کے صفحہ ۳۲۳ کی سطر ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ میں ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرتِ نبوی ﷺ جلد اول طبع اول کو شائع ہوئے آج چار برس ہوئے، اس اثنا میں خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ ہم خاکسارانِ دار المصنفین کے لئے فخر و نازش کا سرمایہ ہے، نہ صرف یہ کہ عام قدر دانوں نے اس کو دل و جان سے خریدا اور امراء اور والیانِ ممالک نے اس کی خدمت کو سعادتِ دارین سمجھا بلکہ خواص اور علما کے طبقہ نے بھی اس کی قدر شناسی کی۔

ہندوستان میں اہل علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے اپنے فن کی میزان نقد میں سیرت کے مضامین و تحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیات قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظر ثانی کی، اہل تاریخ و سیر نے واقعات کی جانچ پڑتال کی اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص و محبت سے انہوں نے اپنے نتائج افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

طبع اول میں جیسا کہ خاتمہ میں ہم نے اقرار کیا تھا، چھاپہ کے اغلاط اور سہو کے چند مسامحات رہ گئے تھے، اس طبع میں جہاں تک امکانِ انسانی ہے تصحیح کی انتہائی کوشش کی گئی ہے اور یقین ہے کہ ان شاء اللہ یہ اغلاط اور مسامحات سے پاک ہوگا، جو لوگ سیرت پر نقد کرنا چاہتے ہوں، ان کو یہی نسخہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

طبع اول بڑی تقطیع پر شائع ہوئی تھی، لوگوں کا اصرار تھا کہ طبع ثانی کتابی تقطیع پر شائع ہو، تا کہ وہ بہ آسانی ہر وقت استعمال میں آسکے، یہ ان کی تعمیل ہے، ان شاء اللہ ہر جلد کے طبع اول کی بڑی تقطیع کے بعد طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر شائع ہوتی رہے گی۔

سید سلیمان ندوی

۲۸۔ ذیقعدہ ۱۳۴۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

سیرت نبوی ﷺ جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے، آج ۷ سال کے بعد اس کی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ میں جاتی ہے، میں اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہوں کہ استاد محترم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں جو فرض میرے سپرد کیا تھا، الحمدللہ کہ اس کے ایک حصہ سے آج سبکدوش ہوتا ہوں۔ ع

شادم از زندگئ خویش کہ کارے کردم

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ حسرتناک منظر بھی سامنے ہے کہ مصنف اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کر سکا اور حسن عقیدت کے جو پھول سینکڑوں چمن کدوں سے چمن کران کے ہاتھ آئے تھے، ان کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا۔

مصنف مرحوم کو سیرت نبوی ﷺ کے لکھنے کا خیال الفاروق کے بعد ہی پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ ۱۳۲۳ھ میں اس کا ایک مختصر سا حصہ یعنی غزوۂ اُحد تک وہ لکھ بھی چکے تھے [1] کہ بعض مشکلات کی بنا پر رک گئے، لیکن ملک کا تقاضائے شوق برابر جاری رہا، بالآخر انہوں نے ۱۳۳۰ھ میں اس بار امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کر لیا، چنانچہ پچاس ہزار روپے کے سرمایہ کے لئے انہوں نے قوم میں مرافعہ پیش کیا، سینکڑوں مسلمان اس خدمت کے لئے آگے بڑھے، ان میں فقرائے امت بھی تھے اور امرائے ملت بھی، لیکن یہ سعادت اخروی ازل ہی سے خادمة الملة النبوية مخدومة الامة المحمدية نواب سلطان جہاں بیگم تاج الہند فرمان روائے بھوپال متع الله المسلمين بطول بقائها و دوام ملكها کے لئے مقدر تھی، اس لئے وہ سب سے آگے بڑھیں اور سوانح نگار نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایہ سعادت کو اپنے خزانہ عامرہ میں شامل کر لیا، فرمانروا خواتین اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دیے ہیں، آیندہ مؤرخ غالباً اس کارنامہ کو ان میں سب سے بڑا قرار دے گا کہ اس کا تعلق اس ذاتِ اقدس ﷺ سے ہے، جو اسلام کی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد شاید دوبارہ اس خدمت گزاری کیلئے مسلمانوں میں قرعہ اندازی ہوتی، لیکن فرمان روائے بھوپال نے مصنف کے جانشینوں کے لئے بھی سلسلۂ فیض کو برابر جاری رکھا، مصنف مرحوم کے منشا کے مطابق [2] اس موقع پر منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال کا نام لینا بھی ضروری ہے جن کی

[1] یہ مسودہ اب تک موجود ہے۔ [2] مکاتیب شبلی جلد اول، صفحہ: ۲۶۱۔

مروحہ جنبانی سے نسیم سعادت کے یہ جھونکے اس باغ قدس میں دوبارہ آئے۔

مصنف مرحوم نے جو مسودہ چھوڑا تھا، اس میں اس حصہ تک مبیضہ صاف تھا، البتہ تین چار مقامات پر اضافہ کی علامت بنی تھی اور مطالب کا اشارہ تھا، ان کو بڑھا دیا گیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ کی تکمیل کے بعد ان کو خیال آیا کہ قدیم مؤرخین کی طرح سنہ وار واقعات کی ترتیب رکھ کر ہر سنہ کے آخر میں جزئی حالات ''واقعات متفرقہ'' کے عنوان سے لکھ دیے جائیں، چنانچہ مبیضہ پر ۴ھ تک اپنے قلم سے وہ لکھ سکے، یہ امانت جب میرے سپرد ہوئی تو میں نے بقیہ سنین کے آخر میں اسی قسم کے جزئیات متفرقہ کا اضافہ کر دیا، حواشی یا حوالے کہیں کہیں چھوٹ گئے تھے، وہ ڈھونڈ کر لکھے، لیکن اس کی کامل احتیاط کی گئی کہ جامع کا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں نہ ملنے پائے، چنانچہ ان تمام جزئی اضافوں کو قوسین کے اندر جگہ دی گئی ہے، اس بنا پر لفظ ''ﷺ'' یا جملہ ہائے معترضہ کے علاوہ جو چند فقرے اور علامتیں قوسین میں ہیں وہ اضافہ ہیں۔

یہ پہلے خیال تھا کہ جلد اول کو وفات تک وسعت دی جائے، لیکن جب کتابت شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضخامت ۸۰۰ صفحات کو پہنچ جائے گی اور اس سے جلد کی نفاست کو صدمہ پہنچے گا، سامانِ طبع کی گرانی سے جو تعویق پیدا ہو رہی تھی، اس نے مجبور کیا کہ اس کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا جائے، چنانچہ پہلی جلد سلسلۂ جنگ و غزوات پر ختم کر دی گئی اور دوسری جلد اسلام کی امن کی زندگی، تنظیم و تنسیق، اشاعت اسلام، وفات اور اخلاق کی الگ کر دی گئی، خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی طبع و اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾

مصنف مرحوم کتاب کا سرنامہ لکھنے نہ پائے تھے، ان کے مسودات میں اتفاقاً یہ تحریر قلم زدہ مل گئی، اسی کو غنیمت سمجھ کر تبرکاً داخل کتاب کیا جاتا ہے۔

جامع

سید سلیمان ندوی

۲۰/ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

سر نامہ

ایک گدائے بے نوا، شہنشاہِ کونین کے دربار
میں، اخلاص وعقیدت کی نذر لے کر آیا ہے،

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

"شبلی"
شوال ۱۳۳۰ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

(فن روایت)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ.

سیرت نبوی کی تالیف کی ضرورت

عالم کائنات کا سب سے مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق وتربیت کی اصلاح وتکمیل کی جائے، یعنی پہلے ہر قسم کے فضائل اخلاق، زہد وتقویٰ، عصمت وعفاف، احسان و کرم، حلم وعفو، عزم وثبات، ایثار ولطف، غیرت واستغنا کے اصول وفروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ وپند ہے، اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فنِ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے، ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسن اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا، لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر وزور سے کام لیا جائے، بلکہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جس کی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ، اوامر سلطانی بن جائے، دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے، سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اور اسباب صرف ایوان تمدن کے نقش ونگار ہیں۔

پیغمبروں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی فضیلت

لیکن اس وقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے، اس نے اس قسم کے نفوسِ قدسیہ جو پیش کئے ہیں، وہ فضائلِ اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً: جناب مسیح علیہ السلام کے مکتب درس میں صرف حلم وتحمل، صلح وعفو، قناعت وتواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت وفرمانروائی کے لئے جو فضائل واخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراق تعلیم میں عفو عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی اور اس لئے عالمِ انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامعِ کامل [1]

[1] یہاں پر کتاب کی اس عبارت بالا کے مخاطب اہل کتاب ہیں جن کے موجودہ صحیفوں میں ان انبیاء علیہم السلام کے جو احوال مذکور ہیں، وہ اسی صورت میں ہیں، اس لئے مصنف نے ان کے بیان کردہ تمام احوال کو مان کر ایک باکمال اور ہمہ کمال ہستی کی ضرورت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کا محتاج رہا جو صاحب شمشیر و نگین بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمان روائے جہاں بھی ہو اور سُبحہ گرداں بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریا دل بھی، یہ برزخ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفۂ یزدانی، عالم کون کی آخری معراج ہے۔﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳) ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا۔''

عالم فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لئے یہ ہستی جامع، دنیا میں آ کر ہمیشہ نہیں رہ سکتی، اس لئے ضرور

(گزشتہ سے پیوستہ) پر ان کے سامنے حجت قائم کی ہے۔ لیکن چونکہ از روئے اسلام ایک طرف تمام انبیا علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۳۶) ''ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔'' اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالاتِ نبوت سے متصف مانا جائے، دوسری طرف ارشاد ہے:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۵۳)

''یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے اُن میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا اور ہم نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبرائیل علیہ السلام) سے فرمائی۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے مراتب کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام تمام کمالات نبوت وفضائل اخلاق سے یکساں سرفراز تھے مگر زمانہ اور ماحول کے ضروریات اور مصالح الٰہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور تمام انبیا میں یکساں نہیں ہوا بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوئے، یعنی جس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شدت سے ظاہر ہوا اور دوسرے کمال کا جس کی اس وقت ضرورت پیش نہیں آئی، بہ مصلحت یہ کمال ظہور نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لئے مناسب موقع ومحل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کسی عارض کی وجہ سے کسی کمال کا ظہور نہ ہو تو اس سے نفس کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے، اس لئے اگر بوجہ عدم ضرورتِ حال ان انبیائے کرام علیہم السلام کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت میں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات وفضائل سے متصف نہ تھے۔

غزوۂ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینے کا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے شدت ورحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں۔ اے ابوبکر! تمہاری مثال ابراہیم وعیسیٰ علیہما السلام کی اور اے عمر! تمہاری مثال نوح وموسیٰ علیہما السلام کی ہے یعنی ایک فریق سے رحم وکرم کا اور دوسرے سے شدت کا اظہار ہوا۔'' (تفصیل کے لئے دیکھئے: مسند احمد، ج ۱، ص: ۳۸۳)

اس حدیث میں اسی نقطہ اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو انبیا علیہم السلام کے مختلف احوال مبارکہ میں رونما رہا ہے لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی ہے، اس لئے بہ ضرورت احوال آپ کے تمام کمالات نبوت آپ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوئے اور آپ کی نبوت کے آفتاب عالم تاب کی ہر کرن دنیا کے لئے مشعل ہدایت بنی اور ظلمت کدہ عالم کا ہر گوشہ آپ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پُرنور ہوا۔ (ﷺ)، اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو نعوذ باللہ پیدا نہ ہونے پائے جس سے دوسرے انبیا علیہم السلام کی توہین یا کسر شان پیدا ہو کہ اس سے ایمان کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے (معارف محرم وصفر ۱۳۵۶ھ/۹/ مطابق مارچ واپریل: ۱۹۳۷ء) میں مضمون ''خلیل کی بشریت'') س۔

ہے کہ اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی حرکات وسکنات کی ایک ایک ادا، اس کے حلیۂ وجود کے ایک ایک خط وخال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحل زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے رہنمائی کے کام آئے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام داعیان مذہب جامعیت کبریٰ کے وصف سے خالی تھے، ان کے کارنامہ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام لی گئیں، جناب مسیح علیہ السلام کی ۳۳ سالہ زندگی میں سے صرف ۳ برس کے حالات معلوم ہیں، فارس کے مصلحان دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر، افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے اس کا ذریعہ صرف موجودہ تورات ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ۳۰۰ برس بعد عالم وجود میں آئی، یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ ان کے کارنامے اور اصول تعلیم ابدی نہ تھے، اس لئے نقل وروایت کے آئینہ میں جس قدر ان کا ناتمام عکس اترا اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا۔ قدرت، خود ضرورت کی اندازہ داں ہے اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے۔

تمام ارباب مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اسی قدر عزیز ہے جس قدر دوسرے کو ہے، اس لئے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیت کبریٰ کا وصف نمایاں تھا؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئیں گی، لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے کہ دنیا میں وہ کون شخص گزرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی، اس طرح قلمبند ہوا کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لئے بھی نہ ہو سکا اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال وافعال، وضع وقطع، شکل وشباہت، رفتار وگفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طرز زندگی، طریق معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہو سکتی ہے (محمد عربی فدیتہ بابی و امی)

سیرت کی ضرورت علمی حیثیت سے

یہ جو کچھ کہا گیا، مقصد تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم وفنون کی صف میں سیرت (بائیوگرافی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالات زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیل راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرۂ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، ستاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی وعمل، جدوجہد، ہمت وغیرت کی جو عجیب وغریب نیرنگیاں سکندر اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات

میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو "شخص" کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں، وہ کس وسعت اور استقصا و تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں، تاکہ مراحل زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ و خم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آ جائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فرد کامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

وجوہ مذکورۂ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں، بلکہ تمام عالم کو اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے، جس کا نام مبارک "محمد" (رسول اللہ) ﷺ ہے۔ (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْهِ وَسَلِّمْ صَلٰوۃً کَثِیْرًا کَثِیْرًا) یہ ضرورت، صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ ہے کہ مجموعۂ ضروریات دینی و دنیوی ہے۔

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرضِ اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرت نبوی ﷺ کی خدمت انجام دیتا، لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکا، تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔

علمِ کلام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت

اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت، صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضینِ حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب، صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیرِ الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مؤرخین، آنحضرت ﷺ کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام ﷺ کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر ﷺ کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اس کے منصبِ نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنہوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا اور میں نے سیرت نبوی ﷺ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے

کا ارادہ کرلیا، یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہوسکتی۔

سیرت اور حدیث کا فرق

آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ خاص سیرت [1] پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی

---

[1] (اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کردینے کے قابل ہے، جو آج کل کی قلت علم اور ناآشنائی فن نے پیدا کردی ہے، بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فن حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے، یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیے گئے جو آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں، تو یہ سیرت بن گئی اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں، مثلاً: صحیح بخاری و مسلم، تو یہ کہنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ ''سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی''۔ اس بحث کے ذہن نشین کرنے کے لئے امور ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں:

(1) پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے؟ محدثین اور ارباب رجال کی اصطلاح قدیم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے، چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور سیرت بھی، حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ فقہ کی بھی یہی اصطلاح ہے، فقہ میں جو باب کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہیں، اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

کئی صدی تک یہی طریقہ رہا۔ چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہوئیں، مثلاً: سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ، ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں، البتہ زمانہ مابعد میں، مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں، مثلاً: مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فن حدیث سے ایک الگ چیز ہے، یہاں تک کہ بعض موقعوں پر ارباب سیر اور محدثین، دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام ارباب سیر ایک طرف ہوتے ہیں اور امام بخاری و مسلم ایک طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام ارباب سیر کے خلاف ہے، لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے، ہم اس موقع پر ایک دو واقعہ مثال کے طور پر لکھتے ہیں:

☆ غزوات میں ایک غزوہ ذوقرد کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت ارباب سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا، لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے جو روایت ہے [مسلم، کتاب الجهاد، رقم: ۱۸۰۷] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل کا واقعہ ہے، اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے:

لا يختلف اهل السير ان غزوة ذى قرد كانت قبل الحديبية فيكون ما وقع فى حديث سلمة من وهم بعض الرواة۔

''اہل سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوۂ ذی قرد، حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے، وہ کسی راوی کا وہم ہوگا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری (ذکر غزوۂ ذی قرد) میں قرطبی کے اس قول پر بحث کرکے لکھتے ہیں:

فعلى هذا ما فى الصحيح من التاريخ لغزوة ذى قرد صح مما ذكره اهل السير۔

''تو اس بنا پر صحیح (مسلم) میں غزوۂ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے جو مصنفین سیرت نے بیان کی ہے۔''

☆ دمیاطی ایک مشہور محدث ہیں، انہوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے جو آج بھی موجود ہے، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

گئی، جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا، حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، سیرت نبوی میں لکھتے ہیں:

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ماصح وما قد انکرا

''یعنی طالب فن کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں، صحیح بھی اور قابل انکار بھی۔''

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلم الثبوت تصنیفات میں بھی، بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہو گئیں، اس بنا پر ضروری تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث ورجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں اور پھر نہایت تحقیق اور تنقید سے

(گزشتہ سے پیوستہ) اس میں انہوں نے اکثر موقعوں پر ارباب سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے، چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے، اس لئے نہ کر سکے۔ حافظ ابن حجر خود دمیاطی کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

ودل ھذا علی انه کان یعتقد الرجوع عن کثیر مما وافق فیه اھل السیر و خالف الاحادیث الصحیحة وان ذلك کان به قبل تضلعه منها ولخروج نسخ کتابه و انتشاره لم یتمکن من تغییره.
(زرقانی برمواہب، جلد ۳، صفحہ: ۱۱)

''اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ (یعنی دمیاطی) قصد کر چکے تھے کہ جن موقعوں پر انہوں نے ارباب سیر سے اتفاق کر کے احادیث صحیحہ کی مخالفت کی ہے، ان سے رجوع کریں گے اور یہ کہ یہ امر ان سے مہارت فن سے قبل صادر ہوا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے شائع ہو چکے تھے اس لئے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نہ کر سکے۔''

② ایک غزوہ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت اکثر ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر کے قبل واقع ہوا تھا، لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ خیبر کے بعد واقع ہوا۔ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ ذات الرقاع اس پر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:

و اما شیخه الدمیاطی فادعی غلط الحدیث الصحیح و ان جمیع اھل السیر علی خلافه.
(فتح الباری، جزء ہفتم، صفحہ: ۳۲۲)

''باقی ان کے شیخ دمیاطی تو انہوں نے حدیث صحیح کی نسبت اس بنا پر غلطی کا دعویٰ کیا ہے کہ تمام اہل سیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں۔'' حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے اس کا رد بھی کیا ہے۔

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہ فن حدیث نہیں ہے اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخوذ ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

③ مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں، وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں، اس لئے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔

④ جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا، آج بیسیوں کتابیں قدماء سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں۔ مثلاً: سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ، کسی میں یہ التزام نہیں۔

تفصیل مذکورۂ بالا سے ظاہر ہوا ہوگا کہ ہماری اس عبارت کا کہ ''سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی'' اس کا کیا مطلب ہے اور کہاں تک صحیح ہے۔

ایک مستند تصنیف تیار کی جائے ،لیکن سینکڑوں کتابوں کا استقصا کے ساتھ دیکھنا اوران سے معلومات کا اقتباس کرنا ،ایک شخص کا کام نہ تھا ،اس کے ساتھ ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ یورپ میں آنحضرت ﷺ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے ،اس سے واقفیت حاصل کی جائے ۔میں بدقسمتی سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا ،اس لئے ایک محکمۂ تصنیف کی ضرورت تھی ،جس میں قابل عربی دان اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں ، خدا نے جب یہ سامان پیدا کر دیئے تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا ،اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی تھی ۔

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے اور نہ آیندہ توقع کی جا سکتی ہے ،اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ ﷺ کو دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کیے گئے اور اس زمانہ میں کئے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا ۔طبقات ابن سعد ،کتاب الصحابۃ لابن السکن ،کتاب لعبداللہ بن علی بن جارود ،کتاب العقیلی فی الصحابۃ ،کتاب ابن ابی حاتم الرازی ،کتاب الارزق ،کتاب الدولابی ،کتاب البغوی [1] طبقات ابن ماکولا ،اسد الغابۃ ،استیعاب ،اصابہ فی احوال الصحابۃ ،صرف انہی بزرگوں کے حالات میں ہیں ۔کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقا میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درج تحریر ہو سکتے ہیں ؟

سیرت نبوی ﷺ کے متعلق قدما نے جو ذخیرہ [2] مہیا کیا ،اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت ہم اس غرض سے اس موقع پر درج کر دیتے ہیں کہ ایک کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لئے اس ذخیرہ سے کیونکر کام لیا جا سکتا ہے اور کہاں تک تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے ۔

فن سیرت کی ابتدا اور تحریری سرمایہ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور اسلام میں تدوین و تالیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ سے (تقریباً ۱۴۳ھ میں) ہوا ۔اس لئے اس زمانہ تک سیرت اور روایات کا جو کچھ ذخیرہ تھا ۔زبانی تھا ۔تحریری نہ تھا ۔لیکن یہ خیال صحیح نہیں ۔عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج (گو کم سہی) مدت سے چلا آتا ہے ،بہت قدیم زمانہ میں حمیری اور نباتی خط تھا ۔جس کے کتبے آج نہایت کثرت

---

[1] ان کتابوں کا ذکر استیعاب کے دیباچہ میں ہے ۔

[2] ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں ،تاہم تنہا ان سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہو سکتی ۔اس کے علاوہ ان میں تاریخی ترتیب نہیں ہے ،یہاں ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے ،حدیث کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں ۔

سے یورپ کی بدولت مہیا ہو گئے ہیں۔ اسلام سے کچھ پہلے وہ خط ایجاد ہوا جو عربی خط کہلاتا ہے اور جس نے بہت سی صورتیں بدل کر آج یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

اس خط کی تاریخ اور اس کی ابتدا کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں اکثر افسانہ ہیں، مثلاً: ابن الندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ اول اول جن لوگوں نے عربی خط ایجاد کیا ان کے نام یہ تھے ابوجاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفص، قریشیا (یہی نام ہیں جن کو ہم آج ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت کہتے ہیں) اسی طرح کعب کا یہ قول کہ تمام خطوط حضرت آدم علیہ السلام نے ایجاد کئے تھے، ابن الندیم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی خط لکھا وہ تین شخص قبیلہ بولان (قبیلہ طے کی ایک شاخ) کے تھے، جو انبار میں آباد تھے، ان کے نام مرامر بن مرہ، اسلم بن سدرہ، عامر بن جدرہ تھے۔

ان تمام روایتوں میں جو قرین قیاس ہے، وہ روایت ہے جو ابن الندیم نے عمرو بن شعبہ کی کتاب مکہ سے نقل کی ہے، یعنی سب سے پہلے عربی خط ایک شخص نے ایجاد کیا جو بنو مخلد بن نضر بن کنانہ کے خاندان سے تھا اور غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب قریش نے عروج حاصل کر لیا تھا اور تجارت کے ذریعہ سے بیرونی ممالک میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز دیکھی تھی جو عبدالمطلب بن ہاشم (آنحضرت ﷺ کے جد امجد) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس کے الفاظ یہ تھے:

> حق عبدالمطلب بن هاشم من اهل مكة على فلان بن فلان الحميری من اهل وزل صنعاء عليه الف درهم فضة كيلا بالحديدة و متى دعاه بها اجابه شهد الله و الملكان. [1]
>
> ''یہ عبدالمطلب بن ہاشم (جو مکہ کا باشندہ ہے) کا قرضہ فلاں شخص پر ہے جو صنعا کا رہنے والا ہے، یہ چاندی کے ہزار درہم ہیں، جب طلب کیا جائے گا وہ ادا کرے گا، خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں۔''

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیئے تھے، خاتمہ میں دو فرشتوں کی گواہی لکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فرشتوں کا (اور شاید کراماً کاتبین کا) اعتقاد موجود تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتوں کا خط ہوتا ہے۔

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی جب بعثت ہوئی تو قریش میں ۱۷ شخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یعنی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت ابوعبیدہ، طلحہ، یزید بن ابی سفیان، ابوحذیفہ بن عتبہ، ابوسفیان، شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ [2]

---

[1] الفهرست ابن نديم، ص: ۷، ۸، مطبع رحمانيه مصر۔ (س)

[2] فتوح البلدان ذكر خط، ص: ۴۷۱، ۴۷۲، مطبعه بريل ليڈن يورپ: ۱۸۶۶۔

بدر کی لڑائی جو ۲ھ میں ہوئی، اس میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے، ان سے فدیہ لیا گیا، لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکے، آنحضرت ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچوں کو اپنے ذمہ لے کر ان کو لکھنا سکھا دے، چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جو کاتب وحی ہیں، اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔ ❶

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا، البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلمبند ہوئی تھیں یا نہیں اور اس بنا پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا یا نہیں، بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں، تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حدیثوں کے قلمبند کرنے سے منع فرمایا تھا، مسلم کے یہ الفاظ ہیں:

((لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ وَمَنْ كَتَبَ عَنِّيْ غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ)) ❷

''مجھ سے جو سنو، اس کو قلمبند نہ کرو، بجز قرآن کے اور کسی نے قلمبند کیا ہو تو اس کو مٹا ڈالنا چاہیے۔''

آنحضرت ﷺ کے زمانہ کی تحریریں

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے کیونکہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ ہی کے زمانہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت ﷺ کی اجازت سے آپ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں، البتہ عبداللہ بن عمرو مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا''۔ ❸

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ آنحضرت ﷺ سے جو سنتے تھے، لکھ لیا کرتے تھے، قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت ﷺ کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں، کبھی خوشی میں اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا، آپ نے دہان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ''تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔'' ❹ خطیب بغدادی نے اپنے رسالہ تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبداللہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں قلمبند کر لیا کرتے تھے ''صادقہ'' تھا۔ ❺

---

❶ طبقات ابن سعد، غزوۃ بدر جزء۲، ق اول، صفحہ: ۱٤۔ ❷ مسلم، کتاب الزهد، باب التثبت فی الحدیث: ۷۵۱۰۔ ❸ بخاری، کتاب العلم، باب کتابة العلم: ۱۱۳۔

❹ ابو داود، کتاب العلم، باب فی کتابة العلم: ۳٦٤٦۔

❺ جامع بیان العلم للقاضی ابن عبدالبر، مطبوعہ مصر، صفحہ: ۷۷ میں صادقہ کا ذکر ہے۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے ہیں، ان کے نام قلمبند کئے جائیں، چنانچہ پندرہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام دفتر میں درج کئے گئے۔ [1]

خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ ”جب لوگ کثرت سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ تو وہ ایک جنگ نکال لاتے تھے، کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن کر لکھ لی تھیں۔“

متعدد قبائل کو آپ نے جو صدقات اور زکوۃ وغیرہ کے احکام بھیجے وہ تحریری تھے اور کتب احادیث میں بعینہٖ منقول ہیں، اسی طرح سلاطین کو دعوت اسلام کے جو پیغام بھیجے گئے وہ بھی تحریری تھے۔

صحیح بخاری (باب کتابۃ العلم: ۱۱۲) میں ہے کہ فتح مکہ کے سال جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کر دیا تو آنحضرت ﷺ نے ناقہ پر سوار ہو کر خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص نے آ کر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرا دیا جائے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اس شخص کے لئے وہ خطبہ قلمبند کرا دیا جائے۔

غرض اس طرح آنحضرت ﷺ کی وفات تک حسب ذیل تحریری سرمایہ مہیا ہو گیا تھا۔

1. جو حدیثیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، یا حضرت علی و حضرت انس رضی اللہ عنہم وغیرہ نے قلمبند کیں۔ [2]
2. تحریری احکام اور معاہدات (حدیبیہ وغیرہ) اور فرامین جو آنحضرت ﷺ نے قبائل کے نام بھیجے۔ [3]
3. خطوط جو آنحضرت ﷺ نے سلاطین اور امراء کے نام ارسال فرمائے۔ [4]
4. پندرہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام۔

آنحضرت ﷺ کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ (بنو العباس سے پہلے) ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں۔ [5]

مغازی

عرب میں علوم و فنون نہ تھے، صرف خاندانی معرکے اور لڑائیوں کے واقعات محفوظ رکھتے تھے، اس لحاظ سے قیاس یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کے واقعات اور افعال و اقوال میں سب سے پہلے مغازی کی روایتیں پھیلتیں اور سب سے پہلے اسی فن کی بنیاد پڑتی، لیکن روایات کے تمام انواع میں مغازی کا درجہ سب سے متاخر

---

[1] بخاری، کتاب الجهاد، باب کتابة الامام الناس: ۳۰۶۰۔

[2] بخاری، کتاب العلم، باب کتابة العلم: ۱۱۱ تا ۱۱۴؛ ابوداود، کتاب العلم: ۳۶۴۹۔

[3] سنن ابن ماجه، کتاب الزکوة، باب صدقة الابل: ۱۷۹۸؛ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی صلح العدو: ۲۷۶۵۔

[4] بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول الله ﷺ: ۷، باب ما یذکر فی المناولة: ۶۴، ۶۵۔

[5] تذکرة الحفاظ علامه ذهبی، تذکرة امام زهری، ص: ۱۰۰۔

رہا، خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے زیادہ تر آنحضرت ﷺ کے ان اقوال وافعال پر توجہ کی، جن کو شریعت سے تعلق تھا اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے تھے۔

امام بخاری نے غزوۂ اُحد کے ذکر میں سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے:

صحبت عبدالرحمن بن عوف وطلحة بن عبيد الله والمقداد وسعدًا فما سمعت احدًا منهم يحدث عن النبي ﷺ الا انى سمعت طلحة يحدث عن يوم أُحدٍ. ❶

''میں عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ بن عبید اللہ اور مقداد اور سعد رضی اللہ عنہم کی صحبت میں رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی آنحضرت ﷺ کے متعلق حدیث بیان کرتے نہیں سنا بجز اس کے کہ طلحہ رضی اللہ عنہ غزوۂ احد کا واقعہ بیان کرتے تھے۔''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ ومقداد اور سعد بن ابی وقاص، اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہیں اور ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، اس لئے اس عبارت کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ غزوات کے واقعات نہیں بیان کرتے تھے، بجز اس کے کہ طلحہ رضی اللہ عنہ جنگ اُحد کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ علما میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنا لیا تھا وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے خواص میں اس قدر مستند نہیں خیال کئے جاتے تھے، اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدی ہیں، واقدی کو تو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں، ابن اسحاق کو ایک گروہ ثقہ کہتا ہے، لیکن اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار سمجھتا ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

ثلاثة كتب ليس لها اصول المغازي و الملاحم والتفسير. ❷

''تین قسم کی کتابیں ہیں، جن کی کوئی اصل نہیں، مغازی اور ملاحم اور تفسیر۔''

خطیب بغدادی نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ امام ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی مراد ان خاص کتابوں سے ہوگی جو بے اصل ہیں، پھر لکھا ہے: اما كتب التفسير فمن اشهرها كتابا الكلبي ومقاتل بن سليمان و قد قال احمد في تفسير الكلبي من اوله الى اخره كذب.

''باقی تفسیر کی کتابیں، تو ان میں سے کلبی اور مقاتل کی کتابیں بہت مشہور ہیں، امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ کلبی کی تفسیر اول سے اخیر تک جھوٹ ہے۔'' پھر لکھتے ہیں:

واما المغازي فمن اشهرها كتاب محمد بن اسحاق وكان يأخذ من اهل الكتاب و قد قال الشافعي كتب الواقدي كذب.

❶ بخاری، کتاب المغازی، باب ﴿إِذْ هَمَّت طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ﴾ ..... : ٤٠٦٢۔

❷ موضوعات ملا علی قاری، ص:٨٥ طبع مجتبائی؛ لسان المیزان، ١/ ٢٠۔

’’باقی مغازی تو اس فن کی مشہور کتاب محمد بن اسحاق کی کتاب ہے اور وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے روایت کرتے تھے اور امام شافعی نے کہا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔‘‘

باوجود ان باتوں کے یہ ناممکن تھا کہ یہ حصہ نظر انداز کر دیا جاتا، اس لئے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اور محدثین نہایت احتیاط کے ساتھ جو واقعات جہاں تک خوب محفوظ ہوتے تھے، روایت کرتے تھے۔

تصنیف وتالیف کی ابتدا سلطنت کی وجہ سے ہوئی

صحابہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا، لیکن بنوامیہ نے حکماً علما سے تصنیفیں لکھوائیں، قاضی ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے:

كنانكره كتاب العلم حتى اكرهنا عليه هؤلاء الامراء ۔ (1)

’’ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ امراء نے ہم کو مجبور کیا۔‘‘

سب سے پہلے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر قدما کی تاریخ مرتب کرائی، جس کا نام اخبار الماضیین ہے۔ (2) امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد عبدالملک بن مروان نے جو ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، ہر فن میں علما سے تصنیفیں لکھوائیں، سعید بن جبیر جو اعلم العلماء تھے، ان کو حکم بھیجا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں، چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھ کر بھیجی، جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی، عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے انہی کی تفسیر ہے، عطاء کو خزانہ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آ گیا تھا۔ (3)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے تصنیف وتالیف کو زیادہ ترقی دی۔ تمام ممالک میں حکم بھیجا کہ احادیث نبوی ﷺ مدون اور قلمبند کی جائیں، سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے ان سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلمبند کرائے اور تمام ممالک مقبوضہ میں بھیجے، علامہ ابن عبدالبر جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں:

عن سعد بن ابراهيم قال امرنا عمر بن عبدالعزيز بجمع السنن فكتبنا ها دفترًا دفترًا فبعث الى كل ارض له عليها سلطان دفترًا ۔ (4)

’’سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا، ہم نے دفتر کے دفتر لکھے، عمر نے جہاں جہاں ان کی حکومت تھی، ایک ایک دفتر بھیج دیا۔‘‘

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری جو اس زمانہ کے بہت بڑے محدث اور امام زہری کے استاد اور مدینہ کے قاضی تھے، ان کو بھی خاص طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا۔ (5)

---

(1) مطبوعه مصر، صفحه: ١٣٦۔ (2) فهرست ابن النديم، صفحه: ٢٤٤۔ (3) ميزان الاعتدال، ترجمة عطاء بن دينار، ج ٢، ص: ١٩٧، مطبوعه مصر: ١٣٢٥ھ۔ (4) مطبوعه مصر، صفحه: ٣٦۔

(5) طبقات ابن سعد، جز ثانی، قسم ثانی، صفحه: ١٣٤۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایتیں

حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کی ایک خاص حیثیت ہے یعنی ان سے اکثر وہ حدیثیں مروی ہیں، جو عقائد یا فقہ کے مہمات مسائل ہیں، اس لئے عمر بن عبدالعزیز نے ان کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا، عمرہ بنت عبدالرحمن ایک خاتون تھیں، ان کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خاص اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، وہ بہت بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں، تمام علما کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا، عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد کو خط لکھا کہ عمرہ کے مسائل اور روایات قلمبند کر کے بھیج دیں۔ [1]

مغازی پر خاص توجہ

اب تک مغازی وسیر کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور حکم دیا کہ غزواتِ نبوی ﷺ کا خاص حلقہ درس قائم کیا جائے۔ عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری المتوفی ۱۲۱ھ اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے۔ ان کو حکم دیا کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں۔ [2]

امام زہری اور فن سیرت

اسی زمانہ میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی اور جیسا کہ امام سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے، یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی، امام زہری اس زمانہ کے اعلم العلماء تھے، فقہ اور حدیث میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں، انہوں نے حدیث وروایات کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے۔ جوان، بڈھے، عورت، مرد، جو مل جاتا یہاں تک کہ پردہ نشین [3] عورتوں سے جا کر آنحضرت ﷺ کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلمبند کرتے، وہ نسباً قریشی تھے، ۵۰ھ میں پیدا ہوئے، بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا تھا، ۸۰ھ میں عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے، اس نے بہت قدر ومنزلت کی، کتاب المغازی غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ہدایت کے موافق لکھی، یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ امام موصوف سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مقربین خاص میں داخل تھے۔ ہشام بن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم ان کے سپرد کی تھی۔ ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

امام زہری کے تلامذہ

امام زہری کی وجہ سے مغازی وسیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا، ان کے حلقہ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے ان میں سے یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح تمار، عبدالرحمن بن

---

[1] تهذيب التهذيب، ترجمة ابى بكر بن محمد، و عمرة بنت عبدالرحمن، ج١٢، ص:٤٣٩ وطبقات ابن سعد جزء دوم حصه دوم، صفحه: ١٣٤۔ [2] تهذيب التهذيب، ترجمة عاصم بن عمر بن قتادة، ج٥، ص:٥٤۔ [3] تهذيب التهذيب، ترجمة امام زهرى (محمد بن مسلم، ج٩، ص:٤٤٩)۔

عبدالعزیز، فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں ان لوگوں کا امتیازی وصف "صاحبِ مغازی" لکھا جاتا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ اور سیرت

زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی اور یہی دو شخص ہیں جن پر اس فن کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ خاندانِ زبیر کے غلام تھے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا تھا، فن حدیث میں امام مالک ان کے شاگرد ہیں۔ امام مالک ان کے نہایت مداح تھے اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ فن مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو، ان کے مغازی کے جو خصوصیات ہیں، یہ ہیں۔

① مصنفین، اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے، انہوں نے زیادہ تر اس کا التزام کیا۔

② عام مصنفین کا یہ مذاق تھا کہ کثرت سے واقعات نقل کیے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آ جاتی تھیں، موسیٰ نے احتیاط کی اور صرف وہی روایتیں لیں جو ان کے نزدیک صحیح ثابت ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب بہ نسبت اور کتب مغازی کے مختصر ہے۔

③ چونکہ روایت حدیث کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی، اس لئے اکثر لوگ بچپن اور آغازِ شباب ہی سے حلقہ درس میں شامل ہو جاتے تھے اور حدیثیں سن کر لوگوں سے روایت کرتے تھے، لیکن چونکہ اس عمر تک واقعات کا صحیح طور سے سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا، اس لئے اکثر روایتوں میں تغیر اور اختلاط ہو جاتا تھا، موسیٰ نے بخلاف اور لوگوں کے کبر سن میں اس فن کو سیکھا تھا، [1] ۱۴۱ ہجری میں وفات پائی۔

موسیٰ کی کتاب آج موجود نہیں، لیکن ایک مدت تک شائع و ذائع رہی اور سیرت کی تمام قدیم کتابوں میں کثرت سے اس کے حوالے آتے ہیں۔

محمد بن اسحاق اور سیرت

محمد بن اسحاق نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امام فنِ مغازی کے نام سے مشہور ہیں، شہرت عام میں اگرچہ واقدی ان سے کم نہیں، لیکن واقدی کی لغو بیانی مسلمہ عام ہے اور اس لئے ان کی شہرت، بدنامی کی شہرت ہے، محمد بن اسحاق تابعی ہیں، ایک صحابی (حضرت انس رضی اللہ عنہ) کو دیکھا تھا، علم حدیث میں کمال تھا، امام زہری کے دروازہ پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے، لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں۔ ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے، امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں۔ لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں

[1] تهذيب التهذيب، ترجمة موسى بن عقبة، ج ١٠، ص: ٣٦١۔

استناد کے قابل ہیں، امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان کی روایت نہیں لی، لیکن جزء القراءۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاریخ میں تو اکثر واقعات انہی سے لیتے ہیں۔

فنِ مغازی کو انہوں نے اس قدر ترقی دی اور اس قدر دلچسپ بنادیا کہ خلفائے عباسیہ جو زیادہ تر اس قسم کا مذاق رکھتے تھے، ان میں مغازی کا مذاق پیدا ہوگیا، چنانچہ ابن عدی نے اس احسان کا خاص طرح پر ذکر کیا ہے، ابن عدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس فن میں کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے رتبہ کو نہیں پہنچی۔ [1]

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ ان یہودیوں سے دریافت کر کے داخل کتاب کرتے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے اور چونکہ یہ واقعات انہوں نے یہودیوں سے سنے ہوں گے، اس لئے ان پر پورا اعتماد نہیں ہوسکتا، علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق، یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے اور ان کو ثقہ سمجھتے تھے، ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ شیخ سعدی کے زمانہ میں ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا، اس کا قلمی نسخہ الٰہ آباد میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔

محمد بن اسحاق کی کتاب کثرت سے پھیلی اور بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کئے، اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیادہ منقح اور اضافہ کر کے مرتب کیا، جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے، چونکہ اصل کتاب آج کم ملتی ہے، اس لئے آج اس کی جو یادگار موجود ہے۔ وہ یہی ابن ہشام کی کتاب ہے۔

ابن ہشام اور سیرت

ابن ہشام کا نام عبدالملک ہے، وہ نہایت ثقہ اور نامور محدث اور مؤرخ تھے، حمیر کے قبیلہ سے تھے اور غالباً اسی تعلق سے سلاطین حمیر کی تاریخ لکھی، جو آج بھی موجود ہے، انہوں نے سیرت میں یہ اضافہ کیا کہ سیرت میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں، ان کی تفسیر بھی لکھی ہے، ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت ابن اسحاق کی مقبولیت کی بنا پر لوگوں نے اس کو نظم کیا، چنانچہ ابونصر فتح بن موسیٰ خضراوی المتوفی ۶۶۳ھ و عبدالعزیز بن احمد المعروف بہ سعدویری، المتوفی فی حدود ۶۰۷ھ و ابواسحاق انصاری تلمسانی، و فتح الدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الشہید المتوفی ۷۹۳ھ نے منظوم کیا، اخیر کتاب میں قریباً دس ہزار شعر ہیں اور اس کا نام "فتح الغریب فی سیرۃ الحبیب" ہے۔

ابن سعد اور سیرت

واقدی خود تو قابل ذکر نہیں، لیکن ان کے تلامذۂ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت ﷺ اور

---

[1] تهذيب التهذيب، ج۹، ص۳۹ تا ٤٦۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہوسکا۔

ابن سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو ان کے استاد (واقدی) قابل اعتبار نہیں، لیکن وہ خود قابل سند ہیں، خطیب بغدادی نے ان کی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں:

کان من اهل العلم والفضل والفهم والعدالة صنف كتابًا كبيرًا فى طبقات الصحابة والتابعين الى وقته فاجادفيه واحسن. [1]

یہ موالی بنی ہاشم سے تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی، بلاذری جو مشہور مؤرخ ہیں، انہی کے شاگرد ہیں، ۲۳۰ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ان کی کتاب کا نام طبقات ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے، دو جلدیں خاص آنحضرت ﷺ کے حالات میں ہیں اور یہ حصہ دراصل سیرت نبوی ہے، باقی جلدیں صحابہ رضی اللہ عنہم (و تابعین) کے حالات میں ہیں اور چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات میں ہر جگہ آنحضرت ﷺ کا ذکر آتا ہے، اس لئے ان حصوں میں بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

یہ کتاب تقریباً ناپید ہو چکی تھی، یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پورا نسخہ موجود نہ تھا، شہنشاہ جرمن کو اس کی طبع واشاعت کا خیال ہوا، چنانچہ لاکھ روپے جیب خاص سے دیے اور پروفیسر ساخو کو اس کام پر مامور کیا کہ ہر جگہ سے اس کے اجزا فراہم کر کے لائیں، پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر جابجا سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں، یورپ کے بارہ پروفیسروں نے الگ الگ جلدوں کی تصحیح اپنے ذمہ لی، چنانچہ نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ یہ نسخہ لیڈن (ہالینڈ) میں چھپ کر شائع ہوا۔

اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، لیکن چونکہ تمام روایتیں بہ سند مذکور ہیں، اس لئے واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کر لی جاسکتی ہیں۔

اس زمانہ میں سیرت پر اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، چنانچہ کشف الظنون وغیرہ میں ان کے نام مذکور ہیں لیکن چونکہ نام کے سوا ان کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں، نہ ان کا آج وجود ہے، اس لئے ہم ان کے نام نظر انداز کرتے ہیں۔

امام بخاری اور سیرت

سیرت کے سلسلہ سے الگ تاریخی تصنیفات ہیں، ان میں سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئیں یعنی جن میں روایتیں بہ سند مذکور ہیں، ان میں آنحضرت ﷺ کے حالات اور واقعات کا جو حصہ ہے وہ بھی دراصل سیرت نبوی ﷺ ہے۔ ان میں سب سے مقدم اور قابل استناد امام بخاری کی دونوں تاریخیں ہیں لیکن دونوں نہایت مختصر ہیں، تاریخ صغیر چھپ گئی ہے، اس میں سیرت نبوی ﷺ کا حصہ کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں،

[1] تهذيب التهذيب، ترجمة محمد بن سعد، ج۹، ص: ۱۸۲۔

یعنی صرف ۱۵ صفحے ہیں اور ان میں بھی کوئی ترتیب نہیں، کبیر البتہ بڑی ہے، میں نے اس کا نسخہ جامع اباصوفیہ میں دیکھا تھا، لیکن سوانح نبوی اس میں بہت کم ہیں اور جستہ جستہ واقعات بلاترتیب مذکور ہیں۔

امام طبری اور سیرت

تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے، طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین ان کے فضل و کمال، وثوق اور وسعت علم کے معترف ہیں، ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے، محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ ''دنیا میں میں کسی کو ان سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا۔'' ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

بعض محدثین (سلیمانی) نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ ''یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔'' لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال (ج ۳ص: ۳۵) میں لکھا ہے:

> هذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبار ائمة الاسلام المعتمدين .
>
> ''یہ جھوٹی بدگمانی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر، اسلام کے معتمد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں۔''

علامہ ذہبی نے اسی موقع پر لکھا ہے کہ ''ان میں فی الجملہ تشیع تھا، لیکن مضر نہیں'' تمام مستند اور مفصل تاریخیں، مثلاً: تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابوالفداء وغیرہ انہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں، یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی۔

فہرست متقدمین علمائے سیرت

جو لوگ خاص فن سیرت کے ارکان اور معتمد ہیں، ان کا اور ان کی تصنیفات کا ایک مختصر نقشہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں۔

نام مصنف	سنہ وفات	حالات
عروہ بن زبیر [1]	۹۴ھ	حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نواسے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آغوش تربیت میں پلے تھے، سیرت و مغازی میں کثرت سے ان کی روایتیں ہیں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے متعلق لکھا ہے کان عالماً بالسیرۃ صاحب کشف الظنون نے مغازی کے بیان میں لکھا ہے کہ بعضوں کی رائے ہے کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب انہوں نے تدوین کی۔

[1] ان مصنفین کی تصنیفات اکثر ناپید ہیں (یہ فہرست تہذیب التہذیب وغیرہ سے مرتب کی گئی ہے) ان کے نام لکھنے سے یہ غرض ہے کہ آج جو تصنیفیں ملتی ہیں ان میں اکثر ان کے حوالے آتے ہیں۔ اس لیے ناظرین کو ان حوالوں کی صحت وعدم صحت یا قوت وضعف کے فیصلہ کرنے کا کچھ موقع حاصل ہوگا۔

شعبی	۱۰۹ھ	مشہور محدث ہیں، اکثر فنون میں کمال رکھتے تھے، خلافت دمشق کی طرف سے سفیر بن کر قسطنطنیہ گئے تھے، فن مغازی و سیر میں ان کو اس درجہ واقفیت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ "گو میں ان غزوات میں بذات خود شریک تھا، مگر یہ مجھ سے زیادہ ان حالات کو جانتے ہیں۔"
وہب بن منبہ	۱۱۴ھ	یمن کے عجمی خاندان سے تھے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کچھ حدیثیں سنی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق کتب عہد قدیم کی بشارت اور پیشین گوئیاں کثرت سے انہی سے مروی ہیں۔
عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری	۱۲۱ھ	مشہور تابعی ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور اپنے باپ اور اپنی دادی رمیثہ سے روایت کرتے ہیں۔ مغازی اور سیر میں نہایت وسیع المعلومات تھے، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے مسجد دمشق میں بیٹھ کر اس فن کی تعلیم دیتے تھے۔
محمد بن مسلم بن شہاب زہری	۱۲۴ھ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔
یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس بن شریق الثقفی	۱۲۸ھ	نہایت ثقہ تھے، عمال اور گورنر انتظام ملکی میں ان سے مدد لیتے تھے، فقہائے مدینہ میں ان کا شمار تھا، سیرت نبوی ﷺ کے عالم تھے، ان کا دادا اخنس بن شریق وہی شخص ہے، جو رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔
موسیٰ بن عقبہ الاسدی	۱۴۱ھ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔
ہشام بن عروہ بن زبیر	۱۴۶ھ	زیادہ تر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، زہری کے بھی شاگرد ہیں، علمائے مدینہ میں ان کا شمار ہے، بغداد میں جو روایتیں انہوں نے لیں، محدثین کا بیان ہے کہ ان میں تساہل سے کام لیا ہے، سیرت کے ذخیرۂ روایات میں ان کا بہت بڑا حصہ شامل ہے جن کو وہ اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ فن سیرت میں ان کے متعدد نامور تلامذہ ہیں۔
محمد بن اسحاق بن یسار المطلبی	۱۵۱ھ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

عمر بن راشد الازدی	۱۵۲ھ	امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے۔ اساطین علم حدیث میں تھے، مغازی میں ایک کتاب ان کی تصنیف ہے، جس کا نام ابن ندیم نے کتاب المغازی لکھا ہے۔
عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز الاوسی	۱۶۲ھ	زہری کے شاگرد تھے، مسلم نے ان سے ایک روایت کی ہے، محدثین کے نزدیک ضعیف الروایت ہیں، فن سیرت کے عالم تھے۔ ابن سعد نے ان کے متعلق لکھا ہے "کان عالماً بالسیرۃ"۔
محمد بن صالح بن دینار التمار	۱۶۸ھ	زہری کے شاگرد اور واقدی کے استاد ہیں، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ سیرت و مغازی کے عالم تھے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ابو الزناد جو بڑے پایہ کے محدث ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح مغازی سیکھنا ہو تو محمد بن صالح سے سیکھو۔
ابو معشر نجیح المدنی	۱۷۰ھ	ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے۔ ثوری اور واقدی نے ان سے روایت کی ہے، گو محدثین نے روایت حدیث میں ان کی تضعیف کی ہے لیکن سیرت و مغازی میں ان کی جلالت شان کا اعتراف کیا ہے۔ امام ابن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فن میں صاحب نظر ہیں۔ ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے، کتب سیرت میں ان کا نام کثرت سے آتا ہے۔
عبداللہ بن جعفر بن عبدالرحمٰن المخزومی	۱۷۰ھ	مشہور صحابی مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما کے پڑپوتے تھے، فن حدیث میں خاص پایہ رکھتے تھے۔ سیرت نبوی ﷺ کے اکابر علما میں تھے۔ ابن سعد نے ان کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں "من رجال اھل المدینۃ عالماً بالمغازی"۔
عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن عمرو بن حزم الانصاری	۱۷۶ھ	فن حدیث و سیر میں ان کا خاندان ہمیشہ نامور رہا، ان کے دادا وہ شخص ہیں جنہوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے سب سے پہلے فن حدیث کی تدوین کی، ان کے رشتہ کی دادی عمرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تربیت یافتہ تھیں، یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے، اپنے باپ اور چچا سے تعلیم پائی تھی، خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو

		قاضی مقرر کیا تھا، لوگ ان سے مغازی سیکھتے تھے، اس فن میں ان کی ایک تصنیف کتاب المغازی بھی ہے۔
علی بن مجاہد الرازی الکندی	بعد ۱۸۰ھ	ابو معشر نجیح کے تلامذہ میں تھے، امام ابن حنبل نے ان سے روایت کی ہے، مغازی کے جامع اور مصنف ہیں، لیکن ارباب نقد کے نزدیک ان کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں۔
زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی	۱۸۳ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ابن ہشام کے استاد تھے، ان دونوں بزرگواروں کے واسطۃ العقد یہی ہیں، سیرت کے عشق میں گھربار بیچ کر استاد کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے اور مدت تک سفر و حضر میں ان کے شریک رہے، محدثین کی بارگاہ میں گو ان کا اعزاز کم ہے، لیکن کتاب السیرۃ کے سب سے معتبر راوی یہی سمجھے جاتے ہیں۔
سلمہ بن الفضل الابرش الانصاری	۱۹۱ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ان کی سیرت کے راوی ہیں، ارے کے قاضی تھے، اہل نقد کے نزدیک قابل احتجاج نہیں، لیکن ابن معین جو اسمائے رجال کے بڑے ماہر ہیں، مغازی میں ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو بہترین سیرت ہائے نبوی کہتے ہیں، طبری میں ان کے واسطہ سے اکثر روایتیں مروی ہیں۔
ابو محمد یحییٰ بن سعید بن ابان الاموی	۱۹۴ھ	ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے تلمذ تھا، ابن سعد نے لکھا ہے کہ گو قلیل الروایت ہیں لیکن ثقہ ہیں، صاحب کشف الظنون نے مصنفین مغازی میں ان کا نام بھی لیا ہے۔
ولید بن مسلم القرشی	۱۹۵ھ	شام کے مشہور محدث اور نہایت قوی الحافظہ تھے۔ شام میں ان کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا، تاریخ و مغازی میں وکیع سے ان کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا۔ ان کی تصنیفات کی تعداد ستر ہے۔ جن میں ایک کتاب المغازی ہے، کتاب الفہرست میں اس کا ذکر موجود ہے۔

یونس بن بکیر	۱۹۹ھ	ہشام بن عروہ اور ابن اسحاق کے شاگرد ہیں، فن روایت و حدیث میں ان کا متوسط درجہ ہے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، علامہ ذہبی نے تذکرہ میں ان کا نام بہ لقب صاحب المغازی لیا ہے۔ انہوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے (زرقانی مواہب جلد ۳ صفحہ ۱۰)
محمد بن عمر الواقدی الاسلمی	۲۰۷ھ	سیرت نبوی کے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں، کتاب السیرۃ اور کتاب التاریخ و المغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے، کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ انہیں کی تصانیف ہیں، ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے، تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں۔
یعقوب بن ابراہیم الزہری	۲۰۸ھ	حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھے، زہری اور ان کے تلامذہ کے شاگرد ہیں، مغازی میں ان کا یہ رتبہ تھا کہ ابن معین جیسا ناقدِ رجال ان سے اس فن کی تحصیل کرتا تھا۔
عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری	۲۱۱ھ	ثقات محدثین میں ان کا شمار ہے، مزاج میں کسی قدر تشیع تھا، ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائیں تب بھی ہم ان سے روایت حدیث ترک نہیں کر سکتے۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی، اس لئے اس زمانہ کی حدیثیں ناقابل سند ہیں، فن مغازی میں ان کی ایک تالیف ہے۔
عبدالملک بن ہشام الحمیری	۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ	ان کا ذکر گزر چکا ہے۔
علی بن محمد المدائنی	۲۲۵ھ	ابو معشر نجیح اور سلمہ بن الفضل وغیرہ کے شاگرد تھے تاریخ و انساب عرب میں نہایت وسیع المعلومات تھے، محدثین میں ان کا شمار نہیں لیکن مؤرخین کے امام ہیں، اغانی کے دفتر بے پایاں کا مخزن یہی ہیں، تاریخ و انساب میں ان کی کثرت سے تصنیفات ہیں،

		آنحضرت ﷺ کے حالات میں ان کی کتاب نہایت مبسوط ہے، اور ابن الندیم کے بیان کے مطابق ہر قسم کے متعدد اور متنوع عنوان قائم کیے ہیں۔
عمر بن شبۃ البصری	۲۶۲ھ	حدیث، تاریخ، ادب، لغت، شاعری اور نحو کے امام ہیں، مکہ مبارکہ، مدینہ طیبہ اور بصرہ کی تاریخیں لکھی ہیں، علم سیر میں نہایت بلند پایہ تھے، حدیث میں ابن ماجہ اور تاریخ میں بلاذری اور ابونعیم ان کے شاگرد تھے۔
محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۷۹ھ	مشہور محدث ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں تیسرا درجہ رکھتی ہے، سیرت نبوی میں ان کا خاص رسالہ ہے جس کا موضوع گزشتہ تصانیف سے الگ ہے، اس رسالہ کا نام کتاب الشمائل ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کے ذاتی حالات وعادات واخلاق کا ذکر ہے، اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام روایتیں معتبر اور صحیح ہوں، اس رسالہ پر متعدد علما نے شروح وحواشی لکھے۔
ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم	۲۸۵ھ	محدثین کبار میں شمار ہے، مسند صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی تالیف ہے، جس کے آخر میں کتاب المغازی شامل ہے۔
ابوبکر احمد بن ابی خیثمۃ البغدادی	۲۹۹ھ	حدیث میں ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد اور تاریخ وسیر کے جلیل القدر عالم تھے، تاریخ کبیر ان کی تصنیف ہے، جس میں سیرتِ نبوی ﷺ کا حصہ بھی شامل ہے۔
محمد بن عائذ دمشقی		ان کی مغازی معتبر خیال کی جاتی ہے، حافظ ابن حجر وغیرہ اکثر اس کے حوالے دیتے ہیں۔

فہرست متاخرین علمائے سیرت

یہ قدما کی تصنیفات تھیں، مابعد کی تصنیفات کا ہم ایک مختصر نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں، یہ تصنیفات قدیم تصنیفات اور احادیث کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، اس نقشہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے، جو قدما کی تصنیفات کے متعلق شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں، ان کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ فی نفسہ مستقل تصنیفات

تھیں اور ان میں جس قدر ذخیرۂ معلومات ہے، خود اصل کتابوں میں نہیں۔

روض الانف

سیرت ابن اسحاق کی شرح ہے، مصنف کا نام عبدالرحمٰن سہیلی ہے، جنہوں نے ۵۸۱ھ میں وفات پائی، یہ اکابر محدثین میں سے ہیں اور تمام مصنفین مابعد، سیرت نبوی ﷺ کی تحقیقات اور معلومات کے متعلق ان کے خوشہ چیں ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب ۱۲۰ کتابوں کی مدد سے لکھی، اس کا قلمی نسخہ ہمارے استعمال میں ہے۔

سیرت دمیاطی

حافظ عبدالمؤمن دمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں، اس کتاب کا نام المختصر فی سیرۃ سید البشر ہے۔ قریباً سو صفحوں میں ہے۔ پٹنہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

سیرت خلاطی

علاء الدین علی بن محمد خلاطی حنفی کی تصنیف ہے، ۷۰۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت گازرونی

شیخ ظہیر الدین علی بن محمد گازرونی المتوفی ۶۹۴ھ کی تصنیف ہے۔ [1]

سیرت ابن ابی طے

مصنف کا نام یحییٰ بن حمیدہ المتوفی ۶۳۰ھ ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔

سیرت مغلطائی [2]

مشہور کتاب ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔ علامہ عینی نے اسکے ایک حصہ کی شرح لکھی ہے جس کا نام کشف اللثام ہے۔

شرف المصطفیٰ

حافظ ابو سعید عبدالملک نیشاپوری کی تصنیف ہے، آٹھ جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر اصابہ میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں، لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں، ان میں بعض نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے۔

شرف المصطفیٰ

للحافظ ابن الجوزی۔

---

[1] بمبئی کے کتب خانہ جامع مسجد میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ [2] ان تمام کتابوں کا ذکر کشف الظنون میں سیرت کے عنوان سے ہے۔

اکتفاء فی مغازی المصطفٰے والخلفاء الثلاثۃ

حافظ ابوالربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی المتوفی ۶۳۴ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں۔

سیرت ابن عبدالبر

ابن عبدالبر مشہور محدث اور امام ہیں، اس کتاب کے حوالے اکثر آتے ہیں۔

عیون الاثر

ابن سیدالناس کی تصنیف ہے' ابن سیدالناس اندلس کے مشہور عالم ہیں' ۷۳۴ھ میں وفات پائی۔ یہ کتاب نہایت متین اور جامع ہے' معتبر کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے اور جس سے جو کچھ نقل کیا ہے' سند بھی نقل کی ہے' اس کا قلمی نسخہ (جلد دوم) کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے اور ہمارے پیش نظر ہے۔

نور النبراس فی سیرت ابن سیدالناس

عیون الاثر کی شرح ہے، مصنف کا نام ابراہیم بن محمد ہے یہ کتاب نہایت محققانہ لکھی گئی ہے، اور بے شمار معلومات کا گنجینہ ہے، دو ضخیم جلدوں میں ہے اور ندوہ کے کتب خانہ میں اس کا نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے۔

سیرت منظوم

حافظ زین الدین عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، نظم میں لکھی ہے لیکن دیباچہ میں خود لکھ دیا ہے کہ اس میں رطب ویابس سب کچھ ہے۔

مواہب لدنیہ

مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے، اس کے مصنف قسطلانی ہیں جو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے ہم مرتبہ تھے، یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں۔

زرقانی علی المواہب

یہ مواہب لدنیہ کی شرح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی، آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔

سیرت حلبی

مشہور اور متداول ہے۔

صحت ماخذ

سیرت نبوی کے واقعات جو قلمبند کیے گئے وہ تقریباً نبوت کے سو برس کے بعد قلمبند ہوئے، اس لئے

مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں۔

اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں، جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

اسلامی فن تاریخ کا پہلا اصول، فن روایت

لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے، کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے؟ یا دقیقہ بین؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے، ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے۔

اسماء الرجال کی تدوین

ان تحقیقات کے ذریعے سے اسماء الرجال (بائیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا، جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر [1] کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔

محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروانہ کی، بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔

اس سلسلہ میں سینکڑوں تصنیفات تیار ہوئیں جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے:

سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح وتعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی، وہ

[1] ڈاکٹر اسپرنگر جرمن کے مشہور عربی دان فاضل ہیں، مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں کام کیا، اصابہ کا نسخہ انہیں کی تصحیح سے کلکتہ میں چھپا، اسی کتاب کے دیباچہ میں صاحب موصوف نے لکھا ہے، کہ "نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"۔

اس رتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ "میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔" ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں:

نام کتاب	کیفیت
رجال عقیلی	خاص ضعیف الروایہ لوگوں کے حال میں ہے۔
رجال احمد بن عبد العجلی المتوفی ۲۶۱ھ	اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے۔
رجال امام عبد الرحمان بن حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ	بہت ضخیم کتاب ہے۔
رجال امام دارقطنی	مشہور محدث ہیں، یہ کتاب خاص ضعیف الروایۃ اشخاص کے حال میں ہے۔
کامل ابن عدی	اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے، اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔

یہ کتابیں قریباً آج ناپید ہیں، لیکن بعد کی تصنیفات جو انہی سے ماخوذ ہیں، آج بھی موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب "تہذیب الکمال" ہے جو علامہ مزی (یوسف بن الزکی) کی تصنیف ہے جنہوں نے ۷۴۲ھ میں وفات پائی، علاء الدین مغلطائی المتوفی ۷۶۲ھ نے تیرہ جلدوں میں اس کا تکملہ لکھا۔

علامہ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے اس کا اختصار کیا اور بہت سے محدثین نے اس کے خلاصے اور ذیل لکھے اور بالآخر حافظ ابن حجر نے ان تمام تصنیفات سے ایک نہایت ضخیم کتاب "تہذیب التہذیب" لکھی جو بارہ جلدوں میں ہے اور آجکل حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ اس کی تصنیف میں آٹھ برس صرف ہوئے ہیں، اس سلسلہ کی ایک اور سب سے زیادہ متداول اور مستند کتاب "میزان الاعتدال" ہے، جو علامہ ذہبی کی تصنیف ہے، حافظ ابن حجر نے اس کتاب پر اضافہ کیا جس کا نام "لسان المیزان" ہے۔

اسماء الرجال کی پیش نظر کتابیں

اسماء الرجال کی کتابوں میں سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبۃ النسبۃ ذہبی، انساب

سمعانی، تہذیب الاسماء ہماری نظر سے گزری ہیں۔

تحقیق روایت کا اصول، قرآن وحدیث میں

اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کر دی تھی:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا ﴾ (۴۹/ الحجرات:۶)

''مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لو۔''

حدیث ذیل بھی اسی کی مؤید ہے:

((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ)) [1]

''آدمی کے جھوٹے ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ جو کچھ سنے روایت کر دے۔''

دوسرا اصول، درایت

تحقیقِ واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے، یا نہیں؟

درایت کی ابتدا

یہ اصول بھی درحقیقت قرآن مجید ہی نے قائم کر دیا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم تک مغالطہ میں آ گئے، چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ بھی قاذفین میں شریک تھے اور اسی بنا پر حد قذف جاری کی گئی۔ قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِنْكُمْ ﴾ [۲۴/ النور:۱۱]

''جن لوگوں نے تہمت لگائی وہ تمہارے گروہ میں سے ہیں۔''

تفسیر جلالین میں مِنكُمْ کی تفسیر حسب ذیل کی ہے:

جماعة من المؤمنين.

''یعنی یہ تہمت لگانے والے، مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔''

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

﴿وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ﴾ (۲۴/ النور:۱۶)

''اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا مناسب نہیں، سبحان اللہ! یہ بڑا

---

[1] صحیح مسلم، باب النھی عن الحدیث بکل ما سمع:۷؛ ابوداود، کتاب الأدب، باب التشدید فی الکذب:۴۹۹۲۔

بہتان ہے۔"

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کئے جاتے پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایت ہیں یا نہیں؟ پھر ان کی شہادت لی جاتی ، لیکن خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے۔

اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلاف قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے قطعاً سمجھ لینا چاہیے کہ غلط ہے۔

اس طرز تحقیق یعنی درایت کی ابتدا خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں ہو چکی تھی۔

فقہا میں بعض اس بات کے قائل ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے جب اس مسئلہ کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کیا تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اگر یہ صحیح ہو تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو۔ [1] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ضعیف الروایۃ نہیں سمجھتے تھے لیکن چونکہ ان کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی، اس لئے انہوں نے تسلیم نہیں کی اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہوگی۔

محدثین کے اصولِ درایت

جب حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے جن میں سے بعض یہ ہیں:

قال [2] ابن الجوزی و کل حدیث رأیته یخالف العقول اوینا قض الاصول فاعلم انه موضوع فلایتکلف اعتباره ای لا تعتبر روایته و لا تنظر فی جرحهم او یکون مما یدفعه الحس والمشاهدة او مباینا لنص الکتاب والسنة المتواترة او الاجماع القطعی حیث لا یقبل شیء من ذلك التاویل اویتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر و با لوعد العظیم علی الفعل الیسیر وهذا الاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والطرقیة ومن رکة المعنی لا تا کلوا القرعة حتی تذبحوها ولذا جعل بعضهم ذلك دلیلا علی کذب راویه و کل هذا من القرائن فی المروی وقدتکون فی الراوی کقصة غیاث مع المهدی...... او انفراده عمن لم یدرکه بمالم یوجد عند غیرهما

[1] جامع ترمذی، ابواب الطهارة، باب ما جاء فی الوضوء مما غیرت النار: ۷۹۔

[2] فتح المغیث، مطبوعه لکھنؤ صفحه: ۱۱٤ ، افسوس یہ ہے کہ یہ کتاب نہایت غلط چھپی ہے، اس لئے بعض عبارتیں ہم نے اسی نسخہ کے موافق غلط نقل کی ہیں، یہ اصول خود ابن جوزی کے قائم کردہ نہیں ہیں، بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے۔

او انفرده بشيء مع كونه فيما يلزم المكلفين علمه وقطع العذر فيه كما قرره الخطيب في اول الكفاية او بامر جسيم يتوفر الدواعي على نقله كحصر العدو للحاج عن البيت۔

''ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے، اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر، اسی طرح سے وہ حدیث قابل اعتبار نہیں جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو، یا نص کتاب اور سنت متواترہ اور اجماع قطعی کے خلاف ہو اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو، یا وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو، یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو، (اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کے ہاں بہت پائی جاتی ہیں) یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے، مثلاً: یہ حدیث کہ کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ، اس لئے بعض محدثین نے لغویت کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے۔ یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں اور کبھی یہ قرائن راوی کے متعلق ہوتے ہیں، مثلاً: غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ، یا جب کہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو اور کسی نے نہ بیان کی ہو اور خود راوی جس سے روایت کرتا ہے اس سے ملا تک نہ ہو، یا وہ حدیث جس کو ایک ہی راوی بیان کرتا ہے حالانکہ بات ایسی ہے کہ اس سے اوروں کو بھی مطلع ہونا ضروری تھا جیسا کہ خطیب بغدادی نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے، یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہے کہ اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اس کو بیان کرتے، مثلاً: یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے حاجیوں کو کعبہ کے حج سے روک دیا۔''

روایت کے اصول

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں:

① جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

② جو روایت اصولِ مسلمہ کے خلاف ہو۔

③ محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

④ قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

⑤ جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

⑥ معمولی کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

⑦ وہ روایت رکیک المعنی ہو مثلاً: کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ۔

⑧ جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

⑨ جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو، بایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

⑩ جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو، کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے، باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو۔

موضوع حدیثوں کی شناخت کے اصول

ملا علی قاری، نے جو موضوعات (نسخہ مطبوعہ مجتبائی دہلی، صفحہ ۹۲ تا خاتمۂ کتاب) کے خاتمہ میں حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اوران کی مثالیں نقل کی ہیں، ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

① جس حدیث میں فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نہیں نکل سکتیں، مثلاً: یہ کہ ''جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی ستر زبانیں ہوتی ہیں، ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں'' الخ۔

② وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو، مثلاً: یہ حدیث کہ ''بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔''

③ وہ حدیث جو صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

④ جو حدیث واقع کے خلاف ہو مثلاً: یہ کہ ''دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے''۔

⑤ وہ حدیث جو انبیا علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو، مثلاً: یہ حدیث کہ ''تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آب رواں، خوبصورت چہرہ کا دیکھنا''۔

⑥ وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشین گوئی بقید تاریخ مذکور ہوتی ہے۔ مثلاً: یہ کہ ''فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔''

⑦ وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہیں مثلاً: یہ کہ ''ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے'' یا یہ کہ ''مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔''

⑧ وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں، مثلاً: عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا۔

⑨ وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو، مثلاً: دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے، کیونکہ اگر یہ روایت صحیح

ہوتو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کے آنے میں اس قدر دیر ہے، حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

⑩ وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

⑪ جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

⑫ وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں، حالانکہ یہ حدیثیں تفسیر بیضاوی اور کشاف وغیرہ میں منقول ہیں۔

ان اصول سے محدثین نے اکثر جگہ کام لیا اور ان کی بنا پر بہت سی روایتیں رد کر دیں، مثلاً: ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ''آنحضرت ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا اور معافی کی دستاویز لکھوادی تھی'' ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

① اس معاہدہ پر سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی گواہی بیان کی جاتی ہے حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پا چکے تھے۔

② دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے، حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے۔

③ اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیہ کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔

④ دستاویز میں تحریر ہے کہ ''یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی''۔ حالانکہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

⑤ خیبر والوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی، ان سے جزیہ کیوں معاف کیا جاتا۔

⑥ عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا، حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی۔ تو خیبر والے کیونکر معاف ہو سکتے تھے۔

⑦ اگر جزیہ ان کو معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے خیرخواہ اور دوست اور واجب الرعایت ہیں، حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کر دیے گئے۔

تبصرہ

(فن سیرت پر)

سیرت کی یہ ایک اجمالی اور سادہ تاریخ تھی، اب ہم اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

امہاتِ کتبِ سیرت

① سیرت پر اگرچہ آج بھی سینکڑوں تصنیفیں موجود ہیں، لیکن سب کا سلسلہ جا کر صرف تین چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے، سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، طبری، ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں، وہ ان سے متاخر ہیں، اور ان میں جو واقعات مذکور ہیں، زیادہ تر انہی کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ (کتب حدیث کا جو ٹکڑا ہے اس سے اس مقام پر بحث نہیں) اس بنا پر ہم کو مذکورہ بالا کتابوں پر زیادہ تفصیل اور تدقیق سے نظر ڈالنی چاہیے۔

ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے، محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑے سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلمبند نہیں کر سکتا۔

واقدی کے سوا، باقی اور تینوں مصنفین، اعتبار کے قابل ہیں، ابن اسحاق کی نسبت اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے جرح کی ہے، تاہم ان کا یہ رتبہ ہے کہ امام بخاری اپنے رسالہ "جزء القراءۃ" میں ان کی سند سے روایتیں نقل کرتے ہیں اور ان کو صحیح سمجھتے ہیں، ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں، اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور راویوں کے ذریعہ سے بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رواۃ، ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں، اس کے علاوہ ابن اسحاق کی اصلی کتاب (ہندوستان میں) موجود نہیں، ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا وہی آج موجود ہے، لیکن ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو، زیاد بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے، بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص ہیں، تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں، ابن مدینی (امام بخاری کے استاد) کہتے ہیں کہ "وہ ضعیف ہے اور میں نے اس کو ترک کر دیا"۔ ابو حاتم کہتے ہیں: "وہ استناد کے قابل نہیں۔" نسائی کہتے ہیں: "وہ ضعیف ہے۔"

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں، واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لئے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے، باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔

طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً: سلمہ ابرش، ابن سلمہ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں۔

اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ، کتبِ حدیث کا ہم پلہ نہیں، البتہ ان میں سے تحقیق وتنقید کے معیار پر جو اتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔

کتب حدیث وسیرت میں فرقِ مراتب

سیرت کی کتابوں کی کم پائیگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کر دی گئی، یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جو روایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں، ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں حاجت نہیں، حافظ زین الدین عراقی جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں، سیرتِ منظوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ماصح وما قد انکرا

''طالب کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں سبھی طرح کی روایتیں ہوتی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔''

فن سیرت میں محدثین کی مسامحت

یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہو گئیں اور بڑے بڑے علما نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا درج کرنا جائز رکھا، علامہ ابن تیمیہ کتاب التوسل (مطبوعہ مطبع المنار، صفحہ ۹۹) میں لکھتے ہیں۔

قد رواہ من صنف فی عمل یوم ولیلة کابن السنی وابی نعیم وفی مثل ھذہ الکتب احادیث کثیرة موضوعة لایجوز الاعتماد علیھا فی الشریعة باتفاق العلماء۔

''اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے، جنہوں نے رات دن کے اعمال میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مثلاً: ابن السنی اور ابو نعیم اور اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں، جن پر اعتماد کرنا ناجائز ہے اور اس پر تمام علما کا اتفاق ہے۔''

حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے کہا: ''اے خدا! میں تجھ کو محمد ﷺ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے'' خدا نے کہا: ''تم نے محمد ﷺ کو کیونکر جانا'' حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ''میں نے سر اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے ((لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ)) اس سے میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے وہ ضرور تجھ کو محبوب ترین خلق ہوگا'' خدا نے کہا: ''آدم! تم نے سچ کہا اور محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا۔'' حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

واما تصحیح الحاکم لمثل ھذا الحدیث وامثالہ فھذا مما انکرہ علیہ ائمة العلم بالحدیث وقالوا ان الحاکم یصحح احادیث وھی موضوعة مکذوبة

عند اهل المعرفة بالحديث ـ وكذلك احاديث كثيرة في مستدركه يصححها وهي عند ائمة اهل العلم بالحديث موضوعة۔ [1]

''حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں۔ اسی طرح حاکم کی مستدرک میں، بہت سی حدیثیں ہیں جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے، حالانکہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں۔''

علامہ موصوف ایک اور موقع پر ابوالشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں: (صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶)

وفيها احاديث كثيرة قوية صحيحة وحسنة واحاديث كثيرة ضعيفة موضوعة واهية وكذالك مايرويه خيثمة بن سليمان في فضائل الصحابة وما يرويه ابو نعيم الاصبهاني في فضائل الخلفاء في كتاب مفرد و في اول حلية الاولياء وما يرويه ابوبكر الخطيب وابو الفضل بن ناصر وابو موسى المديني وابو القاسم بن عساكر والحافظ عبدالغني وامثالهم ممن له معرفة بالحديث۔

''اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی ہیں اور حسن ہیں اور بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل ہیں اور اسی طرح وہ حدیثیں جو خیثمہ بن سلیمان، صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل میں روایت کرتے ہیں اور وہ حدیثیں جو ابونعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب میں خلفا کے فضائل میں روایت کی ہیں اور حلیۃ الاولیاء کے اول میں اور اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب اور ابو الفضل اور ابوموسیٰ مدینی اور ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے لوگ روایت کرتے ہیں۔''

غور کرو، ابونعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے، باوجود اس کے یہ لوگ خلفا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال وحرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے، ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے۔ تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔

موضوعاتِ ملا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ ''قیامت میں خدا آنحضرت ﷺ کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا۔'' امام ابن جریر طبری نے سنا تو بہت برہم ہوئے اور اپنے دروازہ پر یہ فقرہ لکھ کر لگا دیا کہ ''خدا کا کوئی ہم نشیں نہیں۔'' اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے اور امام

[1] كتاب التوسل مطبوعه المنار، ص: ۱۰۱ (نیز تذكرة الحفاظ ذهبی ترجمة حاكم)

موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں۔ [1]

اس موقع پر ایک خاص نکتہ لحاظ کے قابل ہے، یہ مسلّم ہے کہ حدیث و روایت میں امام بخاری اور مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل و مناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابونعیم، بزار، طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، بخاری اور مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا، بلکہ اس قسم کی حدیثیں، جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں، مثلاً: یہ روایت کہ جب آنحضرت ﷺ عالم وجود میں آئے تو ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر پڑے، آتش فارس بجھ گئی، بحیرۂ طبریہ خشک ہو گیا۔ بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے، لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں (طبرانی، بیہقی، ابونعیم وغیرہ سے) ماخوذ ہیں، اس لئے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہو گئیں اور اسی بنا پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سیر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں۔

محدثین نے جو اصول قرار دیے تھے، سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظر انداز کر دیے، محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے، لیکن آنحضرت ﷺ کے حالات ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں مذکور ہیں، اکثر منقطع ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کی عمر آنحضرت ﷺ کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو، سب سے معمر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں وہ آنحضرت ﷺ سے عمر میں دو برس کم تھے، اسی بنا پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں ان میں سے اکثر متصل نہیں اور اسی بنا پر بہت دور از کار روایتیں پھیل گئیں، مثلاً ابونعیم نے آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے کہ ''جب آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے تو بہت سے پرند آ کر مکان میں بھر گئے جن کی زمرد کی منقار اور یاقوت کے پر تھے، پھر ایک سفید بادل آیا اور آنحضرت ﷺ کو اٹھا لے گیا اور ندا آئی کہ اس بچہ کو مشرق و مغرب اور تمام دریاؤں کی سیر کراؤ، کہ سب لوگ پہچان لیں۔'' [2]

مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے، لیکن ان کی اکثر روایتیں جو سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں، منقطع ہیں یعنی اوپر کے راویوں کے نام مذکور نہیں۔

---

[1] موضوعات ملا علي قاري، ص: ١٣، مطبوعه دهلي۔
[2] مواہب لدنیہ میں یہ روایت نقل کی ہے اس میں بے انتہا مبالغہ آمیز باتیں ہیں، میں نے معمولی ٹکڑا نقل کر دیا ہے۔

تصانیف سیرت میں کتب احادیث کی طرف سے بے اعتنائی

② نہایت تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جن بڑے بڑے نامور مصنفین، مثلاً: امام طبری وغیرہ نے سیرت پر جو کچھ لکھا اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا۔

بعض واقعات نہایت اہم ہیں ان کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسی مفید معلومات موجود ہیں جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے، لیکن سیرت اور تاریخ میں ان معلومات کا ذکر نہیں۔ مثلاً: یہ امر کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کی سلسلہ جنبانی کس کی طرف سے شروع ہوئی؟ ایک بحث طلب واقعہ ہے، تمام ارباب سیر اور مؤرخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے ابتدا کی، لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور صریح حدیث موجود ہے کہ جنگ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن ابی کو یہ خط لکھا کہ ''تم نے محمد ﷺ کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے ان کو نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آ کر تمہارا اور محمد (ﷺ) دونوں کا استیصال کر دیں گے۔'' [1] سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

مصنفینِ سیرت میں سے بعض لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا اور جب احادیث کی زیادہ چھان بین کی تو ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں، صحیح حدیثوں کے خلاف درج ہو گئی ہیں، لیکن چونکہ ان کی تصنیف پھیل چکی تھی، اس لئے اس کی اصلاح نہ ہو سکی، حافظ ابن حجر ایک موقع پر دمیاطی کا ایک قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

> ودلّ هذا على انه كان يعتقد الرجوع عن كثير مما وافق فيه اهل السير وخالف الاحاديث الصحيحة وان ذلك كان منه قبل تضلعه منها ولخروج نسخ كتابه وانتشاره لم يتمكن من تغييره۔ [2]

> ''یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اکثر واقعات جن میں دمیاطی نے اہل سیر کی موافقت اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کی تھی، اپنی رائے سے رجوع کیا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے پھیل گئے تھے، اس لئے اس کی اصلاح نہ کر سکے۔''

مصنفینِ سیرت کی تدلیس

③ سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں، ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں انہی کے نام سے کیں، ان کے مستند ہونے کی بنا پر، لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا اور چونکہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آ سکتی تھیں، اس لئے لوگ راویوں کا پتہ نہ لگا سکے اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہو

[1] غزوۂ بدر کے موقع پر ہم اس حدیث کے اصلی الفاظ نقل کریں گے۔

[2] زرقانی، ج ۳، ص: ۱۱۔

گئیں، اس تدلیس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مثلاً: جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں، لیکن انہیں روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں، حالانکہ ابن سعد کی اصلی کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔

اصولِ روایت سے ہر جگہ کام نہیں لیا گیا

④ روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق ان سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا، مثلاً: اصول روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں، کوئی راوی نہایت ضابط، نہایت معنی فہم، نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے، کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں، یہ فرق مراتب جس طرح فطرۃً عام راویوں میں پایا جاتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں اور جن کا ذکر اوپر گزر چکا، اسی بنا پر کیں۔

رواۃ میں اختلافِ مراتب

اختلافِ مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآراء مسائل کی بنیاد قائم ہے، مثلاً: دو روایتوں میں تعارض پیش آجائے تو اس بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جائے (گو دونوں راوی ثقہ ہیں) اور یہ اس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا۔

تمام صحابہ کے عدول ہونے کی بحث

لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم میں آکر یہ اصول بیکار ہو جاتا ہے۔ فرض کرو ایک روایت صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے، جس نے عمر بھر میں صرف ایک دفعہ اتفاقاً آنحضرت ﷺ کو دیکھ لیا تھا، تو اب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہو جاتا ہے، علامہ مازری مشہور محدث ہیں، علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں اکثر ان سے استناد کرتے ہیں، انہوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ کے دیباچہ (صفحہ ۱۰، ۱۱) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

لسنا نعنی بقولنا الصحابة عدول کل من راه(ﷺ) یوما ما اوزاره لماما او اجتمع به لغرض وانصرف عن کثب وانما نعنی به الذین لا زموه و عزروه ونصروه واتبعوا النور الذی انزل معه اولئك هم المفلحون۔

”یہ مقولہ کہ صحابہ سب عادل ہیں، ہم اس سے، ہر ایسے شخص کو مراد نہیں لیتے جس نے آنحضرت ﷺ کو اتفاقاً دیکھ لیا یا آنحضرت ﷺ سے کسی غرض کے لئے ملا اور پھر فوراً واپس چلا گیا، بلکہ ہم ان لوگوں کو مراد

لیتے ہیں جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بہ التزام رہے اور آپ کی اعانت و مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی، علامہ مازری نے بے شبہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربین صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخصوص کر دیا، اس بنا پر محدثین کی مخالفت ان سے بیجا نہیں لیکن اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر و علی رضی اللہ عنہم کی روایتیں، ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں، خصوصاً ان روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔

واقعات میں سلسلۂ علت و معلول نہیں قائم کیا گیا

⑤ ارباب سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے، نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے، یورپین مؤرخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتا ہے، اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتا ہے، تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں، بخلاف اس کے اسلامی مؤرخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرف داری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے، اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلۂ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

لیکن اس میں حد سے زیادہ تفریط ہوگئی، اس بات سے بچنے کے لئے کہ واقعات، رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں، وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا اور ہر واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے، مثلاً: اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں، لیکن اس کے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں گئیں وہ پہلے سے آمادۂ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار نہیں قائم کیا گیا

⑥ یہ لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے، مثلاً: ایک راوی جو ثقہ ہے، ایک ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آتا ہے اور پیش آ سکتا ہے تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کر لی جائے گی، لیکن فرض کرو، وہی راوی ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو غیر معمولی

ہے، تجربہ عام کے خلاف ہے، گردوپیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا، تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاج ثبوت ہے، اس لئے اب راوی کا معمولی درجہ وثوق کافی نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل، زیادہ محتاط، زیادہ نکتہ دان ہونا چاہیے۔

کم سن راویوں کی روایت

مثلاً: ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لئے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ ۵ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کرسکتا ہے، یا مثلاً: اگر کسی صحابی نے ۵ برس کی عمر میں آنحضرت ﷺ کے کسی قول یا فعل کی روایت کی تو قابل اعتبار ہوگی، محدثین کا اس پر استدلال ہے کہ محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، آنحضرت ﷺ کے وفات فرمانے کے وقت وہ پانچ برس کے بچے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ اظہار محبت کے طور پر ان کے منہ پر کلی کا پانی ڈال دیا تھا۔ اس واقعہ کو انہوں نے جوان ہوکر لوگوں سے بیان کیا اور سب نے یہ روایت قبول کی، اس سے ثابت ہوا کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول ہوسکتی ہے۔ [1]

اس کے برخلاف بعض محدثین کی رائے ہے کہ کمسن کی روایت قابل حجت نہیں، فتح المغیث میں ہے:

ولكن قدمنع قوم القبول هنا اى فى مسئلة الصبى خاصة فلم يقبلوا من تحمل قبل البلوغ لان الصبيى مظنة عدم الضبط وهو وجه للشافعية......

وكذا كان ابن المبارك يتوقف فى تحديث الصبى. [2]

''لیکن ایک جماعت یہاں قبول روایت سے منع کرتی ہے، خصوصاً بچوں کی روایت کے مسئلہ میں بلوغ سے پہلے جو روایت کسی بچہ نے سنی ہو، اس کو وہ قبول نہیں کرتی، شوافع کی یہی رائے ہے، اسی طرح عبداللہ بن مبارک بھی بچہ کی حدیث روایت کرنے میں توقف کرتے ہیں۔''

لیکن اثبات ونفی، دونوں پہلو بحث طلب ہیں، بے شبہ پانچ برس کا بچہ اگر یہ واقعہ بیان کرے کہ میں نے فلاں شخص کو دیکھا تھا، اس کے سر پر بال تھے، یا وہ بوڑھا تھا، یا اس نے مجھ کو گودیوں میں کھلایا تھا، تو اس روایت میں شبہ کرنے کی وجہ نہیں، لیکن فرض کرو وہی بچہ یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص نے فقہ کا یہ دقیق مسئلہ بتایا تھا، تو شبہ ہوگا کہ بچہ نے صحیح طور سے مسئلہ کو سمجھا بھی تھا یا نہیں؟

فقہا نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے، فتح المغیث میں شرح مہذب سے نقل کیا ہے:

قبول اخبار الصبى المميز فيما طريقه المشاهدة بخلاف ما طريقه النقل كالافتاء ورواية الاخبار ونحوه. [3]

''باتمیز لڑکے کی روایت ان واقعات کے متعلق جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں مقبول ہے،

---

[1] یہ پوری بحث فتح المغیث، صفحہ ۱۶۶ تا صفحہ ۱۶۸ میں ہے۔ [2] ایضاً: ۱٦٤۔ [3] ایضاً، ص: ۲۲۱۔

لیکن جو باتیں نقلیات میں داخل ہیں، مثلاً: فتویٰ یا حدیث کی روایت ان میں ان کی روایت مقبول نہیں۔"

لیکن عام طور سے یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا، فتح المغیث میں ہے:

ثم الضبط نوعان ظاهر وباطن فالظاهر ضبط معناه من حيث اللغة والباطن ضبط معناه من حيث تعلق الحكم الشرعي به وهو الفقه ومطلق الضبط الذى هو شرط فى الراوى هو الضبط ظاهرا عند الا كثر لانه يجوز نقل الخبر بالمعنى فيلحقه تهمة تبديل المعنى بروايته قبل الحفظ او قبل العلم حين سمع و لهذا المعنى قلت الرواية عن اكثر الصحابة لتعذر هذا المعنى قال وهذا الشرط وان كان على مابيّنا فان اصحاب الحديث قل مايعتبرونه فى حق الطفل دون المغفل فانه متى صح عندهم سماع الطفل او حضوره اجازوا روايته۔ [1]

"پھر ضبط [2] کی دو قسمیں ہیں، ظاہری اور باطنی، ظاہری کے یہ معنی ہیں کہ لفظ کے لغوی معنی کا لحاظ رکھا جائے، باطنی کے یہ معنی کہ شرعی حکم جس بنا پر متعلق ہیں اس کا لحاظ رکھا جائے اس کو فقہ کہتے ہیں، لیکن مطلقاً جو ضبط راوی کے لئے مشروط ہے، اکثر کے نزدیک وہ صرف ظاہری ضبط ہے، کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے، اسی بنا پر سنتے وقت قلتِ حفظ، یا قلتِ علم کے سبب سے روایت کے ادا کرنے میں راوی پر مفہوم کے بدل دینے کا شبہ ہوسکتا ہے، یہ وجہ ہے کہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بہت کم حدیثیں روایت کیں، کیونکہ مفہوم کا بعینہٖ روایت میں قائم رکھنا مشکل ہے، لیکن محدثین، بچہ کے حق میں (بے عقل کے حق میں نہیں) اس کا اعتبار کرتے بلکہ بچہ ان کے نزدیک جب سننے اور مجلس میں شریک ہونے کے قابل ہوگیا تو اس کی روایت کو جائز سمجھتے ہیں۔"

راویوں میں فقاہت کی شرط

ایک یہ بحث ہے کہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم فقیہ نہ تھے، ان کی روایت اگر قیاس شرعی کے خلاف ہو تو واجب العمل ہوگی یا نہیں؟ اس کے متعلق بحر العلوم، امام فخر الاسلام کا مذہب نقل کر کے لکھتے ہیں:

ووجه قول الامام فخر الاسلام ان النقل بالمعنى شائع وقلما يوجد النقل باللفظ فان حادثة واحدة قد رويت بعباراتٍ مختلفة ثم ان تلك العبارات

[1] ایضاً، ص:۱۲۱۔

[2] ضبط کا لفظ محدثین کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں کسی روایت کے الفاظ اور مطلب کو اچھی طرح سمجھنا اور ادا کرنا۔

لیست مترادفة بل قدروی ذلك المعنی بعبارات مجازیة فاذا کان الراوی غیر فقیه احتمل الخطأ فی فهم المعنی المرادی الشرعی......ولا یلزم منه نسبة الکذب متعمدا الی الصحابی معاذ الله عن ذالك۔ ❶

''امام فخر الاسلام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی عام طور پر شائع ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ روایت باللفظ کی جائے کیونکہ ایک ہی واقعہ مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے اور یہ الفاظ باہم مترادف بھی نہیں، بلکہ اکثر مجازی عبارتوں میں مطالب ادا کئے گئے ہیں، اس بنا پر جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے مطلب مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو، اس سے معاذ اللہ یہ لازم نہیں آتا کہ صحابی کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے۔''

محدثین اس اصول سے کہ ''واقعہ جس درجہ کا اہم ہو، شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہیے۔'' بے خبر نہ تھے۔ امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں:

روینا عن النبی ﷺ فی الحلال والحرام والاحکام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سهلنا فی الاسانید وتسامحنا فی الرجال۔ ❷

''جب ہم آنحضرت ﷺ سے حلال وحرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں، لیکن جب فضائل اور ثواب وعقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انگاری کرتے اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔''

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

ابن اسحاق رجل تکتب عنه هذه الاحادیث یعنی المغازی ونحوها واذا جاء الحلال والحرام اردنا قومًا هکذا وقبض اصابع یدیه الاربع۔ ❸

''ابن اسحاق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں ان سے روایت کی جا سکتی ہیں، لیکن جب حلال وحرام کے مسائل آئیں تو ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں یہ کہہ کر انہوں نے چار انگلیاں بند کر کے دبا لیں۔''

اس سے ثابت ہوا کہ محدثین واقعہ کی اہمیت کی بنا پر راوی کے درجہ کا لحاظ رکھتے تھے۔ اس بنا پر ابن اسحاق کی نسبت امام ابن حنبل نے یہ تفریق کی کہ ''حلال وحرام میں ان کی شہادت معتبر نہیں، لیکن مغازی میں

❶ شرح مسلم، مطبوعہ لکھنؤ، ص: ۴۳۲۔

❷ فتح المغیث، ص: ۱۲۰۔ ❸ فتح المغیث، ص: ۱۲۰۔

ان کا اعتبار ہے۔'' یہ وہی اصول ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو، اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیے اور یہ کہ واقعہ کے بدلنے سے شہادت کی اہمیت بدل جاتی ہے، لیکن واقعہ کی اہمیت احکام فقیہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔

نوعیت واقعہ کی اہمیت کا خیال، فقہائے حنفیہ نے ملحوظ رکھا، اسی بنا پر ان کا مذہب ہے کہ جو روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہیے کہ راوی، فقیہ اور مجتہد بھی ہے یا نہیں، منار میں ہے:

والراوی ان اعرف بالفقه والتقدم فی الاجتهاد کالخلفاء الراشدین والعبادلة کان حدیثه حجة یترك به القیاس خلافًا لمالك وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه کانس وابی هریرة ان وافق حدیثه القیاس عمل به وان خالفه لم یترك الا بالضرورة۔ ❶

''راوی اگر تفقہ اور اجتہاد میں مشہور ہے جیسے کہ خلفائے راشدین یا عبادلہ رضی اللہ عنہم تھے تو اس کی حدیث حجت ہوگی اور اس کے مقابلہ میں قیاس چھوڑ دیا جائے گا (بخلاف امام مالک کے) اور اگر راوی ثقہ اور عادل ہے لیکن فقیہ نہیں جیسے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا ورنہ قیاس کو بغیر ضرورت ترک نہ کیا جائے گا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مثال اگرچہ قابل بحث ہے کیونکہ اکثر علما کے نزدیک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فقیہ اور مجتہد تھے، لیکن یہ جزوی بحث ہے، گفتگو اصل مسئلہ میں ہے۔

روایت میں قیاس کا کس قدر حصہ شامل ہے

⑦ سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے، اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے، تفحص اور استقرا سے بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے وہ اس کا قیاس ہے، واقعہ نہیں، اس کی بہت سی مثالیں سیرت میں موجود ہیں، یہاں ہم صرف ایک دو واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ جب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے ناراض ہو کر تنہا نشین ہو گئے تھے تو یہ مشہور ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خبر سنی تو مسجد نبوی ﷺ میں آئے، یہاں لوگ کہہ رہے تھے۔ ❷ کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''نہیں میں نے طلاق نہیں دی۔''

یہ حدیث بخاری میں کئی جگہ بہ اختلاف الفاظ مذکور ہے، کتاب النکاح میں جو روایت ہے اس کی شرح

❶ نور الانوار، ص: ۷٤١، ۸٤١، مطبع علی بخش خاں۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب فی الایلاء: ٣٦٩٥۔

میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وان الاخبار التی تشاع و لو کثرنا قلوها ان لم یکن مرجعها الی امر حسی من مشاهدة او سماع لا تستلزم الصدق فان جزم الانصاری فی روایة بوقوع التطلیق وكذا جزم الناس الذی رآهم عمر عند المنبر بذالك محمول علی انهم شاع بینهم ذلك من شخص بناه علی التوهم الذی توهمه من اعتزال النبی ﷺ نساءه فظن لكونه لم تجر عادته بذالك انه طلقهن فاشاع انه طلقهن فشاع ذلك فتحدث الناس به واخلق بهذا الذی ابتداء باشاعة ذلك ان یكون من المنافقین كما تقدم۔ [1]

''جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں گو ان کے راوی کثرت سے ہوں لیکن اگر ان خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا سچا ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ انصاری نے اور ان صحابہ رضی اللہ عنہم نے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر کے پاس دیکھا تھا، طلاق کا جو یقین کر لیا وہ یوں ہوا ہوگا کہ کسی شخص نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور چونکہ آنحضرت ﷺ کی یہ عادت نہ تھی، اس لئے اس نے یہ قیاس کیا کہ آنحضرت ﷺ نے طلاق دے دی، اس نے یہ خبر پھیلا دی اور لوگ ایک دوسرے سے اس کو بیان کرنے لگے اور قیاس یہ ہے کہ اول جس شخص نے یہ خبر پھیلائی وہ منافق ہوگا۔''

غور کرو، مسجد نبوی ﷺ میں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم جمع ہیں اور سب بیان کر رہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے طلاق دے دی، صحابہ رضی اللہ عنہم عموماً ثقہ اور عادل ہیں اور ان کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے، باوجود اس کے جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی جرأت کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ راوی اول منافقین میں سے ہوگا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں جن میں سے ایک واقعۂ افک ہے، ان کی نسبت بھی وہی قیاس ہونا چاہیے جو حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ظاہر کیا یعنی یہ کہ منافقین نے ان کی طرف منسوب کر دیے ہوں گے، پھر تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔

فن تاریخ و روایت پر خارجی اسباب کا اثر

⑧ فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے، لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا، حدیثوں کی تدوین بنو

[1] فتح الباری، ج۹، ص: ۲۵۷ طبع اول مصر۔

امیہ کے زمانہ میں ہوئی جنہوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آلِ فاطمہ کی توہین کی اور جمعہ میں سر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعن کہلوایا، سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں، عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں، لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں، آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے اور بنو امیہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے، اسی مقام پر نظر آتے ہیں، جہاں ان کو ہونا چاہیے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ "امیر المؤمنین! اگر تو آنحضرت ﷺ کے انتقال کے وقت موجود ہوتا تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے"۔ وہیں سر دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا "تو جھوٹ کہتا ہے، امیر المؤمنین کا باپ (حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو عباسیوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا، اس کو کس نے پوچھا؟" مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔

تاہم یہ عالمگیر مؤثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے مغازی میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں، تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے، ملکی نظم و نسق اور تمدن و معاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے، یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں پڑتی تھی، اسلام میں جب تالیف و تصنیف کی ابتدا ہوئی تو یہی نمونے پیش نظر تھے، اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ سیرت کا نام مغازی رکھا گیا۔ جس طرح سلاطین کی تاریخیں جنگ نامہ و شاہنامہ کے نام سے لکھی جاتی ہیں، چنانچہ سیرت کی ابتدائی تصنیف مثلاً: سیرت موسیٰ بن عقبہ اور سیرت ابن اسحاق مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں، ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح، سنین کو عنوان بناتے ہیں اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں، یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں شروع کی جاتی ہیں۔

یہ طریقہ اگرچہ سلطنت و حکومت کی تاریخ کے لئے بھی صحیح نہ تھا، لیکن نبوت کی سوانح نگاری کیلئے تو ناموزوں ہے، پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں، اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے، لیکن یہ پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے، پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط و خال، تقدس، نزاہت، حلم و کرم، ہمدردی عام اور ایثار ہوتا ہے بلکہ عین اس وقت جبکہ اس پر سکندر اعظم کا دھوکا ہوتا ہے، ژرف بین نگاہ فوراً پہچان لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتۂ یزدانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغازی کا انداز حدیث کی کتابوں میں سیرت کی تصنیفات سے بالکل الگ ہے۔

تمام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب بنونضیر کا محاصرہ کیا تو حکم دیا کہ ان کے نخلستان کاٹ ڈالے جائیں (قرآن مجید میں بھی اس کا اجمالی ذکر ہے) ارباب سیر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے اس حکم کی نسبت یہ اعتراض کیا کہ ''یہ انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے'' لیکن مؤرخین یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب نہیں دیتے اور یوں ہی گزر جاتے ہیں۔

قیاس و درایت

⑨ نہایت مہتم بالشان بحث یہ ہے کہ کوئی روایت اگر عقل یا مسلمات یا دیگر قرائن صحیحہ کے خلاف ہو تو آیا صرف اس بنا پر واجب التسلیم ہوگی یا نہیں کہ رواۃ ثقہ ہیں اور سلسلۂ سند متصل ہے؟ علامہ ابن جوزی نے اگرچہ لکھا ہے (جیسا کہ اوپر گزر چکا) کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو، اس کے رواۃ کی جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے اصل بحث کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے، حامیان روایت لکھتے ہیں کہ اگر اس لفظ کو وسعت دے دی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا انکار کر دے گا کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے، عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوں اور سلسلہ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو، وہ باوجود خلاف عقل ہونے کے انکار کے قابل نہیں، ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

① ((تلك الغرانيق العلى)) کی حدیث کو، جس میں بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے وہ الفاظ نکلوا دیے جن میں بتوں کی تعریف ہے، بعض محدثین نے ضعیف اور ناقابل اعتبار کہا تھا، اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ بیان کی تھی۔

لو وقع لارتد كثير ممن اسلم ولم ينقل ذالك ۔

''اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسلام سے پھر جاتے حالانکہ ایسا ہونا مذکور نہیں۔''

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

وجميع ذالك لا يتمشّى على القواعد فان الطرق اذا كثرت وتباينت مخارجها دلّ ذالك على ان لها اصلاً۔ [1]

''یہ تمام اعتراضات اصول کے موافق چل نہیں سکتے، اس لئے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوتے ہیں اور ان کے ماخذ مختلف ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ اصل ہے۔''

---

[1] فتح الباری، ج ۸، ص: ۳۳۳، مطبوعہ مصر۔

② صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا۔ [1] امام رازی نے اس حدیث سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ "اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، اس لئے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ ہم حدیث کے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں۔" علامہ قسطلانی امام رازی کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

فلیس بشیء اذالحدیث صحیح ثابت و لیس فیه نسبة محض الکذب الی الخلیل وکیف السبیل الی تخطیة الراوی مع قوله انی سقیم و بل فعله کبیرهم هذا وعن سارة اختی اذ ظاهر هذه الثلاثة بلاریب غیر مراد۔ [2]

"امام رازی کا قول بالکل ہیچ ہے اس لئے کہ حدیث صحیح وثابت ہے اور اس میں محض کذب کی نسبت حضرت خلیل علیہ السلام کی طرف نہیں ہے اور راوی کا تخطیہ کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول موجود ہے انی سقیم اور بل فعله کبیرهم هذا اور سارة اختی کیونکہ ان تینوں جملوں میں ظاہر لفظ قطعاً مراد نہیں۔"

اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، ہم نے اختصار کے لحاظ سے صرف دو مثالیں نقل کیں۔

صحابہ میں دو گروہ

ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے جو دلائل عقلی اور قرائن حالی کی بنا پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے اور یہ طریقہ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد میں شروع ہو گیا تھا اور محدثین کے اخیر دور تک قائم رہا، چونکہ یہ رائے عام خیال کے خلاف ہے اس لئے ہم اس کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں:

① حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جس چیز کو آگ چھوئے، اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا "اس کی بنا پر تو لازم آتا ہے کہ ہم گرم پانی (کے استعمال) سے بھی وضو نہ کریں"۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "بھتیجے! جب تم آنحضرت ﷺ کی کوئی حدیث سنو، تو کہاوتیں نہ کہا کرو۔" [3]

② صحیح مسلم کے مقدمہ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قضایا (یعنی مقدمات کے فیصلے) پیش کئے گئے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی نقل لیتے جاتے تھے اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء: ۳۳۵۷، ۳۳۵۸۔

[2] قسطلانی، ج۵ ص: ۳۸۹، مطبع مصریه بولاق۔

[3] ابن ماجه، ابواب الطهارة، باب الوضوء مما غیرت النار: ۴۸۵ وترمذی، ابواب الطهارة، باب ما جاء فی الوضوء مما غیرت النار: ۷۹۔

والله! ما قضى بهذا عليٌّ الا ان يكون ضلّ۔ ❶

''خدا کی قسم! علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا ہے تو گمراہ ہو کر کیا ہے۔'' (لیکن چونکہ وہ گمراہ نہ تھے، اس لئے یہ فیصلہ بھی نہ کیا ہوگا)

اسی روایت کے بعد صحیح مسلم (ایضا) میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس لوگ ایک کتاب لائے، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے قلمبند تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک گز کے بقدر چھوڑ کر باقی کتاب مٹادی۔ ❷ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صرف ان فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کرلیا کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتے، اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رواۃ اور سند کا پتہ لگائیں۔

③ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ نے ایک جلسہ میں یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص خالصتاً خدا کے لئے ((لا اله الا الله)) کہے گا، خدا اس پر آگ حرام کردے گا'' اس جلسہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ جن کے مکان میں آنحضرت ﷺ نے ۷ مہینے تک قیام فرمایا تھا، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سن کر کہا:

والله! ما اظن رسول الله ﷺ قال ما قلت قط۔ ❸

''خدا کی قسم! میں کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ جو تم کہتے ہو آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہوگا۔''

محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ صحابی تھے اور حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کو ان کے ثقہ ہونے میں کلام نہ تھا، چونکہ یہ حدیث ان کے نزدیک قرائن کے خلاف تھی، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ اس پر یقین نہ لاسکے اور کہا کہ ''آنحضرت ﷺ نے ایسا نہ فرمایا ہوگا۔'' اگرچہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ نے مدینہ آکر اس حدیث کی تصدیق اپنے راوی (عتبان) سے کرلی، لیکن اس سے اصل مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کو جن اسباب کی بنا پر، محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ کی روایت میں شبہ پیدا ہوا، عتبان پر بھی وہی شبہ پیدا ہو سکتا تھا، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ خدانخواستہ، محمود کو غلط گو نہیں سمجھتے تھے بلکہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے روایت کے مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہوگی، یہ احتمال بعینہ راوی اول کی نسبت بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا تھا، کہ ''تم لوگ سچے لوگوں سے روایت کرتے ہو، لیکن سامعہ غلطی کر جاتا ہے۔'' ❹

④ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے تیمم کی روایت بیان کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یقین نہیں آیا، بلکہ جیسا کہ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے، یہ الفاظ کہے اتق الله یاعمار ''یعنی اے عمار! خدا سے ڈرو۔'' چنانچہ اسی بنا پر جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے، حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس روایت سے

❶ صحيح مسلم، باب النهي عن الرواية عن الضعفاء: ٢٢۔

❷ نووی شرح صحیح مسلم (ج۱، ص:۳۸) میں لکھا ہے 'کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب 'طومار' کی شکل میں لکھی تھی (جس طرح اگلے زمانہ میں خطوط کو لمبان میں جوڑ کر جمع کرتے تھے اور لپیٹ کر رکھتے تھے)۔

❸ صحيح بخاري، كتاب التهجد، باب صلوٰة النوافل جماعة: ١١٨٦۔

❹ صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب الميت يعذب ببكاء اهله: ٢١٤٩۔

استدلال کیا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، لیکن عمر رضی اللہ عنہ کو عمار رضی اللہ عنہ کی روایت سے تسکین نہیں ہوئی۔ ❶

⑤ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو انہوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت کے خلاف ہے:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ ﴾ (۱۷/ الاسراء:۱۵)

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

⑥ اسی طرح جب ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت (ﷺ) نے کشتگان بدر کی نسبت فرمایا کہ میں جو کہتا ہوں یہ سنتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ''کہ ابن عمر نے غلطی کی۔'' ❷ اس روایت کے راوی اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تھے، جو مشہور صحابی ہیں، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بنا پر روایت کی صحت سے انکار کیا کہ ان کے نزدیک وہ روایت قرآن مجید کے خلاف تھی۔

اکثر محدثین نے ان مباحث میں ثابت کیا ہے کہ روایت صحیح ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اجتہاد جس کی بنا پر انہوں نے روایت سے انکار کیا، صحیح نہیں، ہم کو اس سے بحث نہیں، اس موقع پر صرف یہ بحث ہے کہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ دلائل عقلی یا نقلی کے خلاف ہے۔

⑦ ایک مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق دے دی جائے تو عدت کے زمانہ تک شوہر پر اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام، واجب ہے یا نہیں؟ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ تھیں جن کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی تھی، ان کا بیان ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس گئیں تو آپ نے ان کو نفقہ اور مکان نہیں دلوایا، انہوں نے یہ حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کہ ہم خدا کی کتاب اور آنحضرت ﷺ کی سنت کو ایک عورت کے بیان پر چھوڑ نہیں سکتے، جس کی نسبت ہم کو معلوم نہیں کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی۔'' امام شعبی نے ایک مجلس میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت بیان کی تو اسود بن یزید نے ان کو کنکریاں ماریں کہ تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو! پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورۂ بالا قول نقل کیا۔ ❸

محدثین اور درایتِ حدیث

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد بھی محدثین میں ایک ایسا گروہ موجود رہا جو عقلی یا نقلی وجوہ کی بنا پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا، گو ان کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوتے تھے۔

① ایک ضعیف حدیث ہے کہ ''جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور وفات پائی، وہ شہید ہوا۔'' حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ زاد المعاد میں، اس حدیث کو دلائل عقلی سے باطل ثابت کرکے لکھتے ہیں:

❶ صحیح بخاری، کتاب التیمم: ۳٤٥ وصحیح مسلم، کتاب الحیض، باب التیمم: ۸۲۰۔
❷ صحیح مسلم، کتاب الجنائز: ۲۱٥٤ میں یہ روایتیں متعدد طریقوں سے مذکور ہیں۔
❸ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب المطلقة البائن لا نفقة لها: ۳۷۱۰۔

فلو کان اسناد هذا الحدیث کالشمس کان غلطا و وهما۔ ❶

''اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح بھی ہوتی تب بھی وہ غلط اور وہم ہوتی۔''

② صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب الفئی میں روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ

اقض بینی وبین هذا الکاذب الآثم الغادر الخائن۔ ❷

''میرے اور اس جھوٹے، مجرم، دھوکہ باز، خائن کے درمیان فیصلہ کیجئے۔''

چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں یہ الفاظ کسی مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے، اس لئے بعض محدثین نے اپنے نسخہ سے یہ الفاظ نکال دیے۔ ❸ علامہ مازری، اس حدیث کی نسبت لکھتے ہیں:

اذا انسدت طرق تاویلها نسبنا الکذب الی رواتها۔ ❹

''جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔''

③ بخاری میں روایت ہے کہ خدا نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا، ❺ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ویشکل علی هذا ما یوجد الآن من آثار الامم السالفة کد یار ثمودهم، فان مساکنهم تدل علی ان قاماتهم لم تکن مفرطة الطول علی حسبمایقتضیه الترتیب السابق...... ولم یظهر الآن مایزیل هذا الاشکال۔ ❻

''اور اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں، مثلاً: قوم ثمود کے مکانات، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قد اس قدر بڑے نہ تھے، جیسا کہ ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے...... اور اس وقت تک مجھ کو اس اشکال کا جواب نہیں معلوم ہوا۔''

④ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے کہ ''اے خدا! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو رسوا نہ کرے گا۔'' ❼ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وقد استشکل الاسماعیلی هذا الحدیث من اصله وطعن فی صحته۔ ❽

❶ زادالمعاد، جزء ثانی، فصل فی هدیه فی علاج العشق فصل وان کان لا سبیل للعاشق الی وصال معشوقه قدرا وشرعا مطبوعہ نظامی کانپور صفحہ ۹۶۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الفيء: ٤٥٧٧۔

❸ نووی شرح صحیح مسلم، ذکر حدیث مذکور، ج ۱۲، ص: ۷۲ مطبع مصریه ازهر: ۱۹۳۰۔

❹ نووی شرح صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب حکم الفيء ایضًا۔

❺ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء: ۳۳۲۶۔ ❻ فتح الباری، مطبوعه مصر، ج ٦، ص: ۲٦۰، کتاب بدء الخلق۔ ❼ صحیح بخاری، ایضًا: ۳۳۵۰۔

❽ فتح الباری، مطبوعه مصر ج ۸، ص: ۳۸٤، کتاب التفسیر، سورة الشعرآء۔

"اور اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے۔"

اسماعیلی کے اعتراض کا حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا ہے، لیکن اسماعیلی کا درجہ فن حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے، اس لئے گو اسماعیلی کا اعتراض غلط ہے لیکن قابل لحاظ ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے۔

⑤ عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا، اس پر اور بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگسار کیا، ❶ حافظ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں، اس بنا پر اس حدیث کی صحت میں تامل کیا کہ جانور مکلف نہیں، اس لئے ان کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہو سکتا، نہ اس بنا پر ان کو سزا دی جا سکتی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وقد استنكر ابن عبدالبر قصة عمرو بن ميمون هذه وقال: فيها اضافة الزنا الى غير مكلف واقامة الحد على البهائم۔ ❷

"ابن عبدالبر نے عمرو بن میمون کے اس قصہ سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلف کی طرف، زنا کی نسبت ہے اور جانوروں پر حد قائم کرنا بیان کیا گیا ہے۔"

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ "اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے، اگر سند صحیح ہے تو غالباً یہ بندر جن رہے ہوں گے۔"

⑥ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک ❸ دفعہ عبداللہ بن ابی کے طرفداروں اور آنحضرت ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں جھگڑا ہو گیا، اس پر یہ آیت اتری:

﴿ وَإِن طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ﴾ (٤٩/ الحجرات:٩)

"اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں، تو ان میں صلح کرا دو۔"

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا، اس بنا پر ابن بطال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیت قرآنی، اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مؤمن ہوں اور یہاں عبداللہ بن ابی کا گروہ علانیہ کافر تھا"۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا۔ ❹

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلہ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اس کے موافق ہیں یا نہیں۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب القسامة فی الجاهلية:٣٨٤٩۔ ❷ فتح الباری، مطبوعہ مصر ج٧، صفحہ: ١٢٢، باب ايام الجاهلية۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب العلم، روایت میں جھگڑے کی تفصیل ہے ہم نے محض خلاصہ ذکر کر دیا ہے۔ (کتاب العلم سہواً یا کتابت کی غلطی ہے یہ روایت کتاب الصلح، باب ماجاء فی الاصلاح بين الناس:٢٦٩١ کی ہے) ❹ فتح الباری، ج٥، ص:٢١٩۔

روایت بالمعنی

⑩ ایک بڑا مرحلہ روایت بالمعنی کا ہے، یعنی آنحضرت ﷺ نے یا صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو الفاظ فرمائے تھے بعینہٖ وہی ادا کرنے چاہئیں، یا ان کا مطلب ادا کر دینا کافی ہے، محدثین اس باب میں مختلف الرائے ہیں اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں فرق نہیں پیدا ہوتا، تو الفاظ کی پابندی ضروری نہیں۔ لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا، ایک اجتہادی بات ہے، اسی بنا پر بعض محدثین مثلاً: عبدالملک بن عمر، ابوزرعہ، سالم بن جعد، قتادہ، امام مالک، ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے ❶ لیکن یہ ظاہر ہے کہ سینکڑوں راویوں میں صرف دو چار اشخاص ایسی پابندی کر سکتے تھے اور وہ بھی اس زمانہ میں کہ تحریر کا رواج ہو چکا تھا، عام حالت یہی تھی کہ راویوں کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے، جامع ترمذی، کتاب العلل میں سفیان ثوری رحمہ اللہ کا قول نقل ہے:

ان قلت لكم انى احدثكم كما سمعت فلا تصدقونى انما هو المعنى۔ ❷

''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں جو سنتا ہوں بعینہٖ وہی ادا کر دیتا ہوں، تو تم میری بات نہ مانو میں صرف مطلب ادا کرتا ہوں۔''

ترمذی نے اسی مضمون کے اور اقوال، واثلہ بن الاسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری، امام شعبی رحمہ اللہ وغیرہ سے نقل کیے ہیں۔

جو صحابہ رضی اللہ عنہم بہت محتاط تھے، حدیث کی روایت کے وقت ان کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔

سنن ابن ماجہ کے دیباچہ میں عمرو بن میمون کا قول نقل کیا ہے کہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ہمیشہ جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا، میں نے کبھی ان کو یہ کہتے نہیں سنا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا۔ ایک دن ان کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا تو دفعتہ سر جھکا لیا، پھر میری نظر ان پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے ہیں قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہیں، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں، گلے کی رگیں پھول گئی ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نے یوں کہا، یا یوں، یا اس سے کچھ زیادہ، یا اس سے کچھ کم، یا اس کے مشابہ۔'' ❸

امام مالک رحمہ اللہ کا یہ حال تھا کہ جب حدیث روایت کرتے تھے تو خوف زدہ ہو جاتے اور کہتے کہ ''آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا، یا یوں فرمایا تھا۔'' ❹ امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں سال بھر حاضر رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا۔'' ❺ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ ''میں نے سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ مبارکہ سے مدینہ طیبہ تک سفر کیا، لیکن اس تمام راہ میں انہوں نے ایک حدیث بھی آنحضرت ﷺ سے روایت نہیں کی۔ (حالانکہ وہ صحابی تھے) ❻

---

❶ ترمذی، کتاب العلل، ج ۲، ص: ۲۳۶ میں ان لوگوں کے متعلق یہ تصریح مذکور ہے۔ ❷ ترمذی، کتاب العلل، ج ۲، ص: ۲۳۵۔ ❸ سنن ابن ماجه، كتاب السنة، باب التوقی فی الحديث عن رسول الله ﷺ: ۲۳۔
❹ ایضًا: ۲۴۔ ابن ماجہ میں یہ قول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ ❺ ایضًا: ۲۶۔ ❻ ایضًا: ۲۹۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے پوچھا کہ ''میں نے آپ کو دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا، انہوں نے کہا: ''میں جب سے اسلام لایا، میں نے کبھی آنحضرت ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا، لیکن میں نے آنحضرت (ﷺ) سے سنا ہے کہ جو شخص میری نسبت کوئی جھوٹی روایت بیان کرے تو چاہیے کہ اپنا گھر آگ میں بنائے۔ ❶

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے منبر پر یہ ارشاد فرمایا تھا:

((ایاکم و کثرۃ الحدیث عنی)) ❷

''خبردار! مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ روایت کرو۔''

اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغ گوئی کا خیال نہیں ہوسکتا، لیکن ثقہ راوی سے بھی مطلب روایت کے سمجھنے یا ادا کرنے میں غلطی کا ہو جانا ممکن ہے اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر کیا جاتا ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی گئی:

((ان المیت لیعذب ببکاء الحی))

''مردوں پر نوحہ کیا جائے تو ان پر عذاب کیا جاتا ہے۔''

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

انکم لتحدثونی عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یُخطیء۔ ❸

''تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو، نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں، لیکن کان غلطی کر جاتا ہے۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا:

اما انہ لم یکذب ولکنہ نسی او اخطأ۔ ❹

''ہاں وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی۔''

روایتِ آحاد

⑪ ایک اور بحث روایت آحاد کی ہے، روایت آحاد وہ ہے، جس کے سلسلہ اسناد میں کہیں صرف ایک راوی پر مدار روایت ہو، یعنی کوئی دوسرا راوی اس کا مؤید نہ ہو، اس قسم کی روایت کے تسلیم و انکار اور یقینی و ظنی ہونے کے متعلق اہل فن کا اختلاف ہے۔ معتزلہ روایات آحاد کی تسلیم سے قطعاً منکر ہیں، لیکن یہ درحقیقت انکار بداہت ہے، ہم روزمرہ واقعات زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلا حجت و اصرار فوز الیقین کر لیتے ہیں، ہم سے

❶ ایضًا، باب التغلیظ فی تعمد الکذب علی رسول اللہ ﷺ: ۳۶۔ ❷ ایضًا: ۳۵۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ: ۲۱۴۹۔

❹ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، ایضًا: ۲۱۵۶۔

ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ "زید تم کو بلاتا ہے" اور ہم فوراً اٹھ کر چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ یہ خبر آحاد ہے اور ہم اسے تسلیم نہیں کرتے، معتزلہ کے مقابل میں اکثر محدثین اس کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں، لیکن یہ درحقیقت تفریط ہے، خود صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرز عمل اس کے مخالف ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گئے اور تین دفعہ اجازت طلبی کی، چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی کام میں مشغول تھے، کچھ جواب نہ ملا، وہ واپس چلے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کام سے فارغ ہو کر ان کو بلوا بھیجا اور واپسی کا سبب پوچھا، انہوں نے کہا: "میں نے رسول اللہ (ﷺ) سے سنا ہے کہ تین دفعہ اجازت طلبی کے بعد، جواب نہ ملے تو واپس جاؤ۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اس روایت پر گواہ لاؤ، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔" ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس پر شہادت پیش کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تسلیم کیا، [1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ خدانخواستہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو غلط گو نہیں جانتے تھے، لیکن چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارگاہ نبوت میں برسوں رہے تھے اور انہوں نے یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے نہیں سنی تھی، حالانکہ حدیث ایسے امر کے متعلق تھی جو عموماً پیش آتا ہے، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے صرف ایک شخص کی شہادت کافی نہیں سمجھی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی، میراث کا دعویٰ کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں اور نہ آنحضرت ﷺ سے اس باب میں کوئی روایت مجھ کو معلوم ہے"۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے شہادت دی کہ آنحضرت ﷺ دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی تنہا شہادت ایسے واقعہ کے متعلق کافی نہیں سمجھی اور جب ایک اور صحابی محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے شہادت دی، تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو میراث دلائی۔ [2]

اسی طرح جنین کی دیت کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں ہیں۔ [3]

(اسی بنا پر روایتِ آحاد کے متعلق فقہائے احناف کا اصول ایک حد تک صحیح ہے کہ یہ ظنی الثبوت ہیں، ان سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی ہے، اصل یہ ہے کہ روایاتِ آحاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن وقطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد، خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر مبنی ہے، ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ "زید نے تم کو بلایا ہے۔" تو راوی کی ثقاہت واعتبار کے مسلم ہونے کے بعد، ہم کو کبھی اس واقعہ کے تسلیم سے انکار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ "تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے"۔ تو ہم اس واقعہ کی تسلیم میں پس وپیش کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کے متعلق اگر کوئی تنہا راوی یہ بیان کرتا ہے کہ "آپ ﷺ ایک بار سفید کرتہ پہن

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسلیم والاستئذان ثلاثا: ٦٢٤٥۔ [2] ابوداود، کتاب الفرائض، باب فی الجدة: ٢٨٩٤۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب جنین المرأة: ٦٩٠٦ تا ٦٩٠٨۔

کر باہر تشریف لائے۔'' تو ہم کو اس کی تسلیم میں عذر نہیں، لیکن وہی راوی اگر یہ کہتا ہے کہ ''ایک بار آپ برہنہ تن باہر نکل آئے'' (اس قسم کی ایک روایت ہے) تو قطعاً ہم تنہا شہادت اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں سمجھیں گے۔

نتائج مباحث مذکورہ

گزشتہ صفحات میں ہم نے روایت و حدیث کے متعلق صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کا جو طرز عمل پیش کیا ہے اور علمائے نقد و حدیث کے جن قواعد و اصول کی تفصیل کی ہے، ذیل میں بہ ترتیب نتائج کے طور پر ہم ان کا اعادہ کرتے ہیں:

① سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں، پھر عام احادیث میں کرنی چاہیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

② کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں، اور ان کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

③ سیرت کی روایتیں باعتبار پایہ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں، اس لئے بصورت اختلاف احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

④ بصورتِ اختلافِ روایاتِ احادیث، رواۃ ارباب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

⑤ سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

⑥ نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیے۔

⑦ روایات میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے و فہم کا کس قدر جزو شامل ہے۔

⑧ اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے؟

⑨ جو روایات عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائنِ حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی۔

⑩ اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

⑪ روایات آحاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کر لینا چاہیے۔

ان اصول کے تقرر و تفصیل کے بعد نظر آ سکتا ہے کہ اسلامی فن روایت، عقل و درایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے؟ علمائے حدیث نے تصحیح روایت کے لئے کتنی محنت، کتنی جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی اور کتنی دقت رسی صرف کی ہے، کیا اس اہتمام و اعتنا کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ و روایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا سیرت کے سیرت نگاران پیغمبر اسلام میں سے کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی لائف کے لئے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد و اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے؟) [1]

[1] زیادت از صفحہ: ۷۷ تا ۷۸ (س)۔

یورپین تصنیفات

آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں، ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف ہلدی برٹ سے لے کر جو ۱۱۳۹ء میں موجود تھا۔ آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ ان کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ ان کے وسائل معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوئے ظن کا کہاں تک اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو جابجا ان تصنیفات سے کام لینا، یا ان سے تعرض کرنا پڑتا ہے۔

یورپ کی پیغمبرِ اسلام ﷺ سے ابتدائی واقفیت

یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، ایک یورپین مصنف لکھتا ہے:

> ''عیسائیت، اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی، وہ صرف تھراتی اور حکم بجالاتی تھی، لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے تو ان قوموں نے جو ان کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب کہ اس کا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے۔'' [1]

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا، اس کو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جس کی تصنیف عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے، یوں بیان کرتا ہے:

> ''وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرون وسطی میں رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض وعداوت سے بھری ہوئی ہیں، جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں، ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں، ہر مسیحی شاعر، مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا اور حسب ترتیب درجات ان کے تین خدا تسلیم کئے جاتے تھے، ماہوم، یا ماہون، یا مافومیڈ (یعنی محامٔد) اور اپلین اور تیسرا ٹرماگان، ان کا خیال تھا کہ محمد ﷺ نے اپنے مذہب کی بنیاد، دعوائے الوہیت پر قائم کی اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمد ﷺ (وہ محمد ﷺ جو بت شکن اور دشمن اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔

---

[1] محمڈ اینڈ محمڈنزم۔ از باسورتھ اسمتھ صاحب، ایم اے صفحہ ۶۳۔

Bosworth Smith: (Mohammad & Mohammadanism,P.63)

اسپین میں جب عیسائی، مسلمانوں پر غالب آئے اوران کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا، تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بتوں کو انہوں نے توڑ ڈالا، اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے:

''اسپین مسلمانوں کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا، اس پر وہ پل پڑے اوراس کو نہایت سخت سست کہا اوراس کو گالیاں دیں اوراس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی اوراس کو پاؤں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے اور ماہوم کو (جو ان کا دوسرا دیوتا تھا) ایک گڑھے میں ڈال دیا، اس کو سوراور کتوں نے نوچ ڈالا، اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی، اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی اور از سرنو تلف شدہ بتوں کو بنایا، اسی بنا پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دے دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں، وہ مسجدوں میں گھس گئے اورلوہے کے ہتھوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا''

ایک دوسرا شاعر ریچر خدا سے دعا کرتا ہے کہ ''وہ ماہوم کے بُت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے''۔ اس کے بعد وہ امراء کو جنگ صلیبی کے لئے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے۔ ''اٹھو اور ماہومیڈ اور ٹرماگان کے بتوں کو اوندھا کردو اوران کو آگ میں ڈال دو اوران کو اپنے خداوند کی نذر کردو۔'' [1]

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے۔ (چوتھے حصہ میں ہم اس کو مفصل لکھیں گے)

سترہویں اور اٹھارہویں صدی

سترھویں صدی کے سنین وسطی، یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے، یورپ کی جدوجہد، سعی وکوشش اور حریت وآزادی کا دور، اسی عہد سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی، وہ مستشرقین یورپ کا وجود ہے، جن کی کوشش سے نادرالوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں، عربی زبان کے مدارس، علمی وسیاسی اغراض سے جابجا ملک میں قائم ہوئے اور اس طرح وہ زمانہ قریب آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا۔

اس دور کی خصوصیت اول یہ ہے کہ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے، کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبر ﷺ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع بموقع معلومات سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔

اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی اوراس کے مذہبی اور سیاسی امور، الگ الگ ہوگئے، اس بنا پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ ہوگئیں، عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق و

[1] ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری بزبان عربی مطبوعہ مصر از صفحہ: ۸ تا ۱۰۔

غیر متعصب گروہ، اسلام کے متعلق ان دونوں جماعتوں نے جو کوششیں کیں، وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

اس عہد میں عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ ہو گیا تھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ارپی نیوس (Arp) مارگولیتھ (MAR Goliouth) ایڈورڈ پوکاک (E-Pococke) اور ہاٹنجر (Hattinger) ذکر کے قابل ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے ابتدا میں جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا، وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں جو قرون ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے۔ یعنی سعید بن بطریق اوتیکوس المتوفی ۹۳۹ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا اور ابن العمید المکین المتوفی ۱۲۷۳ء جو سلاطین مصر کا ایک درباری تھا اور ابوالفرج بن العبری الملطی المتوفی ۱۲۸۶ء مصنف تاریخ الدول۔

ابن العمید المکین کی تاریخ طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے، ارپی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا، لاطینی ترجمہ کے ساتھ، لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے دولتِ اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے، یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اخیر اٹھارہویں صدی

یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہو گئی، جس نے ''اورینٹلسٹ'' کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی جنہوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع واشاعت کے سامان پیدا کئے اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔

سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرق میں ۱۷۷۸ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی اس کی تقلید میں انگریزوں نے بمقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہو گئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت ومغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کر کے باستثنائے چند، اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو گیا، سب سے پہلے رسک (Reiske) المتوفی ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابو الفداء مع ترجمہ لاطینی وحواشی پانچ جلدوں میں شائع کی۔ ۱۸۰۹ء میں کیپٹن اے میتھوس

(A-N-Mathews) نے کلکتہ سے مشکوۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا، ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (Kremer) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی، ۱۸۶۰ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرت الرسول کی کوٹنگن (Cottingen) سے اشاعت کی، اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی۔ ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (G-Weil) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا، ۱۸۷۷ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمہ فرانسیسی پروفیسر ڈی مانیارڈ نے شائع کی، ولہوسن (Wellhausen) نے ۱۸۸۲ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان ''محمد بہ مدینہ'' برلن سے شائع کیا، ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے ہاؤتسما (Houtasma) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی۔ ۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۲ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادر الوجود تاریخ بارتھ (J. Barth) اور نولدیکی (Noldeke) وغیرہ نے شائع کی اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (Sachau) کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں، تقریباً ۱۹۰۰ء سے گزشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے شائع ہوتی رہی۔

ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگاران پیغمبر عرب ﷺ کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

اوکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

''محمد ﷺ کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے، لیکن اس میں جگہ پانا قابل فخر چیز ہے۔'' [1]

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں، جو بہ تخصیص آنحضرت ﷺ کے حالات میں، یا اسلام کے اصول عقائد پر لکھی گئیں اور جن میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں، یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۱	ڈاکٹر جی، پی، (آر)	انگلستان	سیرت محمد خادع (نعوذ باللہ)	۱۸۱۵ء
۲	ڈاکٹر وایٹ (واعظ اوکسفورڈ) DTI White	انگلستان	بیمفٹن سرمنز (اسلام اور پیغمبر اسلام)	اوائل ۱۸۰۰ء

[1] مارگولیتھ ''محمد'' (ﷺ) دیباچہ، صفحہ ۱۔

۳	گارڈ فری ھگنس ایم، آر، اے، ایس GodFreyHiggins	انگلستان	اپالوجی	۱۸۲۹ء
۴	ڈاکٹر جے، اے، مولر J.A.Muller	جرمن	اسلامزم	۱۸۳۰ء
۵	گارسن ڈی ٹاسی Garcindetossy	فرانس	اسلام وقرآن	۱۸۳۱ء تا ۱۸۷۴ء
۶	ایڈورڈلین Edwardlane	انگلستان	انتخابات القرآن	۱۸۴۳ء
۷	ڈاکٹر ویل Weil	جرمن	ترجمہ وتحشیہ ابن ہشام و کتاب محمد پیغمبر ﷺ	۱۸۴۵ تا ۱۸۴۶ء
۸	کارلائل Corlyle	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	۱۸۴۶ء
۹	کوسن ڈی برسیوال Caussindeperseval	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۴۷ء
۱۰	واشنگٹن اورونگ W.Irving	انگلستان	سیرت محمد ﷺ	۱۸۴۹ء
۱۱	ڈاکٹر اسپرنگر Springer	جرمن	سیرت محمد ﷺ	۱۸۵۱ء
۱۲	وان کریمر Vonkreme	جرمن	ترجمہ وتحشیہ واقدی	۱۸۵۶ء
۱۳	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	مضمون ”محمد ﷺ“	۱۸۵۸ء
۱۴	ڈوزی Dozy	ہولینڈ	تاریخ اسلام	۱۸۶۱ء
۱۵	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	بزرگ ترین عرب	۱۸۶۱ء
۱۶	ڈی لین Delane	انگلستان	سیرت محمد ﷺ	۱۸۶۱ء
۱۷	میور Muir	انگلستان	سیرت محمد ﷺ	۱۸۶۱ء
۱۸	برتھالمی سینٹ ہلیر St.Hilaire	فرانس	محمد ﷺ وقرآن	۱۸۶۵ء
۱۹	نولدیکی Nolde ky	جرمن	مضامین قرآن واسلام	۱۸۶۹ء
۲۰	دوشیف مضمون نگار کوارٹرلی ریویو	انگلستان	اسلام	۱۸۶۹ء
۲۱	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	انگلستان	محمد ﷺ	۱۸۷۲ء
۲۲	جولیس چارلس JuliusCharles	فرانس	تاریخ بانی اسلام	۱۸۷۴ء
۲۳	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	انگلستان	محمد (ﷺ) اور اسلام	۱۸۷۵ء

۲۴	باسورتھ اسمتھ Bosworthsmith	انگلستان	محمد (ﷺ) اور اسلام	۱۸۷۵ء
۲۵	سیدیو Sedillot	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۷۷ء
۲۶	ولہوسن Wellhausen	جرمن	تبصرہ بر واقدی	۱۸۸۲ء
۲۷	اہل کراہل Krehl	جرمن	سیرت محمد ﷺ	۱۸۸۴ء
۲۸	گولڈزیہر Goldziher	جرمن	مطالعۂ اسلام	۱۸۹۰ء
۲۹	رینان Renan	فرانس	تاریخ مذاہب	۱۸۹۲ء
۳۰	ایچ گریم H.Grimme	ہولینڈ	سیرت محمد ﷺ	۱۸۹۴ء
۳۱	ہنری دی کاستری HenrydeCasteri	فرانس	اسلام پر خیالات	۱۸۹۶ء
۳۲	ایف بوہل Buhl	ہولینڈ	سیرت محمد ﷺ	۱۹۰۳ء
۳۳	والسٹن Wallaston	انگلینڈ	آدھ گھنٹہ محمد (ﷺ) کے ساتھ	۱۹۰۵ء
۳۴	مارگولیتھ Margoliouth	انگلینڈ	محمد (ﷺ)	۱۹۰۵ء
۳۵	کوئل Koell	انگلینڈ	محمد (ﷺ) اور اسلام	۱۸۹۴ء
۳۶	پرنس کائتانی Prince Caetani	اٹالیہ	تاریخ کبیر محمد (ﷺ) و اسلام و سلاطین اسلام	جاری
۳۷	میجر لیونارڈ MajorLeonard	انگلینڈ	اسلام کا روحانی و اخلاقی پایہ	۱۹۰۹ء

مصنفین یورپ کی تین قسمیں

مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں:

① جو عربی زبان اور اصلی ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست ہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں سے بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں۔ لیکن قلیل ماھم۔

② عربی زبان اور علم ادب و تاریخ و فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام، یا شارع اسلام ﷺ کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً: جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے، اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی

سے کون انکار کرسکتا ہے۔ بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا۔ نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلو پیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے جا بجا نہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

③ وہ مستشرقین جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً پامر صاحب یا مارگولیتھ صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے۔ لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ ع

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیتھ نے مسند امام احمد بن حنبل کی ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہوسکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے دنیا کی تاریخ، اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب وافترا اور تاویل وتعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کر سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوسکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی دان ہیں، کئی سال مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے۔ لکھنؤ میں آ کر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گزری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ، اول اول انہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ۳ جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ [1]

یورپین مصنفین کی غلط کاریوں کے اسباب

یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو وہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

① سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ استناد صرف سیرت وتاریخ کی کتابیں ہیں، مثلاً: مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفات سیرت

[1] یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، میں جرمن نہیں جانتا، لیکن اس کے اقوال اکثر اور مصنفین نے نقل کیے ہیں اور وہ ہماری نظر سے گزرے ہیں۔

کی طرف رجوع کرنا چاہیے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، چنانچہ اس کی بحث اوپر گزر چکی، مصنفینِ سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں۔ مثلاً: سیف، سری، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں، اس لئے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہو سکتی ہے، لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے ان کے لئے یہ سرمایہ بیکار ہے۔

آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایاتِ صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی ہے (مثلاً مارگولیتھ) تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سینکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔

② دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور ہمارے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے۔ یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب؟ اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں؟ حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ تو ممکن ہے، نہ ہی ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود، قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے، یا نہیں؟ فرض کرو، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا، تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صورت تسلیم کر لی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مؤرخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے، بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ "اسمائے رجال" کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابل اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا، تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو، لیکن اس کی روایت قبول کر لی جائے گی۔

اس اختلاف اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے، مثلاً: اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں۔ سب موجود ہوتی ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتی ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہیں، ان میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں، چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ

خاکہ کو نقش ونگار سے کامل کر دیا جائے، لیکن یہ جرأت صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں۔ ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کئے ہیں اور جن کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپین تصنیفات کے اصولِ مشترکہ

یورپین مصنفین، آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا ان کی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

① آنحضرت ﷺ کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے، لیکن مدینہ جا کر جب زور وقوت حاصل ہوتی ہے تو دفعتاً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں، یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی، خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

② کثرتِ ازدواج اور مَیل الی النساء۔

③ مذہب کی اشاعت، جبر اور زور سے۔

④ لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

⑤ دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بنا پر، ہماری کتاب کے ناظرین کو، تمام واقعات میں اس نکتہ پر نظر رکھنی چاہیے، کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار میں بھی ٹھیک اُتر سکتے ہیں یا نہیں۔

اس کتاب کی تصنیف وترتیب کے اصول

ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں، اب ان کے بتانے کا وقت آ گیا ہے۔

① سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، ان کو سب پر مقدم رکھا ہے، یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، لیکن لوگوں نے آیات قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی، اس لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

② قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں، جو واقعات بخاری ومسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، ارباب سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتب حدیث میں، ان موقعوں پر ڈھونڈتے ہیں، جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اس کو درج ہونا چاہیے اور جب ان کو، ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں

ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں، لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آ جاتے ہیں، اس لئے اگر عام استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کئے، جو اہل سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے۔

(۳) روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں، لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تاامکان کدوکاوش کی ہے، اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے، جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا، تاکہ جس سلسلہ روایت کی تحقیق مقصود ہو، بہ آسانی ہو جائے۔

(۴) جن فروگزاشتوں کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، جہاں تک ممکن تھا، ان کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

کتاب کے حصے

اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔ [1]

پہلے حصہ

میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت ﷺ کی ولادت سے لے کر وفات تک عام حالات اور واقعات و غزوات ہیں، اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت ﷺ کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے، آل و اولاد اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔

دوسرا حصہ

منصب نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض، تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاح اعمال اور اخلاق ہے، اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائضِ خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے، کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

تیسرے حصہ

میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث ہے۔

---

[1] اب یہ کتاب سات حصوں میں مرتب ہوگئی ہے اور ترتیب بھی بدل گئی ہے۔

چوتھے حصہ

میں معجزات کی تفصیل ہے، قدیم سیرت کی کتابوں میں معجزات کا الگ باب باندھتے ہیں، لیکن آ جکل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی ضرورت بھی پیش آ گئی ہے، البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً: معراج، یا تکثیر طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ

خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے، یعنی یورپ نے آنحضرت ﷺ اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایۂ معلومات کیا ہے؟ تاریخی واقعات میں وہ کیونکر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائل اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات یا مسائل اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں، ان کے جوابات۔

یہ ضروری نہیں کہ یہ حصے اسی ترتیب سے شائع ہوں، بلکہ جس حصہ کی تیاری کے سامان فراہم ہو جائیں گے اور مرتب ہو جائے گا، وہ شائع کر دیا جائے گا۔

استناد اور حوالے

تاریخ اور روایت میں، حوالہ اور استناد، سب سے مقدم چیز ہے، اس لئے اس کے متعلق چند ضروری امور بیان کر دینے ضروری ہیں۔

① صرف انہیں کتابوں کا حوالہ دیا ہے جو خود میری نظر سے گزری ہیں۔

② جو واقعات کسی قدر اہم ہیں، ان کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کدوکاوش نہیں کی ہے۔

③ مطبوعہ کتابوں کے حوالہ میں مطبع کا نام بتا دیا گیا ہے، قلمی کتابوں کے متعلق تصانیف سیرت کی فہرست جو اوپر گزر چکی ہے، اس میں بتا دیا ہے کہ ہمارے استعمال میں کونسا نسخہ تھا۔

وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

عرب

وجہ تسمیہ

عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں، اہلِ لغت کہتے ہیں کہ عرب اور اعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں اور چونکہ اہل عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو ''عرب'' اور دنیا کی اور تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ بیان) کہہ کر پکارا۔

بعض کی رائے ہے کہ عرب اصل میں عربۃ تھا، قدیم اشعار میں عرب کے بجائے عربۃ آیا ہے۔

ورجّت باحة العربات رجّا ترقرق فی مناکبها الدماءُ

وعربةُ ارض جد فی الشرا اهلها کما جدَّ فی شرب النقاخ ظماءُ

وعربةُ ارض ما یحِل حرامهَا من الناس الا اللوذعی الحُلاحل [1]

عربۃ کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں اور چونکہ عرب کا بڑا حصہ دشت وصحرا ہے، اسلئے تمام ملک کو عرب کہنے لگے۔

جغرافیہ

عرب کے حدودِ اربعہ یہ ہیں۔

مغرب

بحیرۂ قلزم۔

مشرق

خلیج فارس اور بحرِعمان۔

جنوب

بحرِہند۔

شمال

کی حدود بہت مختلف فیہ ہیں، بعض مملکت حلب اور فرات تک اس کی حدود کو وسعت دیتے ہیں۔

سینا کا جزیرہ نما، جس کا نام التیہ ہے، اکثر مصنفین عرب اور یورپ اس کو مصر میں شمار کرتے ہیں، لیکن جیالوجی کی رو سے وہ عرب سے متعلق ہے۔

عرب کی پیمائش باقاعدہ اب تک نہیں ہوئی، تاہم اس قدر یقینی ہے کہ وہ جرمن اور فرانس سے چوگنا زیادہ وسیع ہے، طول تقریباً پندرہ سو، عرض چھ سو میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ میل مربع ہے۔

---

[1] معجم البلدان، ج٦، لفظ عربة وعربات، ص: ١٣٧ تا ١٤٠، مصر: ١٣٢٤ھ/١٩٠٦ء۔

ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے، پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے، سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ جبل السَّراۃ ہے، جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے، اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فٹ بلند ہے، بعض حصے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔

چاندی اور سونے کی کانیں کثرت سے ہیں، علامہ ہمدانی نے ''صفة جزيرة العرب'' میں ایک ایک کان کا نشان دیا ہے، قریش جو تجارت کیا کرتے تھے، مؤرخین نے لکھا ہے، زیادہ تر ان کا مال تجارت، چاندی ہوتی تھی، برٹن صاحب نے مدین کی طلائی معادن پر خاص ایک کتاب لکھی ہے۔ [1]

قدیم تاریخ کے ماخذ

اسلام سے قبل عرب کی تاریخ کے ماخذ حسب ذیل ہیں:

① زمانہ جاہلیت کی بعض تصنیفات، جو سلاطین حیرۃ کے کتب خانہ میں محفوظ تھیں اور جو ابن ہشام کو ہاتھ آئی تھیں اور جن کا ذکر علامہ موصوف نے کتاب التیجان میں کیا ہے۔

② زبانی روایتیں جو قدیم سے چلی آتی تھیں، عرب کا حافظہ نہایت قوی تھا، یہاں تک کہ آج اشعار جاہلیت کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے، اسلام کے زمانہ تک زبانی ہی روایت ہوتا چلا آتا تھا، اس بنا پر عرب کی قدیم تاریخ کا کافی سرمایہ محفوظ تھا، عرب کی جو قومیں معدوم ہو چکیں، مثلاً: طسم، جدیس، عاد، ثمود، ان کے متعلق بھی اس قدر تاریخی روایتیں محفوظ تھیں کہ ان کے ذریعہ سے مؤرخین اسلام، عرب کی تاریخ قدیم پر، معتدبہ تصنیفات مرتب کر سکے، مثلاً: ہشام کلبی نے طسم، جدیس، تبابعۂ یمن اور دیگر سلاطین عرب پر متعدد کتابیں لکھیں، جن کا ذکر ابن الندیم نے فہرست صفحہ ۹۶ میں کیا ہے۔

③ اشعار جاہلیت، جن میں سے اکثر سلاطین اور اقوام اور عماراتِ عرب کا ذکر ہے، یہ اشعار صفۃ جزیرۃ العرب اور معجم البلدان میں کثرت سے موجود ہیں، انہی قدیم ماخذوں سے علامہ ہمدانی نے اپنی کتاب ''اکلیل'' [2] مرتب کی ہے، جس کا آٹھواں باب خاص سلاطین حمیر کے آثارِ قدیمہ اور حمیری کتبات پر مشتمل ہے۔

④ یورپ کی قدیم تصنیفات، مثلاً مصنفین یونان نے تھیوفراسٹس (جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چار سو برس قبل تھا) سے لے کر بطلیموس تک بہت سے قبائل عرب کے نام لکھے ہیں اور ان کی آبادیوں کے نام بھی بتائے ہیں، رومن مؤرخ پلینی نے بھی عرب کے متعلق لکھا ہے، گو نہایت مختصر ہے۔

⑤ عرب کی قدیم ویران شدہ عمارتوں کے کتبات، جو قدمائے اسلام نے دریافت کئے تھے اور جو آجکل یورپ نے نہایت کثرت سے مہیا کئے ہیں۔

---

[1] Gold Mines Of Medion.

[2] اس کتاب کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ طبقات الامم (مطبوعہ بیروت: ۱۹۱۲ء) میں ہے۔ (دیکھئے ص: ۱۸، ۴۲، ۵۸)

عرب کے اقوام وقبائل

مؤرخین عرب ❶ نے اقوام وقبائل عرب کو تین حصوں پر منقسم کیا ہے۔

عرب بائدہ

یعنی عرب کے قدیم ترین قبائل جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے۔

عرب عاربہ

بنوقحطان جو عرب بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے اور جن کا اصل مسکن ملک یمن تھا۔

عرب مستعربہ

بنواسماعیل یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد جو حجاز میں آباد تھی۔

ظہور اسلام کے وقت بنوقحطان اور بنو اسماعیل جن کو عدنانی قبائل بھی کہتے ہیں، ملک کے اصلی باشندے تھے اور ان کے علاوہ خال خال یہودیوں کی آبادی تھی، اس بنا پر درحقیقت ملک عرب اس وقت تین مختلف عناصر سے مرکب تھا، ہر عنصر کا قوام بے شمار قبائل وفروع سے تھا، جو یمن سے شام تک ہر قطعہ زمین میں پھیلے ہوئے تھے، ان کی پھر مختلف چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں، چونکہ اس کتاب میں اکثر ان کے نام آئیں گے، اس بنا پر ان کا ایک مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

بنوقحطان

اس خاندان کی تین بڑی شاخیں ہیں:

① قضاعہ ② کہلان ③ ازد، حمیر بھی اسی کی شاخ ہے، جو یمن کے فرمانروا تھے، لیکن واقعات کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔

① قبائل قضاعہ، عام علمائے انساب قضاعہ کو بنوقحطان میں داخل کرتے ہیں اور ہم بھی یہاں ان کی پیروی کرتے ہیں، ورنہ از روئے تحقیق وہ بنواسماعیل ہیں، بہر حال ان کی حسب ذیل شاخیں ہیں۔:

بنوکلب، بنوتنوخ، بنوجرم، بنوجہینہ، بنونہد، بنوعذرہ، بنواسلم، بلی، تیح، ضجعم، تغلب، نمر، اسد، تیم اللات، کلب

② کہلان

بجیلہ، خثعم، ہمدان، کندہ، مذحج، طے، لخم، جذام، عاملہ۔

③ ازد، انصار اسی کی شاخ تھے۔

اوس، خزرج، خزاعہ، غسان، دوس۔

مشہور عدنانی قبائل جن کا آخری مقسم مضر ہے، حسب ذیل ہیں: قبائل مضر اولاً بنی خندف اور بنوقیس دو

---

❶ یہاں سے ''عرب کی قدیم حکومتیں'' سے پہلے تک زیادت ہے (س)

خاندانوں پر منقسم ہیں۔

① **خندف:** ہذیل، کنانہ، اسد، ضبہ، مزینہ، رباب، تیم، ہون۔

ان میں سے ہر ایک کے متعدد فروع ہیں۔

اصول	فروع۔
کنانہ	قریش، دول۔
ہون	قارہ۔
رباب	عدی، تیم، عکل، ثور۔
تمیم	مقاعس، قریع، بہدلہ، یربوع، ریاح، ثعلبہ، کلیب۔

② **قیس:** عدوان، غطفان، اعصر، سلیم، ہوازن۔

اصول	ان میں بعض کے فروع یہ ہیں۔
غطفان	عبس، ذبیان، فزارہ، مرہ۔
اعصر	غنی، باہلہ۔
ہوازن	سعد، نصر، جیثم، ثقیف، سلول، بنو عامر (عامر کی شاخیں بنو ہلال، بنو نمیر، بنو کعب ہیں)۔

یہود

بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ

بنو قحطان و آلِ اسماعیل نے اسلام سے پہلے متعدد حکومتیں قائم کی تھیں، جن کے جستہ جستہ واقعات کہیں ملتے ہیں۔

عرب کی قدیم حکومتیں

کتبوں اور دیگر مؤرخین کی تصریحوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گزریں۔

① معینی — معین یمن میں ایک مقام کا نام ہے جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔

② سبائی — یعنی قوم سبا

③ حضرموتی — حضرموت، یمن کا مشہور مقام ہے۔

④ قتبانی — قتبان، عدن میں ایک مقام ہے جو آج کل گمنام ہے۔

⑤ نابتی — حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام نابت تھا۔ یہ سلسلہ انہی کی طرف منسوب ہے۔

معینی سلطنت، جنوبی عربستان میں تھی، اس کے صدر مقامات قرن اور معین تھے، کتبوں سے تقریباً پچیس

حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے، محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم زمان تھیں یا متقدم ومتاخر گلازر کا خیال ہے کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی، لیکن مولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیح سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بنا پر سبائی اور معینی دونوں ہم عصر ہیں۔

سبائی دور، جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سات سو برس قبل ہے، اس سلطنت کا پایہ تخت مآرب تھا، اس زمانہ کے سنگی کتبے بہ کثرت موجود ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک سو پندرہ برس قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے، اس دور کے بعد حمیر کا زمانہ ہے، حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اس کو پایہ تخت بنالیا۔

قریباً ۱۱۵ قبل مسیح میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کرلیا، کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیر میں چھبیس فرمان روا گزرے، حمیر کے بعض کتبوں میں سنہ وسال بھی کندہ ہے، ان کے عہد حکومت میں، رومی سلطنت نے عرب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ کوشش پہلی بھی تھی اور آخری بھی، اے لیس گالس، جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ۱۸ برس قبل، عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکامیاب رہا، اس کے رہبر دغا بازی سے اس کو صحرا میں لے گئے اور ریگستان میں پہنچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہوگیا۔ [1]

حمیر نے یہودی مذہب قبول کرلیا تھا، اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنی شروع کی اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کرلی، اس عہد کا ایک کتبہ جو آجکل ہاتھ آیا ہے، اس پر یہ الفاظ ہیں:

> ''رحمان، مسیح اور روح القدس کی قدرت وفضل ورحمت سے اس یادگاری پتھر پر ابرہہ نے کتبہ لکھا جو کہ بادشاہ حبش ارامیس ذی مان کا نائب الحکومۃ ہے۔''

سبا اور حمیر کی عظمت اور اقتدار اور وسعت فتوحات کی روایتیں، عرب میں اس قدر متواتر ہیں کہ ان کے قدر مشترک سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اشعار میں بھی کثرت سے واقعات مذکور ہیں۔ عربوں کے خیال کے موافق سلاطین حمیر نے ایران کے انتہائی مقامات فتح کر لئے تھے، ذوالقرنین جس کو عوام سکندر کہتے ہیں، اہل عرب کے نزدیک اسی حمیری خاندان کا فرماں روا تھا۔ شاہ نامہ میں مذکور ہے، کہ کیکاؤس کو شاہ ہاماوران نے گرفتار کرلیا تھا، علامہ ثعلبی نے تاریخ ایران میں (جواب یورپ میں چھپ کر شائع ہوگئی ہے) لکھا ہے کہ یہ ہاماوران، حمیر کا بادشاہ تھا اور ہاماوران دراصل وہی عربی حمیر ہے، علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودابہ جو کیکاؤس کی زوجہ تھی اور فردوسی کے بیان کے موافق، سیاؤش پر عاشق ہوگئی تھی اسی حمیری بادشاہ کی بیٹی تھی اور اس کا اصلی نام سعدیٰ تھا، ایرانیوں نے اپنے تلفظ میں اس کو سودابہ کرلیا تھا۔

یورپ کی تحقیقات حال سے بھی سبا اور حمیر کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کا ثبوت ملتا ہے، پروفیسر نولدیکی جرمنی کا مشہور مستشرق لکھتا ہے:

---

[1] یہ تمام تفصیل انسائیکلو پیڈیا کے اس آرٹیکل سے ماخوذ ہے جو جی ڈبلو تھیا چر صاحب نے عرب پر لکھا ہے، نیز لٹریری ہسٹری آف دی عربس مؤلفہ رینالڈ نکلسن پروفیسر کیمبرج صفحہ ۴ تا ۲۴۔

”ولادت مسیح سے ہزار سال قبل، جنوبی و غربی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا اور جو اپنی بارشِ گرما کے باعث زراعت کے لئے نہایت موزوں تھا، تمدن کے اس رتبہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذباتِ مدح و ستائش کو تحریک ہوتی ہے اور اہل یونان و روم نے اس کو ”دولت مند عرب“ کا جو لقب دیا تھا وہ بیجا نہ تھا۔۔۔۔۔۔تورات میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں، چنانچہ ملکہ سبا کا سلیمان علیہ السلام سے ملاقات کا قصہ خاص طرح پر قابل ذکر ہے۔ (ا۔سلاطین۔۱۰ آیت ۱ تا ۱۰)

قوم ثمود، جن کی عمارات سے ڈاوٹی اور یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے، نیز قوم نابت نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے، اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً انہی سے حاصل کی ہے۔ کتابت کا فن، جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال سے لیا تھا، اب اس کو خود انہوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا یہاں تک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری جانب ابی سینیا تک اس کو پھیلا دیا۔“ [1]

نابتی حکومت، جو شام کے حدود سے متصل تھی اور جو قوم ثمود کی مرادف، یا ان کی قائم مقام تھی، اس کی نسبت فارسٹر صاحب اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں:

> ”ان مختصر بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ زمانہ قدیم میں نابت کا نام اور اثر نہ صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مستولی تھا، بلکہ حجاز و نجد کے صوبہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا۔ نابتی جہاں ایک طرف منافع تجارت سے بہرہ اندوز ہونے میں کمال رکھتے تھے، وہاں دوسری طرف بطور سچے بنو اسماعیل کے خطرات جنگ کے لئے بالکل مستعد رہتے تھے، فلسطین و شام میں ان کی غارتگریوں اور خلیج عرب میں مصری جہازات پر ان کی رہزنی نے بارہا تاجداران مقدونیہ کو ان کی دشمنی پر آمادہ کر دیا لیکن روما کی مجموعی قوت سے پیشتر کوئی شے انہیں روک نہ سکی اور روما کی اطاعت بھی انہوں نے اسٹرابو کے زمانہ میں بالکل مجبورانہ اور مشتبہ انداز سے قبول کی۔“ [2]

یہ قدیم سلطنتوں کا حال تھا، اسلام کے قبل یہ تمام سلطنتیں برباد ہو چکی تھیں، ان کے بجائے یمن میں صرف بڑے بڑے سردار رہ گئے تھے، جن کو قَیل، یا مقول کہتے تھے، عراق میں آل منذر کا خاندان قائم تھا، جو فارس کے زیر اثر تھے، خورنق اور سدیر عرب کی مشہور عمارتیں اسی سلسلہ کی یادگار ہیں، شام کے حدود میں غسانی خاندان فرمانروا تھا، جو قیصرانِ روم کا ماتحت تھا اور جس کا اخیر فرمان روا، جبلہ بن الایہم غسانی تھا۔

تہذیب و تمدن

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے۔ مانسیو لیبان [3]

---

[1] مؤرخین کی تاریخ عالم جلد ۸۔ یعنی ہسٹورینس ہسٹری آف ورلڈ، تمہیدی آرٹیکل نوشتہ پروفیسر نولدیکی صفحہ ۵۔

[2] تاریخی جغرافیہ عرب از ریورنڈ فارسٹر جلد اول از صفحہ: ۲۲۰ تا ۲۲۸۔ [3] تمدن عرب (کتاب اول، باب و فصل سوم، ص: ۸۳ تا ۸۸)۔

فرنساوی نے اصولِ عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوج کمال تک پہنچ چکا تھا، کیونکہ اصول ارتقا کی رو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعتاً اعلیٰ درجہ کی تہذیب و تمدن تک نہیں پہنچ سکتی۔

یہ ایک قیاسی استدلال ہے، تاریخ سے بھی اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے بعض حصے، مثلاً: یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے، یورپ کے محققینِ آثارقدیمہ، جنہوں نے یمن کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کی ہے اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے، وہ یمن کی قدیم تہذیب وتمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔

صنعاء اور قلیس کے ذکر میں، یاقوت حموی نے معجم میں قدیم آثاراتِ عجیبہ کا تذکرہ کیا ہے اور گو اس میں بہت کچھ مبالغہ بھی ہے، تاہم اصلیت کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔

اسی طرح عرب کے وہ مقامات، جو ایران اور شام سے متصل تھے، مثلاً: حیرہ جو آل نعمان کا پایۂ تخت تھا اور حوران جو خاندان غسان کا صدر مقام تھا، تہذیب وتمدن سے خالی نہ تھے۔

مؤرخین عرب کا دعویٰ ہے کہ یمن نے ایک زمانہ میں اس حد تک ترقی کی تھی کہ وہاں کے سلاطین نے تمام ایران فتح کر لیا تھا، چنانچہ سمرقند کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ یمن کا ایک بادشاہ جس کا نام شمر تھا، اس نے سمرقند کو کھدوا کر برباد کر دیا تھا، اس بنا پر ایرانی اس مقام کو شمر کند کہنے لگے، پھر معرب ہو کر سمرقند ہو گیا۔

عظیم الشان قلعوں اور عمارتوں کے آثار، جو اب بھی کچھ کچھ باقی ہیں، اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ اس ملک میں کبھی اعلیٰ درجہ کا تمدن موجود تھا، علامہ ہمدانی نے اکلیل میں تمام آثارقدیمہ کا ذکر کیا ہے، چنانچہ صفۃ جزیرۃ العرب [1] میں لکھتے ہیں:

> المشهور من محافد اليمن وقصورها القديمة التي ذكرتها العرب في الشعر والمثل .... كثيرة الذي فيها من الشعر باب واسع وقد جمع ذلك كله الكتاب الثامن من الاكليل ـ
>
> ”یمن کے مشہور، قدیم قصر اور ایوان جن کا ذکر، اہل عرب نے اشعار اور امثال میں کیا ہے۔۔۔۔۔ کثرت سے ہیں اور ان کے متعلق اشعار کا ایک دفتر ہے، اکلیل کے آٹھویں باب نے ان سب کو جمع کر دیا ہے۔“

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ میں اس موقع پر صرف ان کے نام گنا دیتا ہوں اور وہ یہ ہیں:

> ”غمدان، تلفم، ناعط، صِرواح، سلحين، ظفار، هكر، ضهر، شبام، غيمان، بينون، ريام، براقش، معين، روثان، ارياب، هند، هنيده، عمران، نجير۔“

[1] صفة جزيرة العرب، (ج ا، ص: ۲۰۳) (س)

ان میں سے غمدان اور ناعط کا حال، معجم البلدان میں تفصیل سے مذکور ہے اور اس کی عظمت و رفعت کے متعلق ایسی باتیں نقل کی ہیں جن پر ایشیائی مبالغہ کا دھوکا ہوتا ہے، سلحسین کی نسبت لکھا ہے کہ ستر برس میں تعمیر ہوا، ❶ شبام کے حال میں لکھا ہے:

لھم فیہ حصون عجیبۃ ھائلۃ۔ ❷

''ان میں ان کے متعدد ہیبت انگیز قلعے ہیں۔''

قلعۂ ناعط، وہب بن منبہ کے زمانہ تک موجود تھا، اس کے ایک کتبہ کو محدث موصوف نے پڑھا، تو معلوم ہوا کہ سولہ سو برس کی تعمیر ہے، آجکل یورپ کے محققین نے ان مقامات میں جا کر جو تحقیقات کی ہیں اس سے بھی حیرت انگیز تمدن کی تصدیق ہوتی ہے، تھیاچر صاحب اپنے آرٹیکل میں لکھتے ہیں: ❸

''جنوبی عربستان میں، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صدیوں پہلے، ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا۔ قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار اب تک موجود ہیں اور ان کا ذکر متعدد سیاحوں نے کیا ہے..... یمن اور حضر موت میں، یہ آثار کثرت سے ہیں اور اکثر پر اب تک کتبے موجود ہیں..... صنعاء کے قریب ایک قلعہ تھا جس کو قزوینی نے آثار البلاد میں دنیا کے عجائب ہفت گانہ میں سے ایک قرار دیا ہے۔ (دیگر قلعوں کے لئے دیکھو جنرل جرمن اورینٹل سوسائٹی جلد ۱۰ صفحہ ۲۰ سے آگے)

مآرب جو قدیم سبائی دار السلطنت تھا، اس کے آثار قدیمہ کو ارنو، ہالیوے اور گلازر نے دیکھا ہے۔

''مآرب کے مشہور آثار میں سے ایک بڑی خندق کے آثار باقی ہیں، ان کو دیکھ کر عدن کے دوبارہ تعمیر شدہ حوض یاد آتے ہیں، ان کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی جب گلازر نے وہ دو طویل الذیل کتبے شائع کئے جن میں ان کے عیسوی قرن پنجم و ششم میں دوبارہ تعمیر کا ذکر ہے، یمن میں بمقام حران ایک اور خندق ہے جس کا طول تقریباً چار سو پچاس فٹ ہے''۔

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب و تمدن کی یہ حالت نہ تھی، عربی زبان نہایت وسیع ہے، باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے، ان کے لئے خاص عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے، بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں، سکہ کے لئے ایک لفظ بھی موجود نہیں، درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں۔ درہم یونانی لفظ درخم ہے۔ اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا ہے، چراغ معمولی چیز ہے، تاہم اس کے لئے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا، چراغ کو لے کر سراج کر لیا، پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا، مصباح، یعنی ایک آلہ جس سے صبح بنالی جاتی ہے، کوزہ کے لئے کوئی لفظ نہیں، کوزہ کو کوز کر لیا ہے،

❶ ج ۵، ص: ۱۰۵۔ ❷ ایضاً، ص: ۲۲۶۔ ❸ دیکھو انسائیکلو پیڈیا مضمون ''عرب''۔

لوٹے کو ابریق کہتے ہیں، جو آب ریز کا معرب ہے، تشت فارسی لفظ تھا، اسی کو عربی میں طست کر لیا ہے، پیالہ کو کاس کہتے ہیں، وہی کاسہ، فارسی لفظ ہے، کرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں، یہ بھی فارسی ہے، پاجامہ کو سروال کہتے ہیں، جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لفظ نہ تھے تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لئے کہاں سے لفظ آتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی آس پاس کے ممالک کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر کی تھی، اس لئے جو مقامات ان ممالک سے دور تھے، اسی اصلی حالت پر رہ گئے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے، مسئلہ حجاب کے شان نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور [1] نہ تھی، مستورات رفع حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں، [2] ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا، وہی آٹا ہوتا تھا، [3] بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، [4] ابو داؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کی صحبت میں تھا لیکن میں نے آپ سے حشرات الارض [5] کا حرام ہونا نہیں سنا، [6] اگرچہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں آنحضرت ﷺ نے حشرات الارض کی حرمت نہیں بیان کی، لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے، تاریخ اور ادب کی کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ عرب کن کھجورا، گوہ، گرگٹ، سہی اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔

عرب کے مذاہب

عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب تھے، بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے زمانہ یا فطرت (قانون قدرت) ہے، خدا کوئی چیز نہیں، انہی لوگوں کی نسبت قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ﴾ (٤٥/ الجاثية: ٢٤)

''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو مارتا ہے تو زمانہ مارتا ہے۔''

بعض خدا کے قائل تھے، لیکن قیامت اور جزا و سزا کے منکر تھے، ان کے مقابلہ میں قرآن مجید نے قیامت کے ثبوت پر اس طرح استدلال کیا ہے:

[1] بیت الخلاء، لیٹرین۔ [2] بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة نور: ٤٧٥٠۔ [3] ترمذي، ابواب الزهد، باب ما جاء فى معيشة النبي ﷺ واهله: ٢٣٦٤۔ [4] بخاري، كتاب الصلاة، باب الصلاة على الفراش: ٣٨٢۔

[5] حشرات الارض کیڑے مکوڑے کو کہتے ہیں۔ [6] ابو داود، كتاب الاطعمة، باب فى اكل حشرات الارض: ٣٧٩٨۔

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ﴾ (۳۶/ یٰس: ۷۹)

''کہہ دو کہ (ہڈیوں کو) وہی دوبارہ زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔''

بعض خدا اور جزا و سزا کے بھی قائل تھے، لیکن نبوت کے منکر تھے، ان کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ۙ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۷)

''اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھاتا پیتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے۔''

﴿قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۹۴)

''کہتے ہیں کہ خدا نے آدمی پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔''

ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے تو اس کو فرشتہ ہونا چاہیے، جو حاجات انسانی سے منزہ ہو۔ لیکن عموماً لوگ بت پرست تھے، وہ بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ خدا تک پہنچنے کے وسیلے ہیں۔ ❶

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ۖ﴾ (۳۹/ الزمر: ۳)

''ہم ان بتوں کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔''

قبیلہ حمیر جو یمن میں رہتا تھا آفتاب پرست تھا، کنانہ چاند کو پوجتے تھے، قبیلہ بنی تمیم، دبران کی عبادت کرتا تھا، اسی طرح قیس، شعریٰ کی، قبیلہ اسد، عطارد کی اور لخم و جذام، مشتری کی پرستش کرتے تھے۔ ❷

مشہور بتوں اور ان کے پوجنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں: ❸

نام بت	مقام	قبیلہ جو اس بت کو پوجتا تھا۔
لات	طائف	ثقیف
عزّیٰ	مکہ معظّمہ	قریش و کنانہ
منات	مدینہ منورہ	اوس، خزرج اور غسان
ود	دومۃ الجندل	کلب
سواع		ہذیل
یغوث		مذحج اور قبائل یمن
یعوق		ہمدان

سب سے بڑا بت ہبل تھا، جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا، قریش لڑائیوں میں اس کی جے پکارتے تھے۔

---

❶ یہ تمام تفصیل ''ملل نحل''، شہرستانی، مذاہب عرب کے ذکر میں ہے (برحاشیہ الفصل فی الملل والنحل ابن حزم باب آراء العرب فی الجاھلیۃ، ج ۳، ص: ۲۲۰) ❷ طبقات الامم لابن صاعد الاندلسی مطبوعہ بیروت: ۱۹۱۲ء، ص: ۴۳۔ ❸ بتوں کی تفصیل ''ملل نحل'' میں ہے۔ (ج ۳ ص: ۲۲۲ برحاشیہ ملل نحل ابن حزم)۔

عرب میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحی تھا، اس کا اصلی نام ربیعہ بن حارثہ تھا، عرب کا مشہور قبیلہ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے، عمرو سے پہلے جرہم کعبہ کے متولی تھے، عمرو نے لڑ کر جرہم کو مکہ سے نکال دیا اور خود حرم کا متولی ہو گیا، وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا، وہاں کے لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو پوچھا کہ ان کو کیوں پوجتے ہو، انہوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں، قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں، عمرو نے چند بت ان سے لے لئے اور لا کر کعبہ کے آس پاس قائم کئے، کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا، اس لئے تمام قبائل میں بت پرستی کا رواج ہو گیا، ان میں سب سے قدیم بت مناۃ تھا۔ یہ سمندر کے کنارے قدید کے قریب نصب تھا، اوس اور خزرج یعنی مدینہ کے لوگ اسی پر قربانی چڑھاتے تھے اور جب کعبہ کا حج کر کے آتے تھے، تو احرام یہیں اتارتے تھے، ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش کرتے تھے۔ [1]

یاقوت حموی نے معجم البلدان (ذکر مکہ) میں لکھا ہے کہ عرب میں بت پرستی کی عام اشاعت کی وجہ یہ ہوئی کہ قبائل عرب جو تمام اطراف سے حج کو آتے تھے واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو اٹھا لیتے تھے اور ان کو اصنام کعبہ کی صورت پر تراش کر ان کی عبادت کرتے تھے۔

اللہ کا اعتقاد

عرب، گو قریباً سب کے سب بت پرست تھے، لیکن اس کے ساتھ یہ اعتقاد ان کے دل سے کبھی نہیں گیا کہ اصلی خدائے برتر اور چیز ہے اور وہی تمام عالم کا خالق ہے، اس خالق اکبر کو وہ ''اللہ'' کہتے تھے، قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۶۱)

''اور اگر ان لوگوں (کافروں) سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کو کس نے تابعدار بنا رکھا ہے تو بول اٹھیں گے کہ اللہ، پھر کدھر بہکے جا رہے ہیں۔''

﴿ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۶۵)

''پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا ہی کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، پھر جب خدا، ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں۔''

قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے جس حقیقت کا اظہار کیا، آج تحقیقات آثار قدیمہ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے، مذاہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا [2] میں مشہور مستشرق نولدیکی کا جو قول نقل کیا ہے اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں:

''اللہ'' جو صفا کے کتبوں میں ''ھلہ'' لکھا ہوا ہے، نباتی اور دیگر قدیم باشندگان عرب شمالی کے

---

[1] یہ تمام تفصیل معجم البلدان ذکر منات میں ہے (دیکھئے، ج ۸ ص: ۱۶۷، ۱۶۸)۔ [2] ج ۱ ص: ۶۶۴۔

نام کا ایک جز و تھا، مثلاً ''زید اللہی ۔۔۔۔۔'' نباتی کتبات میں اللہ کا نام بطور ایک علیحدہ معبود کے نہیں ملتا۔ لیکن صفا کے کتبات میں ملتا ہے، متأخرین مشرکین میں اللہ کا نام نہایت عام ہے، ولہاسن نے عرب قدیم کے لٹریچر میں بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں جن میں اللہ کا لفظ بطور ایک معبود اعظم کے مستعمل ہوا ہے، نباتی کتبات میں ہم بار بار کسی دیوتا کا نام پاتے ہیں جس کے ساتھ اللہ کا لقب شامل ہے، اس سے ولہاسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا لقب جو پہلے مختلف معبودوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، رفتہ رفتہ زمانہ مابعد میں صرف ایک عظیم ترین معبود کے لئے بطور علم کے مخصوص ہو گیا۔''

نصرانیت اور یہودیت اور مجوسیت

اگر چہ زمانہ اور مدت کا تعین مشکل ہے لیکن یہ تینوں مذہب ایک مدت دراز سے عرب میں رائج ہو چکے تھے، علامہ ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے، کہ قبائل ربیعہ وغسان نصرانی تھے، قضاعہ میں بھی اس مذہب کا اثر پایا جاتا تھا، نصرانیت کو اس قدر ترقی ہو چکی تھی کہ خود مکہ معظمہ میں ایسے لوگ موجود تھے (مثلاً ورقہ بن نوفل) جو عبرانی زبان میں انجیل کو پڑھ سکتے تھے، متعدد ایسے لوگ تھے جنہوں نے شام میں جا کر تعلیم پائی تھی۔

حمیر، بنو کنانہ، بنوحرث بن کعب، کندہ، یہ قبائل یہودی تھے، مدینہ منورہ میں یہود نے پورا غلبہ پا لیا تھا اور تورات کی تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں قائم تھیں، جن کو بیت المدارس کہتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اسی نام سے ان کا ذکر آتا ہے، قلعہ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی، امراء القیس کا ہم عصر مشہور شاعر سموئیل بن عادیا جس کی وفاداری آج تک عرب میں ضرب المثل ہے، یہودی تھا۔

اہل کتاب کی روایتیں، مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرت ﷺ پر جب قرآن نازل ہوتا تھا اور اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے تو کفار بدگمانی کرتے تھے کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ کو سکھاتا ہے، خود قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ﴾ (۱۶/ النحل :۱۰۳)

''اور ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کو کوئی آدمی سکھاتا ہے۔''

قرآن مجید میں اس خیال کا ابطال بھی کر دیا ہے، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

قبیلہ تمیم مجوسی تھا، زرارہ تمیمی نے، جو اس قبیلہ کا رئیس تھا، اسی بنا پر اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی، گو اس پر اس کو ندامت ہوئی، اقرع بن حابس بھی مجوسی تھا۔ [1]

مذہب حنیفی

دین ابراہیمی کا ام الاصول توحید خالص تھی، زمانہ کے امتداد اور جہالت کے شیوع سے یہ اصول اگر چہ

[1] معارف ابن قتیبہ۔ (ادیان العرب فی الجاهلية، ص: ۲۶۶ المطبعة الاسلامية، مصر:۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء)۔

شرک آلود ہو گیا تھا، یہاں تک کہ خود خانہ خدا میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، تاہم بالکل فنا نہیں ہو سکتا تھا، عرب میں کہیں کہیں اس کا دھندلا سا نشان نظر آتا تھا، جو لوگ صاحب بصیرت تھے ان کو یہ منظر نہایت نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا، کہ انسان عاقل، جماد لایعقل کے سامنے سر جھکائے، اس بنا پر بت پرستی کی برائی کا خیال بہتوں کے دل میں آیا، لیکن اس کا تاریخی زمانہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے، ابن اسحاق [1] نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی بت کے سالانہ میلہ میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نُفیل شریک تھے، ان لوگوں کے دل میں دفعتہً یہ خیال آیا کہ یہ کیا بیہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے، نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ چاروں قریش کے خاندان سے تھے، ورقہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادر عم زاد تھے، زید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا تھے، عبداللہ بن جحش حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بھانجے تھے، عثمان عبدالعزیٰ کے پوتے تھے۔

زید، دین ابراہیمی کی تلاش میں شام گئے، وہاں یہودی اور عیسائی پادریوں سے ملے، لیکن کسی سے تسلی نہیں ہوئی، اس لئے اس اجمالی اعتقاد پر اکتفا کیا کہ ''میں ابراہیم علیہ السلام کا مذہب قبول کرتا ہوں۔'' صحیح بخاری میں (باب بنیان الکعبہ سے پہلے) حضرت اسماء رضی اللہ عنہا (دختر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ ''میں نے زید کو اس حالت میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے لوگوں سے کہتے تھے، اے اہل قریش! تم میں سے کوئی شخص بجز میرے ابراہیم علیہ السلام کے دین پر نہیں ہے''۔ [2]

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، زید ہی پہلے شخص ہیں جس نے اس رسم کی ممانعت کی، جب کوئی شخص ایسا ارادہ کرتا تو وہ جا کر اس لڑکی کو مانگ لیتے اور خود اس کی پرورش کرتے۔ [3]

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے پہلے زید کو دیکھا تھا اور ان سے صحبت رہی تھی، [4] ورقہ اور عبداللہ بن جحش اور عثمان بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے۔

اسی زمانہ کے قریب امیہ بن ابی صلت نے جو طائف کا رئیس اور مشہور شاعر تھا، بت پرستی کی مخالفت کی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اصابہ میں زبیر بن بکار کی سند سے لکھا ہے کہ امیہ نے زمانۂ جاہلیت میں آسمانی کتابیں پڑھی تھیں اور بت پرستی کو چھوڑ کر دین ابراہیمی اختیار کر لیا تھا۔

امیہ کا دیوان آج بھی موجود ہے، اگرچہ اس کا بڑا حصہ جعلی ہے تاہم اصلی کلام بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ وہ غزوۂ بدر تک زندہ رہا، عتبہ جو رئیس مکہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نانا تھا، امیہ کا ماموں زاد بھائی تھا، امیہ نے اس کے قتل ہونے کی خبر سنی تو اس کو سخت صدمہ ہوا اور نہایت پردرد مرثیہ لکھا، غالباً اسی کا اثر تھا کہ اسلام قبول نہ کر سکا۔

---

[1] سیرت ابن ھشام، مطبوعہ مصر، ج ۱، ص: ۷۶۔ [2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل: ۳۸۲۸۔ [3] ایضاً۔ [4] ایضاً: ۳۸۲۶۔

شمائل میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت ﷺ کے ہم ردیف تھے، انہوں نے امیہ کا ایک شعر پڑھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''اور'' انہوں نے سو شعر پڑھے، ہر شعر کے ختم ہونے پر آپ فرماتے جاتے تھے کہ ''اور'' اخیر میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''امیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا۔'' [1]

ابن ہشام نے بت پرستی کی مخالفت کرنے والوں میں انہی چاروں کا نام لکھا ہے، لیکن اور تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اور متعدد اہل نظر پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے بت پرستی سے توبہ کی تھی، ان میں سب سے زیادہ مشہور شخص، عرب کا نامور خطیب قیس بن ساعدہ الایادی ہے، اس کا تذکرہ آگے آتا ہے، ایک شخص قیس بن نشبہ تھا، جس کی نسبت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں خدا پرست ہو چکا تھا اور آنحضرت ﷺ کی بعثت پر مشرف بہ اسلام ہوا۔

یہ تحقیق نہیں کہ دین ابراہیمی کو دین حنیفی کیوں کہتے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن اس کے معنی میں اختلاف ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ ''چونکہ اس دین میں بت پرستی سے انحراف تھا، اس لئے اس کو حنیفی کہتے ہیں، کیونکہ حنف کے معنی انحراف کے ہیں، عبرانی اور سریانی [2] زبان میں حنیف کے معنی منافق اور کافر کے ہیں، ممکن ہے کہ بت پرستوں نے یہ لقب دیا ہو اور موحدین نے فخریہ قبول کر لیا ہو۔

یہ امر اکثر روایتوں سے ثابت ہے کہ عرب اور خصوصاً مکہ اور مدینہ میں متعدد اشخاص بت پرستی کے منکر ہو گئے تھے اور ملت ابراہیمی کی جستجو میں تھے، یہ اس لئے کہ مجدد ملت ابراہیمی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا تھا۔

ان چند راہ طلب اور حقیقت جو اشخاص کے وجود کی بنا پر مصنفین یورپ کہتے ہیں کہ مذہب صحیح اور توحید خالص کا رواج عام عرب میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن اگر یہ صحیح ہے تو یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اسلام کے ظہور پر اس قدر ہنگامہ کیوں برپا ہوا؟

کیا عرب میں ان مذاہب نے کچھ اصلاح کی؟

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عرب میں تمام مشہور مذاہب موجود تھے، یہودیت بھی، نصرانیت بھی، مجوسیت بھی، حنیفیت بھی اور عقلی بلند پروازی کی معراج الحادبھی، لیکن ان سب کا نتیجہ کیا تھا؟ عقائد کے لحاظ سے یا تو خداؤں کی وہ کثرت، جس کو نصرانیت نے بہت گھٹایا، تاہم تین کی تعداد سے کم نہ کر سکی، اس کے ساتھ یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود سولی پر چڑھ کر تمام بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ بن گئے، یا توحید تھی، لیکن خدا اس قسم کا تھا جو آدمیوں سے کشتی لڑتا تھا۔ [3]

بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے

---

[1] شمائل ترمذی، باب ماجاء فی صفة کلام رسول اللہ ﷺ فی الشعر: ۲۴۸۔ [2] یہ مارگولیوس کا بیان ہے۔

[3] تورات تکوین، باب ۳۲ آیت ۲۲ تا ۲۹ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے خدا سے کشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔

ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہ تھی، قمار بازی، شراب خوری، زنا کاری کا رواج عام تھا، بے حیائی کی یہ حالت تھی کہ سب سے بڑا نامور شاعر، امراء القیس، جو شہزادہ بھی تھا، قصیدہ میں اپنی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ، مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔

لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کے پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا، عموماً جائز تھا، عیسائیوں کے بیان کے مطابق عرب قبل اسلام، تمام مذاہب میں سب سے زیادہ عیسائیت سے متاثر تھا، تاہم اس اثر کا کیا نتیجہ تھا؟ اس کو خود عیسائی مؤرخین کی زبان سے سننا چاہیے! ایک عیسائی مؤرخ لکھتا ہے:

''عیسائیوں نے عرب کو پانچ سو برس، تعلیم وتلقین کی، اس پر بھی خال خال عیسائی نظر آتے تھے یعنی بنو حارث نجران میں، بنو حنیفہ یمامہ میں اور کچھ بنی طے میں عیسائی تھے، باقی خیریت...... بالآخر عرب کو من حیث المذہب دیکھئے تو اس کی سطح پر عیسائیوں کی ضعیف کوششوں کی کچھ خفیف سی موجیں لہراتی نظر آتی تھیں اور یہود کی قوت بھی کبھی بڑی شدت سے طغیانی کرتی نظر آتی تھی، لیکن بت پرستی اور بنو اسماعیل کے بے ہودہ اعتقادات کا دریا ہر سمت سے جوش مارتا ہوا کعبہ سے آ کر ٹکراتا تھا۔'' [1]

یہ حالت صرف عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی (اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصہ میں آئے گی)۔ کیا اس عام ظلمت، اس عالمگیر تیرگی اس وسیع اور ہمہ گیر تاریکی میں ایک آفتاب عالم تاب کی حاجت نہ تھی؟

---

[1] میور صاحب کی لائف آف محمد (ﷺ) جلد ۱، دیباچہ۔

سلسلۂ اسماعیلی

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مؤرخین عرب نے عرب کی تین قسمیں کی ہیں۔

عرب کی وہ قدیم قومیں جو بالکل برباد ہو گئیں، مثلاً: طسم وجدیس وغیرہ۔

خالص عرب جو قحطان کی اولاد ہیں، مثلاً: اہل یمن اور انصار (اور تیسرا سلسلۂ اسماعیلی)

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب مکہ میں آباد ہوئے، تو حوالی مکہ میں بنو جرہم آباد تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس خاندان میں شادی کی، [1] اس سے جو اولاد ہوئی وہ عرب مستعربہ کہلاتی ہے، اب عرب کا بڑا حصہ اسی خاندان سے ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ اور خود اسلام کی تاریخ تمام تر اسی اخیر سلسلہ سے وابستہ ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیل کے خاندان سے ہیں اور جو شریعت آنحضرت ﷺ کو عنایت ہوئی وہی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی، قرآن مجید میں ہے:

﴿ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۸)

''تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب، اسی [2] نے پہلے پہل تمہارا نام مسلم رکھا اور اس قرآن میں بھی۔''

لیکن یورپ کے بہت سے متعصب مؤرخ سرے سے ان حقائق کے منکر ہیں، یعنی نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام عرب میں آئے نہ انہوں نے کعبہ کی بنیاد ڈالی، نہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

چونکہ ان مباحث نے مذہبی تعصب کی صورت اختیار کر لی ہے، اس لئے یہ توقع مشکل ہے کہ ہم اس بحث کو اس طرح طے کر سکیں گے کہ استدلال کی بنیاد، یورپ کے مسلمات پر رکھی جائے۔

جو واقعات مختلف فیہ ہیں بہت ہیں، لیکن اصولی امور صرف دو ہیں، جن میں دونوں فریق کا کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتا، یہ اصول جس فریق کے موافق طے ہوں اس کے فرعی جزئیات بھی اسی کے موافق تسلیم کر لینے چاہئیں، اصول مذکورہ حسب ذیل ہیں:

① حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عرب میں آ کر آباد ہوئے یا نہیں؟

② حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربانی کرنا چاہا تھا، یا حضرت اسماعیل علیہ السلام کو؟

حضرت اسماعیل علیہ السلام کہاں آباد ہوئے؟

یہود مدعی ہیں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام ذبیح ہیں۔ اس بنا پر وہ قربانی گاہ کا موقع شام بتاتے ہیں۔ لیکن اگر

---

[1] صحيح بخاري، كتاب احاديث الانبياء: ٣٣٦٤۔

[2] اس کا مرجع بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا ہے اور بعض نے اللہ تعالیٰ کو اور یہی صحیح ہے جیسا کہ آیات سے صاف ظاہر ہے۔

یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام نہیں بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، تو قربانی گاہ کے موقع کی نسبت عرب ہی کی روایتیں تسلیم کرنی پڑیں گی اور اس حالت میں تاریخ کی تمام کڑیاں متصل ہو جائیں گی۔

تورات میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اولاد حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے ہوئی جس کا نام اسماعیل رکھا گیا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے، حضرت اسماعیل علیہ السلام جب بڑے ہوئے تو حضرت سارہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو ان واقعات کے بعد تورات کے خاص الفاظ یہ ہیں:

''تب ابراہیم علیہ السلام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ علیہا السلام کے کاندھے پر رکھا اور اس لڑکے کو بھی رخصت کیا، وہ روانہ ہوئی، بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دور جا کر بیٹھی کیونکہ اس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں، سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کر روئی، تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا، مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سنی، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر اپنی مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا اور تیر انداز ہو گیا اور وہ فاران کے بیابان میں رہا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت بیاہنے کو لی''۔ (تورات، سفر پیدائش باب ۲۱ آیت: ۱۴ تا ۲۱)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جب گھر سے نکالے گئے تو بالکل بچہ تھے، چنانچہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے مشک کو اور ان کو کاندھے پر اٹھایا، عربی تورات میں صاف یہ الفاظ ہیں:

واضعًا ایاھا علی کتفھا والولد۔

''حضرت ابراہیم نے مشک اور بچہ دونوں کو ہاجرہ کے کندھے پر رکھا۔''

لیکن تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۸۶ برس کی تھی [1] اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ختنہ کیا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر ۱۳ برس کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ننانوے برس کی تھی۔ [2]

---

[1] پیدائش، باب: ۱۶۔ ۱۲۔ [2] پیدائش۔ باب: ۱۷۔ ۲۴ و ۲۵۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گھر سے نکالے جانے کا واقعہ، ختنہ کے بعد کا ہوگا، اس لئے اس وقت قطعاً ان کی عمر ۱۳ برس سے زیادہ تھی اور اس سن کا لڑکا اتنا چھوٹا نہیں ہوتا کہ ماں اسے کندھے پر اٹھائے پھرے، اس واقعہ سے غرض یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو اور ان کی والدہ کو اصلی مقام سکونت سے کسی دور مقام پر لا کر آباد کر سکتے تھے۔

تورات کی عبارت مذکورہ میں تصریح ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام فاران میں رہے اور تیراندازی کرتے رہے، عیسائی کہتے ہیں کہ فاران اس صحرا کا نام ہے جو فلسطین کے جنوب میں واقع ہے، اس لئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا عرب میں آنا خلاف واقعہ ہے۔

جغرافیہ دانان عرب عموماً متفق ہیں کہ فاران، حجاز کے پہاڑ کا نام ہے، چنانچہ معجم البلدان میں صاف تصریح ہے، لیکن عیسائی مصنفین اس سے اتفاق نہیں کر سکتے، اس کا فیصلہ ایک بڑی طول طویل بحث پر مبنی ہے جو مباحثہ اور مناظرہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اس لئے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں، البتہ اس قدر بتانا ضروری ہے کہ عرب کی حد شمالی کسی زمانہ میں کس حد تک وسیع تھی۔

موسیو لیبان، تمدنِ عرب میں لکھتے ہیں:

''اس جزیرے کی حد شمالی اس قدر صاف اور آسان نہیں ہے، یعنی یہ حد اس طرح پر قائم ہوتی ہے کہ غزہ سے جو فلسطین کا ایک شہر اور بحر متوسط پر واقع ہے، ایک خط جنوب بحر لوط تک کھینچا جائے اور وہاں سے دمشق اور دمشق سے دریائے فرات تک اور دریائے فرات کے کنارے کنارے لا کر خلیج فارس میں ملا دیا جائے، پس اس خط کو عربستان کی حدِ شمالی کہہ سکتے ہیں۔''

اس بنا پر عرب کے حجازی حصہ کا فاران میں محسوب ہونا خلاف قیاس نہیں، تورات [1] میں جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جائے سکونت کا بیان ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں:

''اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے سور کو جاتے ہیں، بستے تھے''۔

اس تحدید میں مصر کے سامنے جو زمین پڑتی ہے وہ عرب ہی ہو سکتا ہے۔ نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں جس قدر اعتنا ہے، بنو اسرائیل کے ساتھ ہے۔ بنی اسماعیل کا ذکر محض ضمنی طور پر آ جاتا ہے اور اس وجہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا عرب میں آباد ہونا بہ تصریح نہیں ملتا۔ لیکن مختلف تلمیحات سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا عرب میں آباد ہونا ایک مسلمہ امر تھا۔ عہد جدید میں جس کو عیسائی وحی الٰہی سمجھتے ہیں پولوس کا ایک خط گلیتون کے نام ہے، اس میں یہ عبارت ہے: [2]

''ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی سے، دوسرا آزاد سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا جسم

[1] سفر تکوین، باب: ۲۵۔ آیت: ۱۸، ص: ۳۹ آکسفورڈ۔ [2] باب ۴۔ آیت: ۲۲ تا ۲۵، ص: ۳۰۹۔

کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا، سو وعدے کے طور پر، یہ بات تمثیلی بھی مانی جاتی ہے، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہے، یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم کا جواب ہے۔"

اگر چہ معلوم نہیں کہ اصلی عبارت کیا تھی۔ اردو اور عربی دونوں ترجمے ناصاف ہیں، تاہم اس قدر واضح ہیں کہ پولوس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سب سے بڑے جانشین ہیں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو عرب کا کوہ سینا کہتے تھے۔ اگر حضرت ہاجرہ علیہا السلام عرب میں آباد نہ ہوئی ہوتیں، تو ان کو عرب کا کوہِ سینا کہنا کیا معنی رکھتا ہے، آگے چل کر بکۃ کے ذکر میں، یہ بحث زیادہ مؤید ہو جائے گی۔

ذبیح کون ہے؟

تورات اگر چہ یہودیوں کی عدم احتیاط، اغراض ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سرتاپا مسخ ہو گئی ہے اور خصوصاً پیغمبر خاتم ﷺ کے متعلق اس میں جو تصریحات اور تلمیحات تھیں یہود کے دست تصرف نے ان کو بالکل برباد کر دیا ہے۔ تاہم حقائق کے عناصر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں، تورات میں گو تصریحاً حضرت اسحٰق علیہ السلام کا ذبیح ہونا لکھا ہے لیکن مطاویٔ کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں کہ وہ ہرگز ذبیح نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے، امور ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

① شریعت سابقہ کے رو سے قربانی صرف اس جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی جو پہلوٹا بچہ ہو، اسی بنا پر ہابیل نے جن مینڈھوں کی قربانی کی تھی وہ پہلو ٹے بچے تھے۔

خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جہاں لاویوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے، وہاں فرمایا ہے:

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبھائم (۸/ عدد:۱۷)

"کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ میرے لئے ہے۔"

② پہلو ٹے بچے کی افضلیت کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتی، تورات میں ہے کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں، ایک محبوبہ ہو اور دوسری غیر مرغوبہ، تو فضیلت اسی اولاد کو ہو گی جو پہلوٹی ہو، گو وہ غیر مرغوبہ سے ہو۔

فانه اول قدرته وله حق البكورية۔ (سفر تثنیه، اصحاح۔ ۲۱، آیت: ۱۷)

"کیونکہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے اور اسی کو اولاد اولین ہونے کا حق ہے۔"

③ جو اولاد خدا کو نذر کر دی جاتی تھی اس کو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا۔ تورات میں ہے:

فی ذلك الوقت افرز الرب سبط لاوی لیحملوا تابوت عهد الرب ولكی یقفوا امام الرب لیخدموه ویباركوا باسمه الی هذا الیوم لاجل ذلك لم یكن للاوی قسم ولا نصیب مع اخوته الرب هو نصیبه۔

(تورات، تثنیہ اصحاح ۱۰، آیت ۸، ۹)

''تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لئے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور، تا کہ خدا کے آگے کھڑا ہو، تا کہ وہ خدا کی خدمت کریں اور اس کے نام سے آج تک برکت لیں، یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں ملا، کیونکہ ان کا حصہ خدا ہے۔''

④ جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا تھا، وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا، جس طرح آج حج میں احرام کھولنے کے وقت بال منڈاتے ہیں، تورات میں ہے:

فها انك تحملين وتلدين ابنا ولا يعل موسیٰ رأسه لان الصبی يكون نذرًا لله۔

''اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی اور اس کے سر پر اُسترا نہ پھیرا جائے کیونکہ یہ بچہ خدا کے لئے نذر کیا جائے گا۔'' (تورات، قضاۃ، اصحاح ۱۳۔۴)

⑤ جو شخص خدا کا خادم بنایا جاتا تھا اس کے لئے ''خدا کے سامنے'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

(تورات سفر عدد ٦۔١٦ و ٢٠ و سفر تکوین۔ ٢٧۔٧، و تثنیه ١٠۔٨)

⑥ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ وہ بیٹا قربانی کیا جائے، جو اکلوتا ہو اور محبوب ہو۔ (تورات، تکوین، اصحاح ٢٢۔آیت ٢)

اب اصل مسئلہ پر غور کرو لیکن پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں قربانی کرنا اور خدا پر نذر چڑھانا، ایک بات تھی، یعنی دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کو فلاں معبد میں قربانی چڑھا دو، تو اس کے یہ معنی تھے کہ وہ اس معبد کی خدمت اور مجاورت کے لئے گھر سے الگ کر دیا جائے، لیکن یہ لفظ جب جانوروں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، تو حقیقی قربانی کے معنی مراد ہوتے تھے، تورات میں خدا کی زبان سے مذکور ہے:

لان لی كل بكر فی بنی اسرائيل من الناس والبهائم۔ (عدد، اصحاح:۸۔۱۷)

''کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹھا بچہ میرے لئے ہے۔''

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے کہ ''خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم بنی اسرائیل میں سے لاویوں کو لو اور ان کو خدا کے سامنے پیش کرو، کہ خدا کے لئے خاص کر دیے جائیں اور یہ لوگ دو گایوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں جو قربانی کی جائیں۔'' (اختصارًا)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس سے بھی یہی مراد تھی کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اس خواب کو عینی اور حقیقی سمجھا اور اس لئے بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی، لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ تمثیلی خواب تھا۔ اس بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے

کو خانہ خدا کی خدمت کے لئے خاص کر دیا اور جو شرطیں قربانی کی تھیں، قائم رکھیں۔

بیان مذکورہ بالا کے ذہن نشین کرنے کے بعد دلائل ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں:

① حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ہے، اس بنا پر حضرت اسحاق علیہ السلام اکلوتے بیٹے نہیں اور چونکہ قربانی کے لئے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے، اس لئے حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کا حکم نہیں ہوسکتا تھا۔

② حضرت اسحاق علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا تمام ترکہ دیا، بخلاف اس کے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو صرف پانی کی ایک مشک دے کر رخصت کیا، یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا۔

③ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈاتے تھے، حج میں احرام کے زمانہ تک جو بال نہیں منڈاتے، یہ اسی سنت اسماعیلی کی یادگار ہے۔

④ جو الفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لئے ملت ابراہیمی میں استعمال کئے جاتے تھے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے استعمال کئے، نہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے لئے، تورات میں ہے کہ جب خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

لیت اسمٰعیل یعیش امامك۔ (تکوین، باب:۱۷، آیت:۱۸)

''کاش اسماعیل تیرے سامنے زندہ رہتا۔''

تورات میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (سامنے زندہ رہنا) اسی معنوں میں ہوا ہے۔

⑤ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی محبوب ترین اولاد تھے، تورات جو تمام تر حضرت اسحاق علیہ السلام کی یک طرفہ داستان ہے، اس میں حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جو امتیازی خصائص بیان کئے ہیں، یہ ہیں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں [1] اور حضرت اسماعیل علیہ السلام دعوت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے [2] اسی بنا پر خدا نے ان کا نام اسماعیل رکھا، کیونکہ اسماعیل علیہ السلام دو لفظوں سے مرکب ہے، سمع اور ایل۔ ''سمع'' کے معنی ''سننے'' کے اور ''ایل'' کے معنی ''خدا'' کے ہیں [3] یعنی خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سن لی۔ تورات میں ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ''اسماعیل کے بارے میں، میں نے تیری سن لی۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خدا نے حضرت اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس موقع پر بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یاد کیا، غرض چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ محبوب ترین بیٹا ہو، اس

---

[1] تورات تکوین، ۱۷، ۱۹ اور ۲۱۔ [2] تکوین اصحاح، ۱۵، (۱۷۔۲۰)۔ [3] تکوین اصحاح، ۱۷، ۱۸۔

لئے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح ہو سکتے ہیں نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام۔

⑥ حضرت اسحاق علیہ السلام کی جب خدا نے بشارت دی تو ساتھ ہی یہ بھی بشارت دی کہ میں اس کی نسل سے ابدی عہد باندھوں گا، تورات میں ہے:

"پھر خدا نے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لئے ایک بیٹا جنے گی اور تو اس کا نام اسحاق رکھے گا اور میں ابدی عہد اس کی نسل سے قائم کروں گا۔" (تورات، تکوین، اصحاح ۱۷ آیت ۷ و ۱۹)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تورات میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو قربان کرنا چاہا اور فرشتہ نے ندا دی کہ ہاتھ کو روک لو، تو فرشتہ نے یہ الفاظ کہے:

"خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا، میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا"۔

(تورات، تکوین، اصحاح ۲۲۔ آیت ۱۶۔۱۷)

اب غور کرو، کہ خدا نے جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت ہی کے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس کی نسل قائم رکھوں گا، تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ جس وقت تک حضرت اسحاق علیہ السلام [1] کی اولاد نہیں پیدا ہوئی تھی۔ ان کی قربانی کا حکم ہوتا، لیکن حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبیح تسلیم کیا جائے تو تمام نصوص منطبق ہو جاتے ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام اکبر اولاد تھے۔ محبوب تر تھے، قربانی کے وقت بالغ یا قریب البلوغ تھے، قربانی سے پہلے ان کی کثرت نسل کی بشارت نہیں دی گئی، تورات میں تصریح ہے کہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا، اس لئے اس بیٹے کی کثرت نسل کا وعدہ کیا گیا، یعنی یہ کثرت نسل، اسی قربانی کے صلہ میں تھی، اس لئے ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں، کیونکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی تکثیر نسل کا وعدہ تو ان کی ولادت ہی کے وقت ہو چکا تھا، جو کسی انعام وصلہ کے معاوضہ میں نہ تھا۔

مقام قربانی

⑦ تورات میں قربانی گاہ کا جو موقع بتایا ہے وہ "مریا" ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہیکل تھا، عیسائی کہتے ہیں کہ یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی۔ لیکن یورپ کے محققوں نے ان دونوں دعووں کی تغلیط کی ہے۔ سر اسٹانلی لکھتے ہیں:

"حضرت ابراہیم علیہ السلام صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے، جہاں ان کو خدا نے حکم دیا تھا لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہیں ہے جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے، نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے، یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے

[1] یہ مسلم ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات کے بعد پیدا ہوئی۔ (تکوین۔ اصحاح ۲۵۔ آیت ۱۱)

اور اس سے بھی زیادہ البعد مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جبل عرفات [1] ہے، غالباً یہ مقام جر یزیم کے پہاڑ پر ہے اور وہی قربان گاہ سے مشابہ مقام ہے۔''

اس سے تو اتنا ثابت ہوا کہ موریا کے تعینمیں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعوے غلط ہیں۔ باقی یہ امر کہ مسلمانوں کا دعویٰ بھی غلط ہے، اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

موریا کی تعیین میں جو اختلاف پیدا ہوا، اس نے ایک اور اختلاف پیدا کر دیا، یعنی یہ کہ یہ لفظ کسی مقام کا نام ہے، یا وصفی معنی رکھتا ہے، بہت سے مترجموں نے اس کو ایک مشتق لفظ سمجھا اور اس لئے اس کا ترجمہ تورات کے بعض نسخوں میں بلوطاتِ عالیہ اور بعض میں ''زمین بلند'' اور بعض میں مقام الرویا کیا، لیکن زیادہ صائب الرائے لوگوں نے اس کو مقام کا نام سمجھا اور اس لئے لفظ کا ترجمہ نہیں کیا، بلکہ بہ حالِ خود رہنے دیا، لیکن امتداد زمانہ اور بے پروائی سے لفظ کی ہیئت بدل گئی یعنی ''مریا'' کا ''مورہ'' ہو گیا، خصوصاً اس وجہ سے کہ عبرانی زبان میں دونوں لفظوں کا املا قریب قریب ہے۔

مورہ کی نسبت توراۃ میں تصریح ہے کہ عرب میں واقع ہے، تورات میں ہے:

وكان جيش المديانيين شماليهم عند تل مورة في الوادي۔(قضاۃ، اصحاح ۷۔ آیت ۲)

''اور مدیانیوں [2] کی فوج، شمال کی جانب مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی'' (مدیان عرب میں واقع ہے)

تمام واقعات اور قرائن کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ لفظ مورہ نہیں بلکہ مروہ ہے جو مکہ معظمہ کی پہاڑی ہے اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

عرب کی روایات، قرآن مجید کی تصریح، احادیث کی تعیین، تمام چیزیں اس قیاس سے اس قدر مطابق ہوتی جاتی ہیں کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحت واقعہ کے ممکن نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے:

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''قربانی گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربانی گاہ ہیں۔'' [3]

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مروہ میں قربانی نہیں ہوتی تھی، بلکہ منیٰ میں ہوتی تھی، جو مکہ سے تین میل پر ہے، تاہم آنحضرت ﷺ نے مروہ ہی کو قربانی گاہ فرمایا، یہ اسی بنا پر تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کرنی چاہی تھی۔

قرآن مجید میں ہے:

[1] یہ غلط ہے، مسلمان عرفات کو نہیں، بلکہ منیٰ کو قربانی گاہ سمجھتے ہیں۔ [2] مدین عرب کی زمین ہے اور عرب کو اکثر مدیانیون کہتے ہیں، اور مدین کی زمین شام کے جنوب سے یمن کے شمال تک ہے اور یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں جو قطورا سے تھے۔ (ضمیمہ بائبل، صفحہ: ۱۱۴) [3] مؤطا امام مالك، كتاب الحج، باب ماجاء في النحر في الحج: ۸۹۵؛ ابوداود، كتاب المناسك، باب الصلاة بجمع: ۱۹۳۷؛ ابن ماجه: ۳۰۴۸۔

﴿ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ (۲۲/ الحج:۳۳)

''پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے۔''

﴿هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾ (۵/ المآئدۃ:۹۵)

''قربانی جو کہ کعبہ میں پہنچے۔''

مروہ بالکل کعبہ کے مقابل اور اس کے قریب ہے، ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے، منیٰ نہیں لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کے حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔

قربانی کی یادگار

یہودی حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس لئے اگر حضرت اسحاق علیہ السلام ذبیح ہوتے تو اس کی کوئی یادگار ان کے ہاں موجود ہوتی، بخلاف اس کے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان، بلکہ تمام مسلمانوں میں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی روحانی اولاد ہیں، قربانی کی تمام رسمیں آج تک موجود ہیں۔

اولاد اسمٰعیل میں قربانی کی تمام یادگاریں موجود ہیں اور حج جو کہ ایک بڑا فریضۂ اسلام ہے، تمام تر اسی قربانی کی یادگار ہے، چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا، تو پکارا، اے ابراہیم! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ''میں حاضر ہوں۔'' ❶

حج کے وقت مسلمان جو ہر قدم پر لبیک کہتے چلتے ہیں، یہ وہی ابراہیمی الفاظ ہیں، جس کا لفظی ترجمہ وہی ہے ''میں حاضر ہوں۔'' ❷

② شریعت ابراہیمی میں دستور تھا کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھاتے تھے، یا خدا کے لئے نذر دیتے تھے، وہ بار بار معبد یا قربان گاہ کے پھیرے کرتا تھا۔

حج میں صفا و مروہ کے درمیان جو سات بار سعی کرتے ہیں، یہ اسی کی یادگار ہے۔

③ نذر کے فرائض میں ایک یہ تھا کہ ایام نذر تک بال نہیں کترواتے تھے، حج میں بھی یہی دستور ہے، جب احرام اتارتے ہیں تب بال کترواتے یا منڈواتے ہیں، خود قرآن مجید میں اس شعار کا ذکر ہے:

﴿مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۷)

''سروں کو منڈائے ہوئے۔''

④ حج کا ایک ضروری رکن، قربانی ہے، یہ وہی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے، اسی بنا پر قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ﴾ (۳۷/ الصآفات:۱۰۷)

❶ توراۃ تکوین، اصحاح:۲۲۔ آیت:۱۔ ❷ توراۃ لاویین اصحاح ۸۔ آیت:۲۷۔

''اور حضرت اسماعیل کی قربانی کے بدلے ہم نے ایک بڑی قربانی قائم کی۔''

یہ دلائل تورات کی تصریحات و کنایات کی بنا پر تھے، قرآن مجید کے رو سے قطعاً حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت ہے، اگرچہ بہت سے مفسرین نے غلطی سے یہودیوں ہی کی روایت کی تائید کی ہے، قرآن مجید میں قربانی کا واقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے:

﴿ وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ۝ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ يٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰى فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ ﴾

(۳۷/ الصآفات: ۹۹۔۱۰۲)

''اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں اپنے خدا کی طرف جاؤں گا، وہ مجھ کو راستہ دکھائے گا، خدایا! مجھ کو وہ اولاد دے کہ جو نیک چلن ہو، تو ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی، پھر جب وہ لڑکا اس کے ساتھ چلنے لگا تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تیری کیا رائے ہے؟''

آیت بالا میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اولاد کے لئے دعا مانگی اور خدا نے قبول کی اور وہی لڑکا قربانی کے لئے پیش کیا گیا۔

تورات سے ثابت ہے کہ جو لڑکا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے پیدا ہوا، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور اسی لئے ان کا نام اسماعیل علیہ السلام رکھا گیا کہ خدا نے ان کے بارہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا سنی، اس بنا پر اس آیت میں جس کا ذکر ہے، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، اسحاق علیہ السلام نہیں۔

قربانی کے واقعہ کی تفصیل اور اختتام کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہے، اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ جس کا ذکر اوپر ہوا، وہ حضرت اسحاق علیہ السلام نہیں ہیں، بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔

مسلمانوں کا نام جو مسلم رکھا گیا، یہ وہ نام ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایجاد کیا تھا۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ ...... ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۸)

''تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب، اسی [1] نے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا۔''

اس تسمیہ کی تاریخ قربانی سے شروع ہوتی ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو

[1] ابھی گزشتہ صفحات کے حاشیہ میں گزر چکا ہے کہ بعض مفسرین نے قرب لفظ کی وجہ سے سمّٰی کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا ہے تابعین میں حضرت ابن زید اور حضرت حسن بصری کا یہی مسلک ہے اور ابوحیان نے اسی کی تائید کی ہے (البحر المحيط، جزء سادس، ص: ۳۹۱) لیکن صحابہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور تابعین میں مجاہد، ضحاک، قتادہ اور سفیان رحمہم اللہ نے اللہ کی طرف ضمیر پھیری ہے اور یہ معنی لئے ہیں کہ تمہارا نام مسلم قرآن کے نزول سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے رکھا اور اس قرآن میں بھی اس نے تمہارا یہ نام رکھا۔ تفسیر ابن جریر، جزء سابع عشر، ص: ۱۳۰ (س)۔

قربان کرنا چاہا اور ان سے کہا کہ ''مجھ کو خدا کا یہ حکم ہوا ہے، تمہاری کیا رائے ہے؟'' تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے نہایت استقلال کے ساتھ گردن جھکا دی کہ یہ سر حاضر ہے، اس موقع پر خدا نے ''اسلما'' کا لفظ استعمال کیا جو اسلام سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی ''تسلیم'' اور ''حوالے کر دینے'' کے ہیں۔

﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا ﴾ (۳۷/ الصافات: ۱۰۳)

''پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو (ہمارے) حوالہ کر دیا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم و رضا ہے، یعنی جب قربانی کا حکم ہوا تو باپ بیٹے دونوں نے بے عذر گردنیں جھکا دیں، یہ وصف مقبول بارگاہ ہوا اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہی شعار مذہبی قرار پایا، اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پیروان ملت کا نام مسلم رکھا۔

قربانی، ایثار اور اسلام در حقیقت یہ سب مترادف الفاظ ہیں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا، اگر حضرت اسحاق علیہ السلام قربانی ہوتے تو یہ لقب ان کی اولاد یا ان کی امت کو ملتا۔

قربانی کی حقیقت

اس مسئلہ کی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے، جب اس پر غور کیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس سے اصل مقصود کیا تھا؟ قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا دیا کرتی تھیں، یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی، مخالفین اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا، لیکن یہ سخت غلطی ہے۔

اکابر [1] صوفیہ نے لکھا ہے کہ انبیا علیہم السلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں، دو قسم کے ہوتے ہیں، عینی اور تمثیلی، عینی میں بعینہ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب میں نظر آتی ہے، تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں

---

[1] (اس مقام پر مصنف کی یہ عبارت مزید تشریح کی محتاج ہے، مصنف نے جیسا کہ لکھا ہے کہ رؤیا دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک عینی جس میں صورت واقعہ بعینہ دکھائی جاتی ہے اور دوسری تمثیلی جس میں صورت واقعہ کسی مثالی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اس کو بہت سے علما نے تسلیم کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ خواب کی اس دوسری قسم میں اصلی مقصود رؤیا کی دوسری مثالی صورت ہوتی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے ماں باپ کو آفتاب و ماہتاب اور بھائیوں کو ستاروں کی شکل میں دیکھنا یا حضور انور کا مدینہ کی وبا کو ایک بڑھیا کی شکل میں دیکھنا اور احد میں مسلمان شہدا کو مذبوح گایوں کے رنگ میں دیکھنا، محدث خطابی معالم السنن میں لکھتے ہیں:

وبعض الرؤيا مثل يضرب ليتأول على الوجه الذي يجب ان يصرف اليه معنى التعبير في مثله و بعض الرؤيا لايحتاج الى ذلك بل يأتي كالمشاهدة.

(فتح الباري، ج۱۳، ص: ۴۰۲)

''بعض خواب تمثیلی ہوتے ہیں جس کو اس مثالی صورت میں اس لئے بیان کیا جاتا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کسی مطلب کو پورا ادا کرنا ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھایا گیا تھا۔ اس سے یہ مراد تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں، یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں، بلکہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے جائیں، تورات میں جابجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کو عینی خیال کیا اور بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی، گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیا سے ہو سکتی تھی (گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی، بلکہ خدا اس پر متنبہ کر دیتا ہے) اس بنا پر گو حضرت

(❁❁ گزشتہ سے پیوستہ) کہ اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں۔''

امام ابوبکر ابن العربی مالکی احکام القرآن میں اسی حقیقت کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس رؤیا کے ضمن میں یوں فرماتے ہیں کہ ''بعض رؤیا نام کی طرح ہوتے ہیں (یعنی عینی و تصریحی جو بالکل لفظاً واقعہ کے عین مطابق ہوتے ہیں) اور بعض مثل کنیتوں کی طرح ہوتے ہیں یعنی کسی مناسبت معنوی کے سبب سے وہ کسی دوسرے ہم شکل واقعہ کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خواب اسی دوسری قسم کا تھا۔'' (احکام القرآن، جلد ۲، صفحہ: ۱۹۶، مطبع سعادت، مصر: ۱۳۳۱ھ)

مصنف سیرت نے اس مقام پر ان ہی بعض علما کی تقلید کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس خواب کو تمثیلی کہا ہے اور اسی بنا پر ان کو یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اس خواب کو جو تمثیلی تھا، اپنی خطائے اجتہادی سے عینی و حقیقی سمجھے اور اس کی بعینہٖ تعمیل پر آمادہ ہو گئے، لیکن عین وقت پر ان کو وحی الٰہی نے ان کی اس اجتہادی خطا پر متنبہ کر دیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بعینہٖ قربانی سے روک کر ان کی جگہ جانور کی قربانی پیش کی۔

ہیچ مداں جامع کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو محبت الٰہی سے سرشار تھے، خطائے اجتہادی سے نہیں بلکہ غلبۂ شوق اطاعت و محبت میں اس حکم الٰہی کی تعمیل اپنی طرف سے بالکل بعینہٖ و بلفظہٖ کرنے پر آمادہ ہو گئے، تا کہ اس ابتلا میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پورے اتریں اور اپنی طرف سے بیٹے کی جان کی قربانی کی جگہ اس کی خدمت توحید و تولیت کعبہ کے لئے وقف کر دینے کی تاویل کا سہارا لے کر نفس کی متابعت کے شبہ اور دھوکے سے بھی پاک رہیں، تا آنکہ اللہ تعالیٰ خود اس حقیقت کو اپنے لفظوں میں واضح فرما دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، آواز آئی:

﴿ يَٰٓإِبۡرَٰهِيمُ ۝ قَدۡ صَدَّقۡتَ ٱلرُّءۡيَآۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجۡزِي ٱلۡمُحۡسِنِينَ ۝ ﴾ (۳۷/ الصافات: ۱۰۴، ۱۰۵)

''ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔''

﴿ وَفَدَيۡنَٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِيمٖ ۝ ﴾ (۳۷/ الصافات: ۱۰۷) ''اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کی عوض میں دیا۔''

اور امت پر یہ قربانی اسی تمثیلی رنگ میں واجب ٹھہرائی گئی، یعنی جسمانی اطاعت و قربانی کی تمثیل، جانور کی قربانی کی شکل میں۔ یہ تشریح ان بعض علما کی متابعت میں ہے جو بعض دینی و علمی اسباب کی بنا پر اس کو رؤیائے تمثیلی سمجھتے ہیں ورنہ جمہور علما اس رؤیا کو عینی ہی سمجھتے ہیں، لیکن عین اس وقت جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر عمل کر کے اپنی طرف سے فرزند کے ذبح کی پوری عزیمت کر کے اپنے کام کو پورا کر چکے تھے اور تعمیل حکم میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں رہی تھی کہ وحی الٰہی نے آواز دی، اے ابراہیم! تم نے اپنا کام پورا کر دیا اور اپنے خواب کو سچ کر دکھایا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اب اس کی جگہ ملت ابراہیم کی یہ سنت عظیم جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ ظاہر ہے کہ بہر دو صورت یہ جانور کی قربانی جیسا کہ بعض ائمہ محققین نے لکھا ہے نفس کی قربانی کی تمثیل ہے اور اس قربانی کا گوشت اس روز عید میں قربانی کنندہ کے لئے برکت، احباب کے لئے تحفہ اور فقرا کے لئے سامان دعوت بنا۔

مزید تفصیل کے لئے معارف ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ مطابق مارچ: ۱۹۳۷ء مضمون ''ذبح عظیم'' اور معارف صفر ۱۳۵۶ھ مطابق مئی: ۱۹۳۷ء کے شذرات ملاحظہ ہوں۔ (س)

ابراہیم علیہ السلام اس فعل سے روک دیئے گئے، لیکن خدا نے ان کی حسن نیت کی قدر کی اور فرمایا:

﴿ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴾ (۳۷/ الصآفات:۱۰۵)

''تو نے خواب کو سچا کیا، ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں۔''

بہرحال یہاں اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ قربانی سے مقصود خدمت کعبہ کے لئے نذر چڑھانا تھا، نذر چڑھانے کے لئے شریعت سابقہ میں جو لفظ مستعمل تھا وہ ''خدا کے سامنے'' تھا۔ تورات میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حق میں خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی:

لیت اسمعیل یعیش امامك۔ (تورات، تکوین اصحاح ۱۷۔ آیت ۱۸)

''کاش اسماعیل تیرے سامنے زندگی کرتا۔''

اسی خواہش کے مطابق ان کو خواب میں تمثیلی پیرایہ میں حکم دیا گیا کہ وہ بیٹے کی قربانی کریں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کا نہیں، بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔

مکہ معظّمہ

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بحثِ مسکن میں گزر چکا کہ وہ عرب تھا، مقام ذبح کی تعیین میں یہ ثابت ہو چکا کہ وادی ''مکہ'' تھا، اس بنا پر مکہ کی نسبت ایک بحث نہایت قدیم زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

متعصب عیسائی مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی قدامت کا دعویٰ، مسلمانوں کا خاص دعویٰ ہے، قدیم تاریخوں میں اس کا نشان نہیں ملتا، [1] اس بنا پر ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔

مکہ کا قدیم اور اصلی نام بَکّۃ ہے، قرآن مجید میں یہی نام ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا ﴾ (۳/ آل عمران:۹۶)

''پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لئے بنایا گیا، وہ بکہ میں تھا۔''

کتاب زبور ۸۴۔۶، ص:۶۱ میں ہے:

''بکہ کی وادی میں گزرتے ہوئے، اسے ایک کنواں بتاتے، برکتوں سے مورۃ کو ڈھانک لیتے، قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔''

اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے، یہ وہی مکہ معظّمہ ہے، لیکن اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے مشتق قرار دیں، تو اس کے معنی ''رونے'' کے ہوں گے اور یہ وہی عربی لفظ بکاء ہے، چونکہ یہود ونصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے، اس لئے بہت سے مترجمین نے عبارت مذکور میں بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے، لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادی بکا کے کیا معنی ہوں گے؟ زبور کی عبارت مذکورہ کی اوپر کی آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نشید میں حضرت داؤد علیہ السلام نے مکہ معظّمہ اور مروہ اور قربان گاہ اسماعیلی کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے۔ اوپر کی عبارت یہ ہے (حضرت داؤد علیہ السلام خدا سے کہتے ہیں) اے فوجوں کے خدا! تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں، میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے...... اے خدا! تیرے قربان گاہ میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارکی ہو، ان لوگوں کو جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں۔'' [2] اس کے بعد بکہ والی آیتیں ہیں، اب غور کرو حضرت داؤد علیہ السلام جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں، وہ اس مقام پر صادق آ سکتا ہے جس میں حسب ذیل باتیں پائی جائیں۔

① قربانی گاہ ہو۔

② حضرت داؤد علیہ السلام کے وطن سے دور ہو کہ وہاں تک سفر کر کے جائیں۔

---

[1] مارگولیتھ اپنی کتاب میں لکھتا ہے: ''اگرچہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البناء قرار دیا ہے، لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد ﷺ کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی''۔ مارگولیتھ نے اس کے ثبوت میں اصابہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اور ہم کو بھی اس کی صحت سے انکار نہیں لیکن اس کل بیان میں مغالطہ ہے جس کو ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کر دیا ہے۔ [2] زبور، نشید:۸۴۔۱تا۵۔

③ وہ وادیٔ بکہ کہلاتا ہو۔

④ وہاں مقام مورۃ بھی ہو۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین ہو جائے گا کہ بکہ وہی مکہ معظمہ اور مورۃ وہی مروۃ ہے۔اس کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہوگا کہ یہودی کس طرح تعصب سے الفاظ کو ادل بدل کر دیتے ہیں۔

﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (٤/ النسآء: ٤٦)

ڈاکٹر ہسٹنگس نے ''ڈکشنری آف دی بائبل'' میں وادی بکا پر جو آرٹیکل لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

اس لفظ سے اگر کوئی وادی مراد ہے، تو وہ حسب ذیل ہو سکتی ہے:

1 ایک وادی ہے جس میں ہو کر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں۔

2 وادی اخور ہے، جو یشوعا باب ۷۔ آیات ۲۴۔ ۲۶ ص: ۳۴۸ وغیرہ میں مذکور ہے۔

3 وادی رفایون ہے، جو ساموئیل دوم باب ۵ آیات ۱۸۔۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے۔

4 کوہ سینا کی ایک وادی ہے۔

5 بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ شمال سے آتا ہے، اس راستے کی آخری منزل ہے۔ (دیکھو رینان کی کتاب ''حیاتِ عیسٰی'' باب ۴)

لیکن کیا عجیب بات ہے، ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالات کثیرہ میں کہیں مکہ معظمہ کا پتہ نہیں لگتا، مصرع

ہما ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجاست

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ جن جن وادیوں کا نام لیا ہے ان میں ایک کو بھی بکا کے لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں۔ یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں، بخلاف اس کے بکا اور بکہ بالکل ایک لفظ ہیں۔ فرق اسی قدر ہے جس قدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

''جدید انسائیکلو پیڈیا [1] '' میں محمد ﷺ کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ مارگولیتھ کا ہے، اس میں مکہ معظمہ کی نسبت لکھا ہے:

قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا، بجز اس کے کہ زبور (۸۴۔۶) میں ''وادی بکہ'' کا لفظ ہے لیکن مارگولیتھ صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں۔

پروفیسر دوزی، جو فرانس کا مشہور محقق اور عربی دان عالم ہے، وہ لکھتا ہے: [2]

''بکہ وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ دان ماکروبہ لکھتے ہیں۔''

لیکن مارگولیتھ کو پروفیسر دوزی کے بیان پر بھی اعتماد نہیں۔

کارلائل صاحب نے اپنی کتاب ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں لکھا ہے:

---

[1] انسائیکلو پیڈیا طبع اخیر جلد ۱۰۔ صفحہ: ۳۹۹۔ [2] ایضاً۔

''رومن مؤرخ سیسلس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے اور یہ ولادت مسیح علیہ السلام سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے۔''

اگر کعبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے موجود تھا۔ تو مکہ بھی تقریباً اسی زمانہ کا شہر ہوگا کیونکہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے اس کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان (ج ۸،ص:۱۳۲) میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کا عرض اور طول بلد بطلیموس [1] کے جغرافیہ میں حسب ذیل ہے:

''طول ۷۸ درجہ عرض ۳ درجہ۔''

بطلیموس نہایت قدیم زمانہ کا مصنف ہے۔ اگر اس نے اپنے جغرافیہ میں مکہ کا ذکر کیا ہے تو اس سے زیادہ قدامت کی کیا سند درکار ہے۔

مارگولیتھ نے جس بنا پر مکہ معظمہ کی قدامت سے انکار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اصابہ میں تصریح ہے کہ'' مکہ میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ سعید یا سعد بن عمرو نے تعمیر کی'' لیکن مارگیولوس کو یہ معلوم نہیں کہ مؤرخین نے جابجا یہ بھی تصریح کی ہے کہ چونکہ اہل عرب کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارات بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے اس لئے عمارتیں نہیں بنوائیں، بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے اور اس طرح مکہ ہمیشہ سے خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر

دنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایران، ہند، مصر، یورپ میں عالمگیر اندھیرا تھا۔ قبول حق ایک طرف اس وسیع خطہ خاک میں گز بھر زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا، مصر آئے، ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا، فلسطین پہنچے، کسی نے بات تک نہ پوچھی، خدا کا جہاں نام لیتے تھے، شرک اور بت پرستی کے غلغلہ میں آواز دب دب کر رہ جاتی تھی۔ معمورۂ عالم کے صفحے نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے۔ اب ایک سادہ، بے رنگ، ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا، ورق درکار تھا، جس پر طغرائے حق لکھا جائے، یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو عرب میں لائے اور ان کو یہیں آباد کیا۔ حضرت سارہ علیہا السلام نے (جیسا کہ تورات میں ہے) کچھ عرصہ کے بعد انتقال کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں چلے آئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہو چکے تھے، اعلان حق میں ایک ہم آواز ہاتھ آیا، دونوں نے مل کر

[1] بطلیموس کے جغرافیہ کا ترجمہ عباسیوں کے زمانہ میں ہو گیا تھا، مسعودی اور ابن الندیم نے اکثر اس کے حوالے دیے ہیں۔

ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی۔ [1]

﴿ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ﴾ . (۲/ البقرۃ: ۱۲۷)

''اور جبکہ ابراہیم اور اسماعیل خانۂ خدا کی دیواریں اٹھار ہے تھے۔''

گھر بن چکا تو وحی الٰہی نے آواز دی:

﴿ وَّطَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَالْقَآىِٕمِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۶، ۲۷)

''ہمارا گھر طواف کرنے والوں (نماز میں قیام کرنے والوں) رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک کر اور تمام لوگوں کو پکار دے کہ حج کو آئیں پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی، ہر دور دراز گوشہ سے آئیں گے۔''

اس وقت اعلان و اشتہار کے وسائل نہیں تھے، ویران جگہ تھی اور آدمی کا کوسوں تک پتہ نہ تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کی آواز حدود حرم سے باہر نہیں جا سکتی تھی لیکن وہی معمولی آواز کہاں کہاں پہنچی، مشرق سے مغرب تک شمال سے جنوب تک اور زمین سے آسمان تک۔

علامہ ازرقی نے تاریخ مکہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو تعمیر کی اس کا عرض وطول حسب ذیل تھا:

بلندی.........زمین سے چھت تک ۹ گز

طول.........حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۲ گز

عرض.........رکن شامی سے غربی تک ۲۲ گز

عمارت بن چکی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ، تا کہ ایسے مقام پر لگا دوں جہاں سے طواف شروع کیا جائے، تاریخ مکہ موسوم بہ، اعلام باعلام بیت الحرام میں ہے:

فقال ابراهيم لاسمعيل عليهما الصلوة والسلام يااسمعيل ايتنى بحجر اضعه حتى يكون علما للناس يبتدون منه الطواف۔

''پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ، تاکہ میں ایسی جگہ نصب کر دوں جہاں سے لوگ طواف شروع کریں۔''

خدا کا یہ گھر ایسا سادہ تعمیر ہوا تھا کہ نہ چھت تھی نہ کواڑ اور نہ چوکھٹ بازو تھے۔ جب قصی بن کلاب کو کعبہ کی تولیت حاصل ہوئی تو انہوں نے قدیم عمارت گرا کر نئے سرے سے تعمیر کی اور کھجور کے تختوں کی چھت

[1] محققین کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی منہدم و بے نشان عمارت کی دوبارہ بنیاد اٹھا کر بلند کی۔ مزید توضیح کے لئے سیرۃ النبی جلد پنجم باب حج عنوان مکہ اور کعبہ میں دیکھئے۔ (س)

ڈالی۔ [1]

کعبہ کی برکت اور کشش سے لوگ آس پاس آباد ہونے لگے چنانچہ سب سے پہلے قبیلہ جرہم آ کر آباد ہوا، اس قبیلہ میں مضاض بن عمرو جرہمی ایک ممتاز شخص تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ان کی لڑکی سے شادی کی، ان سے بارہ اولاد ہوئی، جن کے نام تورات میں مذکور ہیں۔ ان میں سے اکثر اہل عرب قیدار کی اولاد میں ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت کعبہ کے متولی ہوئے، ان کے مرنے کے بعد ان کے نانا مضاض نے یہ منصب حاصل کیا اور کعبہ کی تولیت خاندان اسماعیل سے نکل کر جرہم کے خاندان میں آ گئی۔ لیکن پھر ایک اور قبیلہ خزاعۃ نے کعبہ پر قبضہ کر لیا اور مدت تک اسی خاندان میں یہ منصب رہا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خاندان موجود تھا۔ لیکن اس نے کچھ مزاحمت نہیں کی۔ قصی بن کلاب کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنا آبائی حق حاصل کیا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

حرم کعبہ پر سب سے پہلے جس نے پردہ چڑھایا وہ یمن کا حمیری بادشاہ اسعد تبع تھا۔ یمن میں خاص قسم کی چادریں بُنی جاتی ہیں جن کو بردیمانی کہتے ہیں۔ یہ پردہ انہی چادروں سے تیار کیا گیا تھا۔ قصی بن کلاب کے زمانہ سے تمام قبائل پر ایک محصول لگا دیا گیا جس سے پردہ تیار کیا جاتا تھا۔ علامہ ازرقی نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی یمنی پردہ چڑھایا تھا لیکن اس روایت کے سلسلہ کا ایک راوی واقدی ہے۔ [2]

خدا کا گھر سیم وزر کی نقش آرائیوں کا محتاج نہ تھا لیکن دولت اور ملک کی ترقی کے یہ لوازم ہیں اس لئے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے کعبہ کے ستونوں پر سونے کے پتر چڑھائے۔ عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں ۳۶ ہزار اشرفیاں اس کام کے لئے بھیجیں۔ امین الرشید نے ۱۸ ہزار اشرفیاں نذر کیں کہ دروازہ کی چوکھٹ وغیرہ طلائی بنوا دی جائے۔ اعلام (تاریخ مکہ) میں عہد بہ عہد کی طلاکاریوں کی تفصیل لکھی ہے۔ لیکن یہ واقعات عہد نبوت کے بعد کے ہیں جو ہماری کتاب کا موضوع نہیں اور سچ یہ ہے کہ آفتاب پر سونا چڑھانا ضروری بھی نہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی

خدا کا گھر بن چکا تو ضرورت تھی کہ اس کی تولیت اور خدمت کے لئے کوئی نفس قدسی تمام مشاغل سے

---

[1] اعلام بہ حوالہ کتاب النسب از ابن بکار و ابن الماوردی۔ [2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں قباطی کا پردہ چڑھایا تھا جو مصر میں بنا جاتا ہے، ان کے بعد معمول ہو گیا کہ ہر خلیفہ اپنے عہد خلافت میں پردہ چڑھاتا تھا، بنوامیہ نے دیبا کا پردہ چڑھایا تھا، مامون الرشید ہر سال تین پردے چڑھاتا تھا، حج کے زمانہ میں دیبائے احمر کا، رجب میں قباطی کا، عیدالفطر میں دیبائے سفید کا، مصر میں جب سلطان صالح بن سلطان قلادون بادشاہ ہوا تو مصر کے دو گاؤں پردہ کے مصارف کے لئے وقف کر دیے، جب ترکی خاندان قسطنطنیہ میں حکمران ہوا تو سلطان سلیمان نے چند گاؤں اور اضافہ کر دیے، (اعلام باعلام بیت اللہ الحرام) برحاشیہ خلاصۃ الکلام فی بیان امراء البلد الحرام: ٤٦، ٤٧ مطبع خیریہ مصر: ۱۳۰۵ء خانہ کعبہ پر پردہ چڑھانے کی تاریخ بہ تفصیل فتوح البلدان بلاذری اور تاریخ مکہ ازرقی اور معجم البلدان وغیرہ میں ہے، ہم نے اخیر تصنیف یعنی اعلام کو لیا ہے کہ وہ ان سب کے بعد کی تصنیف اور جامع ہے۔

الگ ہو کر اپنی زندگی اس پر نذر چڑھا دے۔ اس قسم کی نذر کو ابراہیمی شریعت میں قربانی سے تعبیر کرتے تھے۔ تورات میں یہ محاورہ بہ کثرت آتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، انبیا علیہم السلام پر جو وحی آتی ہے، اس کے مختلف انواع ہیں جن میں سے ایک خواب بھی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری باب بدء الوحی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ پر وحی کی جو ابتدا ہوئی خواب سے ہوئی۔ [1] یہ خواب کبھی تمثیلی ہوتا ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب دکھلایا گیا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس خواب کو عینی سمجھا اور بعینہٖ اس کی تعمیل پر آمادہ ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے استقلال اور جان نثاری پر اعتماد تھا۔ لیکن یہ تحقیق طلب تھا کہ پانزدہ سالہ نوجوان بھی اپنی گردن پر چھری چلتے دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا:

﴿ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ﴾. (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۲)

''بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتا تیری کیا رائے ہے۔''

بیٹے نے نہایت استقلال سے جواب دیا:

﴿ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾.

(۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۲)

''ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کر گزریئے، خدا نے چاہا تو میں ثابت قدم رہوں گا۔''

اب ایک طرف نوّے سالہ پیر ضعیف ہے جس کو دعا ہائے سحر کے بعد، خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہے۔

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے، جس نے بچپن سے آج تک، باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ ہی کا مہر پرور ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے، ملائکہ قدسی، فضائے آسمانی، عالم کائنات، یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتاً عالم قدس سے آواز آتی ہے:

﴿ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۵)

''ابراہیم! تو نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں۔''

طغیانِ نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل　　　در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا، اس کا صلہ یہی تھا کہ یہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اس کی یادگار رہ جائے۔

[1] صحیح بخاری، باب بدء الوحی:۳۔

محمد رسول اللہ ﷺ

سلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب یہ ہے، محمد (ﷺ) بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

صحیح بخاری (باب مبعث النبی ﷺ) میں یہیں تک ہے۔ [1] لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں عدنان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نام گنائے ہیں۔ یعنی عدنان بن عدد بن المقوم ابن تارح بن یشجب بن یعرب بن نابت بن اسمٰعیل بن ابراہیم علیہ السلام۔

سلسلۂ نسب

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، جن کا ذکر توراۃ میں بھی ہے، ان میں سے قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی۔ انہی کی اولاد میں عدنان ہیں اور آنحضرت ﷺ انہی کے خاندان سے ہیں۔ عرب کے نسب دان تمام پشتوں کو محفوظ نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر نسب ناموں میں عدنان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک صرف آٹھ نو پشتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں۔ عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک اگر صرف نو دس پشتیں ہوں تو یہ زمانہ تین سو برس سے زیادہ نہ ہوگا اور یہ امر بالکل تاریخی شہادتوں کے خلاف ہے، علامہ سہیلی روض الانف (ص ۸) میں لکھتے ہیں:

> ویستحیل فی العادۃ ان یکون بینھما اربعۃ آباء او سبعۃ کما ذکر ابن اسحاق او عشرۃ او عشرون فان المدۃ اطول من ذلک کلہ۔
>
> ''اور یہ عادۃً محال ہے کہ دونوں میں ۴ یا ۷ پشتوں کا فاصلہ ہو جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا یا ۱۰، ۲۰ پشتیں ہوں کیونکہ زمانہ اس سے بہت زیادہ ہے۔''

علامہ موصوف نے بہت سے تاریخی حوالوں اور شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ عدنان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک ۴۰ پشتوں کا فاصلہ ہے۔ اس غلطی نے بعض عیسائی مؤرخوں کو اس بات کا موقع دیا ہے کہ سرے سے اس بات کے منکر ہو گئے کہ آنحضرت ﷺ خاندان ابراہیم سے ہیں۔ [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مبعث النبی ﷺ، رقم الباب: ۲۸۔

[2] سر ولیم صاحب نے صریحاً یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان سے نہ تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ''یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر ﷺ کو اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے خیال کیا جائے۔۔۔ اور غالباً یہ کوشش کی کہ وہ اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ثابت کیے جائیں، ان کی عین حیات میں پیدا ہوئی تھی اور اس طرح پر محمد ﷺ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے تھے۔'' (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس غلطی کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ اہل عرب زیادہ تر مشہور آدمیوں کے نام پر اکتفا کرتے تھے اور بیچ کی پیڑھیوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل عرب کے نزدیک چونکہ عدنان کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے خاندان سے ہونا قطعی اور یقینی تھا۔ اس لئے وہ صرف اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ عدنان تک سلسلہ نسب صحیح طور سے نام بنام پہنچ جائے۔ اوپر کے اشخاص کا نام لینا غیر ضروری سمجھتے تھے، اس لئے چند مشہور آدمیوں کا نام لے کر چھوڑ دیتے تھے، تاہم عرب میں ایسے محققین بھی تھے جو فروگزاشت سے واقف تھے، علامہ طبری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ ''مجھ سے بعض نسب دانوں نے بیان کیا کہ میں نے عرب میں ایسے علما دیکھے جو معد سے لے کر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک ۴۰ پشتوں کے نام لیتے تھے اور اس شہادت میں عرب کے اشعار پیش کرتے تھے اس شخص کا یہ بھی بیان تھا کہ میں نے اس سلسلہ کو اہل کتاب کی تحقیقات سے ملایا تو پشتوں کی تعداد برابر تھی البتہ ناموں میں فرق تھا، [1] اسی مؤرخ نے ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ ''شہر تدمر میں ایک یہودی تھا، جس کا نام ابو یعقوب تھا، وہ مسلمان ہو گیا تھا، اس کا بیان تھا کہ ارمیا پیغمبر کے منشی نے عدنان کا جو نسب نامہ لکھا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے، [2] اس شجرے میں بھی عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک چالیس نام ہیں، بہر حال یہ واقعہ یقینی ہے کہ عدنان حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہے اور آنحضرت ﷺ عدنان کے خاندان سے ہیں۔

بنائے خاندان قریش

آنحضرت ﷺ کا خاندان اگرچہ ابا عن جد [3] معزز اور ممتاز چلا آتا تھا، لیکن جس شخص نے اس

(گزشتہ سے پیوستہ) (لیکن ایک طرف سر ولیم میور صاحب کا تنہا شبہ ہے، دوسری طرف بیسیوں یورپین اور یہودی مؤرخین ہیں جو نہ صرف خاندان قریش کو بلکہ تمام شمالی عرب وحجاز کو ابراہیمی النسل تسلیم کرتے ہیں۔ (دیکھو فارسٹر صاحب کا جغرافیہ تاریخ عرب)

[1] تاریخ طبری، مطبوعہ یورپ، ج ۳، ص: ۱۱۱۸۔

[2] تاریخ طبری، مطبوعہ یورپ، ج ۳، ص: ۱۱۱۵، ۱۱۱۶۔

[3] تاریخ عرب کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے لیکن مارگولوس نے نہایت کوشش کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خاندان کو متبدل ثابت کیا جائے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ''یہ بالکل ظاہر ہے کہ محمد ﷺ ایک غریب اور ادنیٰ خاندان سے تھے۔'' اس کے بعد صاحب موصوف نے حسب ذیل استدلال پیش کئے ہیں۔ ''(۱) قرآن مجید میں ہے کہ قریش کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا۔ (۲) پیغمبر کے عروج کے زمانہ میں قریش نے آنحضرت کو اس درخت سے تشبیہ دی جو گھورے پر جمتا ہے (۳) رسول اللہ ﷺ کو جب ایک شخص نے مولیٰ کے لفظ سے خطاب کیا تو آپ نے اس لقب سے انکار کیا۔ (۴) فتح مکہ کے دن آپ نے فرمایا کہ ''آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہو گیا۔'' قرآن شریف کے الفاظ یہ ہیں: ﴿ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ﴾ (۴۳/ الزخرف: ۳۱) یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں (مکہ وطائف) کے کسی رئیس پر کیوں نہ اترا'' عظیم اور شریف دو الگ لفظ ہیں، قرآن میں عظیم کا لفظ ہے، اہل عرب دولت اور اقتدار والے کو عظیم کہتے تھے ان کو آنحضرت ﷺ کی شرافت سے نہیں بلکہ جاہ و دولت سے انکار تھا۔ دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن کی ہر بات کو صحیح ماننا چاہیے۔ کفار نے تو آنحضرت ﷺ کو دیوانہ، جادو زدہ، شاعر سب کچھ کہا، ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟ بلاشبہ آنحضرت ﷺ نے مولیٰ اور سید کے لفظ سے انکار کیا، لیکن متعدد حدیثوں میں صاف تصریح ہے کہ آپ نے فرمایا مجھ کو سید اور مولا نہ کہو مولا اور سید خدا ہے۔ قرآن میں ہر جگہ خدا ہی کو مولا کہا ہے، اس سے آنحضرت ﷺ کی خاندانی شرافت کا ابطال کیونکر ہوتا ہے؟ اخیر استدلال بھی حیرت انگیز ہے، اس سے آنحضرت ﷺ کی کم نسبی کیونکر ثابت ہوتی ہے؟ کہ شرفائے مکہ سے یہاں مراد جبارین ومتکبرین مکہ ہیں۔ مارگولوس صاحب نے یہ دلائل نولدیکی سے نقل کئے ہیں جو مشہور جرمنی مستشرق ہے مع ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا وہ نضر بن کنانہ تھے۔ بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا اور انہی کی اولاد قریشی ہے، حافظ عراقی سیرت منظوم میں لکھتے ہیں:

اما قریش فالاصح فہر　　جماعها والاکثرون النضر [1]

قصی

نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا، اس زمانہ میں حرم کے متولی خلیل خزاعی تھے، قصی نے خلیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حُبّی تھا شادی کی تھی، اس تعلق سے خلیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے، اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا، قصی نے ایک دارالمشورہ قائم کیا جس کا نام دارالندوہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے، قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، نکاح اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے۔

قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کئے، جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ اور رفادہ [2] جو خدام حرم کا سب سے بڑا منصب تھا، انہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سینکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے، چنانچہ قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا کہ حجاج کے کام آئے، مشعر حرام بھی انہی کی ایجاد ہے، جس پر ایام حج میں چراغ جلاتے تھے، چنانچہ عقد الفرید میں تصریح کی ہے، قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب اول انہی کو ملا۔ [3] چنانچہ علامہ ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا، اس لئے ان کو قریش کہتے ہیں کیونکہ تقریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اسی بنا پر ان کو مجمع بھی کہتے تھے، چنانچہ شاعر کہتا ہے:

قصی ابوکم من یسمی مجمعا　　بہ جمع اللہ القبائل من فہر

قصی کی چھ اولاد تھی، عبدالدار، عبد مناف، عبدالعزیٰ، عبد بن قصی، تخمر، برہ۔ قصی نے مرتے وقت حرم

---

[1] زرقانی، جلد اول، صفحہ: ۹۰۔ ۱۲۹۱ھ [2] سقایہ یعنی حاجیوں کو آب زمزم پلانا اور رفادہ حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔

[3] قصی بن کلاب کا مفصل تذکرہ طبقات ابن سعد جزء اول مطبوعہ لیڈن ۱۳۲۲ھ صفحہ ۳۶ سے لے کر ۴۲ تک ہے، قریش کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا۔ اس لئے قریش کہلائے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے، اس لئے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی، عام خیال یہ ہے کہ قریش قصی یا کسی اور شخص کا نام ہے لیکن امام سہیلی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قبیلہ کا نام ہے (ج ۱، ص: ۷۰، ۱ے مطبع جمالیہ مصر: ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) جس طرح قبائل عرب جانوروں کے نام پر نام رکھتے تھے، مثلاً: اسد، نمر وغیرہ۔ مؤرخین یورپ کا خیال ہے کہ قبائل جانوروں کی پرستش کرتے تھے اور انہی جانوروں کے نام سے مشہور ہو جاتے تھے۔ لیکن عربی تاریخوں میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

محترم کے تمام مناصب سب سے بڑے بیٹے عبدالدار کو دیے، [1] اگرچہ وہ سب بھائیوں میں ناقابل تھے لیکن قصی کے بعد قریش کی ریاست عبد مناف نے حاصل کی۔ اور انہیں کا خاندان رسول اللہ ﷺ کا خاص خاندان ہے۔ عبد مناف کے چھ بیٹے تھے، ان میں سے ہاشم نہایت صاحب صولت اور با اثر تھے، انہوں نے بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ حرم کے مناصب جو عبدالدار کو دیے گئے، واپس لے لئے جائیں، وہ لوگ اس منصب عظیم کے قابل نہیں۔ عبدالدار کے خاندان نے انکار کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں، بالآخر اس پر صلح ہوگئی کہ عبدالدار سے سقایہ اور رفادہ واپس لے کر ہاشم کو دے دیا۔

ہاشم

ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو نہایت سیر چشمی سے کھانا کھلاتے تھے، چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ ''قریش جب اس کے ملک میں اسباب تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔'' حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا۔ چنانچہ اہل عرب جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں انگوریہ (انقرہ) جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے۔ قیصر کا پایہ تخت تھا، تجار قریش، انگوریہ میں جاتے تو قیصر نہایت عزت اور حرمت سے خیر مقدم کرتا تھا۔

عرب میں راستے محفوظ نہ تھے۔ ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کر کے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے، جس کے صلہ میں کاروان قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں خود لے کر جائے گا اور ان سے خرید و فروخت کرے گا۔ یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلہ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔ [2]

ایک [3] دفعہ مکہ میں قحط پڑا، ہاشم نے اس قحط میں شوربہ میں روٹیاں چورا کر کے لوگوں کو کھلائیں، اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہوگیا، عربی زبان میں چورہ کرنے کو ہشم کہتے ہیں، جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔

ایک بار تجارت کی غرض سے شام گئے، راستہ میں مدینہ میں ٹھہرے، وہاں سال کے سال بازار لگتا تھا، بازار میں گئے تو ایک عورت کو دیکھا جس کی حرکات و سکنات سے شرافت اور فراست کا اظہار ہوتا تھا، اس کے ساتھ حسین اور جمیل بھی تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ خاندان بنی نجار سے ہے اور سلمٰی نام ہے۔ ہاشم نے اس سے شادی کی درخواست کی اور اس نے قبول کر لی، غرض نکاح ہوگیا۔ شادی کے بعد یہ شام کو چلے گئے اور غزہ میں جا کر انتقال کیا سلمٰی کو حمل رہ گیا تھا، لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام شیبہ رکھا گیا، اس نے قریباً ۸ برس تک مدینہ میں

[1] طبقات ابن سعد، ج ۱، ص: ۳۹۔ [2] امالی ابو علی قالی۔ (ذیل) ص: ۲۰۴، مطلب خروج بنی عبدالمناف الی الشام الخ، مطبوعہ بولاق مصر: ۱۳۲۴ھ۔ [3] طبری، ج ۳، ص: ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، (س)

پرورش پائی، ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا، ان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو فوراً مدینہ روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر بھتیجے کی جستجو کی، سلمٰی نے ان کے آنے کا حال سنا تو بلوا بھیجا۔ تین دن مہمان رہے، چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ ان کی عمر ۸ برس کی تھی یہاں آ کر ان کا نام عبدالمطلب پڑ گیا۔

عبدالمطلب

عبدالمطلب کے لفظی معنی ''مطلب کا غلام'' ہیں۔ اس لئے ارباب سیر نے وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال نقل کئے ہیں جن میں صحیح تر یہ ہے کہ چونکہ مطلب نے ان کی پرورش کی تھی اور یہ یتیم تھے، اس لئے عرب کے محاورہ کے مطابق غلام مطلب مشہور ہو گئے۔ [1] عبدالمطلب کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ چاہ زمزم جو ایک مدت سے اٹ کر گم ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کا پتہ لگایا اور کھدوا کر نئے سرے سے درست کروایا۔

عبداللہ

انہوں نے منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، دیکھو کس کے نام پر نکلتا ہے، اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا یہ ان کو لے کر قربان گاہ کو چلے، عبداللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں رونے لگیں اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربانی کیجئے، ان کو چھوڑ دیجئے، عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا، عبدالمطلب نے اب دس کے بجائے بیس اونٹ کر دیے، یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا، عبدالمطلب نے سو اونٹ قربانی کئے اور عبداللہ بچ گئے۔ یہ واقدی کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضہ کی تدبیر رؤسائے قریش نے تجویز کی تھی۔

عبدالمطلب کے دس یا بارہ بیٹوں میں سے پانچ شخصوں نے اسلام یا کفر کی خصوصیت کی وجہ سے شہرت عام حاصل کی۔ یعنی ابولہب، ابوطالب، عبداللہ، حمزہ رضی اللہ عنہ عباس عام طور پر مشہور ہیں، کہ ابولہب کا اصلی نام اور ہے۔ خطاب آنحضرت ﷺ نے یا صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیا لیکن یہ غلطی ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی کہ یہ لقب خود عبدالمطلب نے دیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ابولہب نہایت حسین اور جمیل تھا اور عرب میں گورے چہرے کو شعلہ آتش کہتے ہیں، فارسی میں بھی آتشیں رخسار ہے۔

آمنہ

عبداللہ قربانی سے بچ گئے تو عبدالمطلب کو ان کی شادی کی فکر ہوئی، قبیلہ زہرہ میں وہب بن عبد مناف کی صاحبزادی جن کا نام آمنہ تھا، قریش کے تمام خاندانوں میں ممتاز تھیں [2] وہ اس وقت اپنے چچا وہیب کے پاس رہتی تھیں، عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا، انہوں نے منظور کیا اور

[1] دیکھو زرقانی، جلد اول، ص: ۸۶۔ [2] سیرۃ ابن ہشام، (برحاشیہ زاد المعاد مصر، ج ۱، ص: ۸۵) (س)

عقد ہوگیا۔ اسی موقع پر خود عبدالمطلب نے بھی وہیب کی صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا، شادی کی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ انہی ہالہ کے بطن سے ہیں۔ ہالہ رشتہ سے آنحضرت ﷺ کی خالہ ہوئیں اور اس بنا پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔ دستور تھا کہ نوشاہ شادی کے بعد تین دن تک سسرال میں رہتا تھا، عبداللہ تین دن سسرال میں رہے اور پھر گھر چلے آئے اس وقت ان کی عمر تقریبا سترہ برس سے کچھ زیادہ تھی۔ [1] عبداللہ تجارت کے لئے شام کو گئے واپس آتے ہوئے مدینہ میں ٹھہرے اور بیمار ہو کر یہیں رہ گئے، عبدالمطلب کو یہ حال معلوم ہوا تو اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر لانے کے لئے بھیجا۔ وہ مدینہ میں پہنچے تو عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ محبوب تھے، تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔ عبداللہ نے ترکہ میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی جس کا نام ام ایمن رضی اللہ عنہا تھا، یہ سب چیزیں رسول اللہ ﷺ کو ترکہ میں ملیں' ام ایمن رضی اللہ عنہا کا اصلی نام برکہ تھا۔ [2]

---

[1] زرقانی، جلد اول، صفحہ: ۱۲۳ سطر ۷۔

[2] طبقات ابن سعد، جزء اول، قسم اول، صفحہ: ۶۲، (س)

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخِ نادرۂ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ولادت

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے۔ سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جان نواز کے لئے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنان قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابروباد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاسِ پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جان نوازی مسیح علیہم السلام سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں اور شہنشاہِ کونین ﷺ کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جان نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے، اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ ''آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہو گیا'' لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمان روائے عالم، شہنشاہِ کونین ﷺ

شمسۂ نہ مُسند، ہفت اختران	ختمِ رُسل خاتمِ پیغمبران
احمد ﷺ مرسل کہ خرد خاکِ اوست	ہر دو جہان بستۂ فتراکِ اوست
اُمی و گویا بہ زبان فصیح	از الفِ آدم ﷺ ومیمِ مسیح
رسمِ ترنج است کہ در روزگار	پیش دہد میوہ پس آرد بہار

عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت واجلال ہوئے۔ اللھم صل علیہ وعلی الہ واصحابہ وسلم۔

تاریخ ولادت

تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں

انہوں نے دلائل ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپ کی ولادت ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی۔ ❶

آپ کا نام ''محمد ﷺ'' رکھا گیا اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے یہ نام رکھا تھا۔

رضاعت

سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کو آپ کی والدہ نے اور دو تین روز کے بعد ثویبہ نے دودھ پلایا۔ (جو ابولہب کی لونڈی تھی)۔ ❷

حلیمہ سعدیہ

ثویبہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ کو دودھ پلایا، اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے رؤسا اور شرفا شیر خوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے، یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بچے بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے ❸ اور عرب کی خالص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں۔

شرفائے عرب نے مدت تک اس رسم کو محفوظ رکھا، یہاں تک کہ بنو امیہ نے دمشق میں پائے تخت قائم کیا اور شاہانہ شان و شوکت میں کسریٰ و قیصر کی ہمسری کی، تاہم ان کے بچے صحراؤں میں بدوؤں کے گھر میں پلتے تھے۔ ولید بن عبدالملک خاص اسباب سے نہ جا سکا اور حرم شاہی میں پلا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان بنی امیہ میں صرف ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا۔ ❹

غرض دستورِ مذکور کی بنا پر سال میں دو مرتبہ دیہات سے شہر میں عورتیں آیا کرتی تھیں اور شرفائے شہر اپنے شیر خوار بچوں کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ اس دستور کے موافق آنحضرت ﷺ کی ولادت کے

---

❶ محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحوں میں آیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے۔ (۱) صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ (آنحضرت ﷺ کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا، (ابواب الکسوف، باب الصلوۃ فی کسوف الشمس: ۱۰۴۳) اور ۱۰ھ تھا۔ (اور اس وقت آپ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا۔) (۲) ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱۰ھ کا) گرہن ۷ جنوری ۶۳۲ء ۸ بج کر ۳۰ منٹ پر لگا تھا۔ (۳) اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ۶۳ برس پیچھے ہٹیں تو آپ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء جس میں ازروئے قواعد ہیئت ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔ (۴) تاریخ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے۔ (۵) ربیع الاول مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تھی۔

❷ بخاری، کتاب النکاح، باب یحرم من الرضاعة مایحرم من النسب: ۵۱۰۱۔ (س) ❸ امام سہیلی نے یہ تفصیل یہ واقعات لکھے ہیں اور یہ حدیث بھی نقل کی ہے، کہ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ ''میں اس لیے فصیح ہوں کہ قبیلہ بنی سعد میں پلا ہوں۔'' (الروض الانف جلد اول، ص ۱۰۹ (س) سر ولیم میور صاحب لائف آف محمد ص ۷ مطبوعہ ایڈنبرا ۱۹۱۲ء میں لکھتے ہیں کہ ''محمد ﷺ کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی، ان کے اخلاق آزاد اور مستغنی عن الغیر تھے جس کی وجہ ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں بسر کرنا تھا اور اسی وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ کے موافق تھی۔ ❹ ابن اثیر، ج ۵، ص: ۶ طبع لیڈن، ۱۸۷۰ء (س)

چند روز بعد قبیلہ ہوازن کی چند عورتیں بچوں کی تلاش میں آئیں، ان میں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں [1] اتفاق سے ان کو کوئی بچہ ہاتھ نہیں آیا۔

آنحضرت ﷺ کی والدہ نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو ان کو خیال آیا کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی۔ لیکن خالی ہاتھ بھی نہ جا سکتی تھیں، اس لئے حضرت آمنہ کی درخواست قبول کی اور آنحضرت ﷺ کو لے کر گئیں، ان کی ایک صاحبزادی تھی، جن کا نام شیما تھا، ان کو آنحضرت ﷺ سے بہت انس تھا، وہی آپ کو کھلایا کرتی تھیں، دو برس کے بعد حلیمہ آپ کو مکہ میں لائیں اور آپ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کیا۔ چونکہ اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی، آپ کی والدہ نے فرمایا کہ واپس لے جاؤ۔ چنانچہ دوبارہ گھر میں لائیں، اس میں اختلاف ہے کہ آپ حضرت حلیمہ کے یہاں کتنے برس تک رہے، ابن اسحاق نے وثوق کے ساتھ ۶ برس لکھا ہے۔ [2]

ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے، ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں تم سب میں فصیح تر ہوں، کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے۔'' [3] بنی سعد ہوازن ہی کے قبیلہ کو کہتے ہیں۔

حضرت حلیمہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو بے انتہا محبت تھی، عہد نبوت میں جب وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ ''میری ماں، میری ماں'' کہہ کر لپٹ گئے، یہ دلچسپ واقعات آگے آئیں گے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت حلیمہ آنحضرت ﷺ کی نبوت سے پہلے وفات پا گئیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن ابی خیثمہ نے ''تاریخ'' میں، ابن جوزی نے ''حداء'' میں، منذری نے ''مختصر سنن ابی داؤد'' میں، ابن حجر نے ''اصابہ'' میں ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے، حافظ مغلطائی نے ان کے اسلام پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ''التحفة الجسيمة في اثبات اسلام حليمة'' ہے۔'' [4]

آنحضرت ﷺ کے رضاعی باپ حضرت حارث

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر یعنی آنحضرت ﷺ کے رضاعی باپ کا نام حارث بن عبدالعزیٰ ہے، وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں آئے اور اسلام لائے۔ [5]

حارث آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ یہ تم کیا کہتے ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں وہ دن آئے گا کہ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ میں سچ کہتا تھا۔'' حارث مسلمان ہو گئے۔

---

[1] سہیلی نے لکھا ہے کہ عرب میں دودھ پلانا اور اس کی اجرت لینا شریفانہ کام نہیں خیال کیا جاتا تھا، اسی بنا پر عرب میں مثل ہے: الحرة لا تاكل بثدييها اس بنا پر سہیلی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سال قحط پڑا تھا، اس لئے مجبوراً حضرت حلیمہ اور ان کے قبیلہ نے یہ خدمت گوارا کی تھی، (الروض الانف، ج ۱ ص: ۱۰۹) لیکن تمام تاریخوں میں ہے کہ مکہ میں ہر سال باہر سے عورتیں اس کام کے لئے آیا کرتی تھیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کام کو معیوب سمجھنا عرب کا عام خیال نہ تھا، یہ خیال اہل شہر اور امراء کے ساتھ مخصوص ہوگا۔

[2] علامہ زرقانی نے اموی کا یہی قول بتایا ہے۔ [3] طبقات ابن سعد، ج ۱ ص: ۷۱۔

[4] زرقانی، ج ۱، ص: ۱۶۶۔ [5] اصابه في تمييز الصحابة، ج ۱، ص: ۲۸۳، مطبوعه مصر مطبع سعادت۔

رضاعی بھائی بہن

آنحضرت ﷺ کے چار رضاعی بھائی بہن تھے، جن کے نام یہ ہیں، عبداللہ، انیسہ، حذیفہ اور حذافہ جو شیما کے لقب سے مشہور تھیں، ان میں سے عبداللہ اور شیما کا اسلام لانا ثابت ہے، باقیوں کا حال معلوم نہیں۔

مدینہ کا سفر اور حضرت آمنہ کی وفات

آنحضرت ﷺ کی عمر جب چھ برس کی ہوئی تو آپ کی والدہ آپ کو لے کر مدینہ گئیں، چونکہ آنحضرت ﷺ کے دادا کی ننہال خاندانِ نجار میں تھیں، وہیں ٹھہریں، اس سفر میں ام ایمن رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں جو آنحضرت ﷺ کی دایہ تھیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ کی والدہ اس ننہالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں، لیکن یہ رشتہ دور کا رشتہ تھا، قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے۔ میرے نزدیک بعض مؤرخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لئے گئی تھیں جو مدینہ میں مدفون تھے، بہرحال ایک مہینہ تک مدینہ میں مقیم رہیں، واپس آتے ہوئے جب مقام ابواء [1] میں پہنچیں تو ان کا انتقال ہوگیا اور یہیں مدفون ہوئیں، ام ایمن رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کو لے کر مکہ میں آئیں۔

رسول اللہ ﷺ کو قیام مدینہ کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں، جب آپ قیام مدینہ کے زمانہ میں ایک دفعہ بنوعدی کے منازل پر گزرے تو فرمایا کہ اسی مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں، یہی وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا، اسی میدان میں، میں انیسہ ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ [2]

عبدالمطلب کی کفالت

والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد عبدالمطلب نے آنحضرت ﷺ کو اپنے دامن تربیت میں لیا، ہمیشہ آپ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ [3]

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی اور حجون میں مدفون ہوئے، اس وقت آنحضرت ﷺ کی عمر آٹھ برس کی تھی، عبدالمطلب کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت ﷺ بھی ساتھ تھے اور فرط محبت سے روتے

[1] ایک گاؤں کا نام ہے جو جحفہ سے ۲۳ میل پر واقع ہے۔ (معجم البلدان، ج۱ص:۹۲) [2] طبقات ابن سعد قسم اول، ذکر وفات آمنہ ام رسول اللہ ﷺ جلد ۱ صفحہ ۷۳۔ [3] عبدالمطلب کا آنحضرت ﷺ کو عزیز رکھنا ایک مسلّم واقعہ ہے، لیکن مارگولیتھ صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارا نہیں، فرماتے ہیں کہ "یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی اور اخیر زندگی میں ان کے چچا حمزہ نے نشہ کی حالت میں محمد ﷺ کو طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا تھا۔" (لائف آف محمد ﷺ از مارگولیتھ، صفحہ: ۴۵ تا ۴۹) حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے جس قول سے استدلال کیا ہے، مارگولیتھ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نشہ کی حالت تھی، اس کی تفصیل جیسا کہ بخاری، کتاب المغازی، باب شهود الملائكة بدراً: ۴۰۰۳ میں ہے کہ بدر کے مال غنیمت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دو اونٹ ملے تھے اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شراب میں مخمور ادھر سے گزرے اور اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل اور جگر کا کباب بنایا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان کو ملامت کی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سخت مخمور تھے، اس حالت میں وہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے، کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے؟

جاتے تھے، عبدالمطلب نے مرنے کے وقت اپنے بیٹے ابو طالب کو آنحضرت ﷺ کی تربیت سپرد کی، ابوطالب نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا اس کی تفصیل آگے آتی ہے، یہ واقعہ خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عبدالمطلب کی موت نے بنو ہاشم کے رتبہ امتیاز کو دفعتہً گھٹا دیا اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنوامیہ کا خاندان بنو ہاشم پر غالب آ گیا، عبدالمطلب کی مسند ریاست پر اب حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصب ریاست میں سے صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا، جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

ابوطالب کی کفالت

عبدالمطلب کے دس بیٹے مختلف ازواج سے تھے، ان میں سے آنحضرت ﷺ کے والد عبداللہ اور ابو طالب ماں جائے بھائی تھے، اس لئے عبدالمطلب نے آنحضرت ﷺ کو ابو طالب ہی کے آغوش تربیت میں دیا، ابوطالب آنحضرت ﷺ سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی پروانہیں کرتے تھے، سوتے تو آنحضرت ﷺ کو ساتھ لے کر سوتے اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔

غالباً جب آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپ نے بکریاں چرائیں۔ فرانس کے ایک نامور مؤرخ نے لکھا ہے کہ ''ابوطالب چونکہ محمد ﷺ کو ذلیل رکھتے تھے، اس لئے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے''۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا، بڑے بڑے شرفا اور اُمرا کے بچے بکریاں چراتے تھے، خود قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٦) اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا، زمانہ رسالت میں آپ اس سادہ اور پرلطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم ''جھڑ بیریاں'' توڑ توڑ کر کھانے لگے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں، یہ میرا اس زمانہ کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا۔'' [1]

شام کا سفر

ابوطالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے۔ قریش کا دستور تھا، سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے

[1] طبقات ابن سعد۔ جلد اول، صفحہ:٨٠؛ بخاری نے کتاب الاجارة، باب رعی الغنم علی قراريط:٢٢٦٢ میں آنحضرت ﷺ کا قول نقل کیا ہے کہ ''میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا''۔ قراریط کے معنی میں اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے، اس بناپر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت ﷺ اجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے، اسی بناپر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارۃ میں نقل کیا ہے، لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے۔ ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے۔ (عینی، جلد٤، صفحہ:٦٣١) نور النبراس میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

شام کو جایا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ ابو طالب نے حسب دستور شام کا ارادہ کیا، سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت ﷺ کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ کو ابو طالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابو طالب چلنے لگے تو آپ ان سے لپٹ گئے، ابو طالب نے آپ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا، عام مؤرخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا، اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے، کہ جب ابو طالب بُصریٰ میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے جس کا نام بحیرا تھا، اس نے آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر کہا کہ "یہ سید المرسلین ہیں۔" لوگوں نے پوچھا: تم نے کیونکر جانا؟ اس نے کہا: جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لئے جھک گئے۔

بحیرا راہب کا قصہ

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے، تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سر ولیم میور، ڈریپر، مرگولوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتحِ عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے انہی پر آنحضرت ﷺ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔ [1]

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں بھی نہیں آ سکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیئے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا، تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت نا قابل اعتبار ہے۔ اس روایت کے جس قدر طریق ہیں، سب مرسل ہیں، یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے، اس کے متعلق تین باتیں قابلِ لحاظ ہیں:

---

[1] ڈریپر صاحب "معرکہ علم و مذہب" (تیسرا باب، ص:۱۰۷ اردو ترجمہ) میں لکھتے ہیں، "بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی..... آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا..... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا۔" سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے، کہ آنحضرت ﷺ کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا، وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے، لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا، تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینہ میں پیدا ہو سکتا جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے۔

① ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ ''حسن اور غریب ہے اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے۔'' [1] حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

② اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمان بن غزوان ہے، اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے، لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے، علامہ ذہبی، میزان الاعتدال (ج ۲،ص: ۱۱۳) میں لکھتے ہیں کہ ''عبدالرحمن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے، جن میں سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے۔''

③ حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ ''یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔'' علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ ''میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں۔'' [2]

④ اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلال اور ابوبکر رضی اللہ عنہما بھی اس سفر میں شریک تھے، حالانکہ اس وقت بلال کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بچے تھے۔

⑤ اس حدیث کے اخیر راوی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں، وہ شریک واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے، ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد [3] میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے، وہ مرسل یا معضل ہے یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں راوی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے اور جو روایت معضل ہے اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے۔

⑥ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن چونکہ حضرت ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما کی شرکت بداہتہً غلط ہے۔ اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں، عبدالرحمان بن غزوان کی نسبت خود انہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب (ج ۲،ص: ۴۲۸) میں لکھا ہے کہ ''وہ خطا کرتا تھا، اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے۔'' ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔ [4]

---

[1] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ما جاء فی بدء نبوة النبی ﷺ: ۳۶۲۰۔

[2] نبراس فی شرح عیون السیر لابن سیدالناس اور زرقانی، ج ۱، ص: ۲۲۷ اور میزان الاعتدال، ج ۲، ص: ۱۱۳ اور اصابہ (تذکرہ عبدالرحمٰن بن غزوان) مستدرک حاکم مع تلخیص، ج ۲، ص: ۵۱۶ (س)

[3] جزء اول، قسم اول، ص: ۷۵ (س)

[4] جامع نے بحیرا راہب کے قصہ کی مکمل تنقید سیرت النبی ﷺ جلد سوم باب ''مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت'' (ص: ۶۵۸ تا ۶۶۰ طبع جدید | وطبع ہذا ۲۰۱۲ء، ج ۳، ص: ۴۸۵ تا ۴۸۷]) میں کی ہے اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔ (س)

حرب فجار کی شرکت

عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا ہے، ان میں یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک ہے۔

یہ لڑائی قریش اور قیس قبیلہ میں ہوئی تھی۔ قریش کے تمام خاندانوں نے اس معرکہ میں اپنی اپنی الگ فوجیں قائم کی تھیں، آل ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے اور اسی صف میں جناب رسول اللہ ﷺ بھی شریک تھے، بڑے زور کا معرکہ ہوا، اول قیس، پھر قریش غالب آئے اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہوگیا، اس لڑائی میں قریش کا رئیس اور سپہ سالار اعظم حرب بن امیہ تھا، جو ابوسفیان کا باپ اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

چونکہ قریش اس جنگ میں برسر حق تھے اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بھی شرکت فرمائی، لیکن جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، [1] امام سہیلی نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود جنگ نہیں کی، ان کے الفاظ یہ ہیں:

وانما لم يقاتل رسول الله ﷺ مع اعمامه في الفجار وقد كان بلغ سن القتال لانها كانت حرب فجار وكانوا ايضًا كلهم كفارًا ولم ياذن الله تعالى لمؤمن ان يقاتل الا لتكون كلمة الله هي العليا۔ [2]

''اور آپ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی، حالانکہ آپ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی نیز یہ وجہ تھی کہ فریقین کافر تھے اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم صرف اس لئے خدا نے دیا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔''

اس لڑائی کو فجار اس لئے کہتے ہیں کہ ایام الحرام میں یعنی ان مہینوں میں پیش آئی تھی جن میں لڑنا ناجائز تھا۔

حلف الفضول

لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سینکڑوں گھرانے برباد کر دیے تھے اور قتل اور سفا کی موروثی اخلاق بن گئے تھے۔ یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس پھرے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ ﷺ کے چچا اور خاندان کے سرکردہ تھے یہ تجویز پیش کی چنانچہ خاندان ہاشم، زہرہ اور تیم عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ [3]

آنحضرت ﷺ اس معاہدہ میں شریک تھے اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ ''معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیے جاتے تو میں نہ بدلتا [4] اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لئے کوئی

[1] ابن هشام، ج ١، ص:١٢٤۔ [2] الروض الانف، ج ١، ص:٥٢١۔
[3] طبقات، ج ١، ص:٨٢۔ [4] مستدرك، ج ٢، ص: ٢٢٠(س)۔

بلائے تو میں حاضر ہوں''۔

اس معاہدہ کو حلف الفضول اس لئے کہتے ہیں کہ اول اول اس معاہدہ کا خیال جن لوگوں کو آیا، ان کے نام میں لفظ ''فضیلت'' کا مادہ داخل تھا۔ [1] یعنی فضیل بن حرث، فضیل بن وداعہ اور مفضل، یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلہ کے تھے۔ اگر چہ یہ معاہدہ بے کار گیا اور کسی کو یاد بھی نہ رہا، چنانچہ قریش نے نئے سرے سے بنیاد ڈالی، تاہم بانی اول کو نیک نیتی کا یہ ثمرہ ملا کہ ان کے نام کی یادگار اب تک باقی ہے۔

تعمیر کعبہ

کعبہ کی عمارت صرف قد آدم اونچی تھی اور دیواروں پر چھت نہ تھی جس طرح ہمارے ملک میں عیدگاہیں ہوتی ہیں، چونکہ عمارت نشیب میں تھی، بارش کے زمانہ میں شہر کا پانی حرم میں آتا تھا، اس کی روک کے لئے بالائی حصہ پر بند بنوادیا گیا تھا، لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا اور عمارت کو بار بار نقصان پہنچتا تھا، بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ موجودہ عمارت ڈھا کر نئے سرے سے زیادہ مستحکم بنائی جائے، حسن اتفاق یہ کہ جدہ کی بندرگاہ پر ایک تجارتی جہاز کنارہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا قریش کو خبر لگی تو ولید بن مغیرہ نے جدہ پہنچ کر جہاز کے تختے مول لے لئے، جہاز میں ایک رومی معمار تھا جس کا نام باقوم تھا، ولید اس کو ساتھ لایا اور تمام قریش نے مل کر تعمیر شروع کی مختلف قبائل نے عمارت کے مختلف حصے آپس میں تقسیم کر لئے تھے کہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے، لیکن جب حجر اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا پیدا ہوا، ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ خدمت اسی کے ہاتھ سے انجام پائے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں۔

عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبو لیتا تھا۔ اس موقع پر بھی بعض دعویداروں نے یہ رسم ادا کی، چار دن تک یہ جھگڑا برپا رہا، پانچویں دن ابوامیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر تھا رائے دی کہ کل صبح کو سب سے پہلے جو شخص آئے وہی ثالث قرار دے دیا جائے، سب نے یہ رائے تسلیم کی۔ دوسرے دن تمام قبائل کے معزز آدمی موقع پر پہنچے، کرشمۂ ربانی دیکھو کہ صبح کو سب سے پہلے لوگوں کی نظریں جس پر پڑیں وہ جمال جہاں تاب چہرہ محمدی ﷺ تھا، لیکن رحمت عالم نے قبول نہ کیا کہ اس شرف سے تنہا بہرہ ور ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو قبائل دعویدار ہیں سب کا ایک ایک سردار انتخاب کر لیا جائے۔'' آنحضرت ﷺ نے ایک چادر بچھا کر حجر اسود کو اس میں رکھ دیا اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تھام لیں اور اوپر کو اٹھائیں، جب چادر موقع کے برابر آگئی تو آپ نے حجرِ اسود کو اٹھا کر نصب فرما دیا۔ [2] یہ گویا اشارہ تھا کہ دینِ الٰہی کی عمارت کا آخری تکمیلی پتھر بھی

---

[1] لیکن امام سہیلی نے مسند حارث بن اسامہ سے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس معاہدہ میں یہ الفاظ تھے: (تردا لفضول علی اھلها) (الروض الانف، ج ۱، ص: ۹۱)۔

[2] مسند طیالسی، ج ۱، ص: ۱۸ و مستدرک حاکم، ج ۱، ص: ۴۵۸۔ (س)

انہیں ہاتھوں سے نصب ہوگا۔ [1]

اسی طرح ایک سخت لڑائی آپ کے حسنِ تدبیر سے رک گئی، کعبہ کی عمارت اب مسقف کردی گئی، لیکن چونکہ سامان تعمیر کافی نہ تھا، ایک طرف زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اور اس حصہ کے گرد چار دیواری کھینچ دی گئی کہ پھر موقع ہوگا تو کعبہ کے اندر لے لیں گے، یہی حصہ ہے جس کو آج حطیم کہتے ہیں اور جس کی نسبت آنحضرت ﷺ نے بعد نبوت ارادہ فرمایا تھا کہ دیوار ڈھا کر نئے سرے سے عمارت بنائی جائے لیکن پھر خیال ہوا کہ نئے نئے مسلمان ہیں، دیوار کعبہ کے ڈھانے سے بدگمان ہوجائیں گے۔ [2]

شغل تجارت [3]

عرب، خصوصاً قریش یعنی بنی اسمٰعیل، ظہور اسلام کے ہزاروں برس پہلے سے تجارت پیشہ تھے۔ [4] آنحضرت ﷺ کے جد اعلیٰ "ہاشم" نے قبائل عرب سے تجارتی معاہدے کرکے اس خاندانی طریقہ اکتساب کو اور زیادہ مستحکم اور باقاعدہ کردیا تھا، آنحضرت ﷺ کے چچا ابو طالب بھی تاجر تھے، اس بنا پر سن رشد کو پہنچنے کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو جب فکر معاش کی طرف توجہ ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا۔

ابو طالب کے ساتھ آپ بچپن میں بھی بعض تجارتی سفر کرچکے تھے، جس سے ہر قسم کا تجربہ حاصل ہوچکا تھا اور آپ کے حسن معاملہ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی، لوگ عموماً اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور امین شخص کے ہاتھ میں دے کر اس کے منافع میں شرکت کرلیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی خوشی کے ساتھ اس شرکت کو گوارا فرماتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کے شرکائے تجارت کی شہادتوں سے جو احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کس دیانت اور راست بازی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے۔

تاجر کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نادر مثال ایفائے عہد اور اتمام وعدہ کی ہوسکتی ہے، لیکن منصب نبوت سے پہلے مکہ کا تاجر امین اس اخلاقی نظیر کا بہترین نمونہ تھا، حضرت عبداللہ بن ابی الحمساء رضی اللہ عنہ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے آنحضرت ﷺ سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا، کچھ معاملہ ہوچکا تھا، کچھ باقی تھا، میں نے وعدہ کیا کہ پھر آؤں گا، اتفاق سے تین دن تک مجھ کو اپنا وعدہ یاد نہ

---

[1] یہ ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "میں نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوں"۔ یعنی مکمل مذہب اور خاتم الرسل ہوں۔ (س) دیکھئے صحیح بخاری، كتاب المناقب، باب خاتم النبيين: ٣٥٣٤-٣٥٣٥ وسنن ترمذي، ابواب الامثال، باب ما جآء في مثل النبي والانبياء: ٢٨٦٢۔ [2] یہ واقعات ابن ہشام، طبقات، طبری میں منفرد اور زرقانی جلد اول، صفحہ: ٢٣٦ تا ٢٤٠ میں مجتمعاً مذکور ہیں، اخیر کا واقعہ صحیح بخاری (كتاب الحج، باب فضل مكة وبنيانها: ١٥٨٣) میں بھی ہے، بخاری میں یہ بھی ہے کہ قریش جب کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو آنحضرت ﷺ بھی شریک تھے اور دوش مبارک پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے تھے۔ یہاں تک کہ شانے چھل گئے تھے۔ ایضاً: ١٥٨٢۔ [3] اضافہ وزیادہ۔

[4] توراۃ تکوین قصۂ یوسف علیہ السلام (باب: ٣٤ آیت: ١١، ص: ٥٦ مدرسہ آکسفورڈ ١٩٨٠ء)۔

آیا، تیسرے دن جب وعدہ گاہ پر پہنچا، تو آنحضرت ﷺ کو اسی جگہ منتظر پایا۔ لیکن اس خلاف وعدہ سے آپ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا، صرف اس قدر فرمایا کہ ''تم نے مجھے زحمت دی، میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں۔'' [1]

کاروبار تجارت میں ہمیشہ آپ اپنا معاملہ صاف رکھتے تھے۔ نبوت سے پہلے بھی جن لوگوں سے تجارت میں آپ کا سابقہ تھا وہ بھی اس کی شہادت دیتے تھے۔ سائب نامی ایک صحابی جب مسلمان ہو کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ تو لوگوں نے ان کی تعریف کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔'' سائب نے کہا، آپ پر میرے ماں باپ قربان، آپ میرے شریک تجارت تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔ فکنت لا تداری ولا تماری [2] قیس بن سائب مخزومی رضی اللہ عنہ ایک اور صحابی بھی آپ کے شریک تجارت تھے، وہ بھی انہی الفاظ کے ساتھ آپ کے حسن معاملہ کی شہادت دیتے ہیں۔ [3]

تجارت کی غرض سے آپ ﷺ نے شام و بصریٰ اور یمن کے متعدد سفر کئے تھے۔

تزویج خدیجہ

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک معزز خاتون تھیں۔ ان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں آنحضرت ﷺ کے خاندان سے ملتا ہے اور اس رشتہ کے لحاظ سے وہ آپ کی چچیری بہن تھیں۔ ان کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں، اب وہ بیوہ تھیں، چونکہ نہایت شریف النفس اور پاکیزہ اخلاق تھیں، جاہلیت میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے، نہایت دولت مند تھیں، طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب اہل مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا ان کا سامان تمام قریش کے برابر ہوتا تھا۔ [4]

جناب رسول اللہ ﷺ کی عمر اب پچیس برس کی ہو چکی تھی، متعدد قومی کاموں میں آپ ﷺ شریک ہو چکے تھے، تجارت کے کاروبار کے ذریعہ سے لوگوں کے ساتھ معاملات پیش آتے تھے، اس بنا پر آپ ﷺ کے حسن معاملہ، راست بازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاقی کی عام شہرت ہو چکی تھی، یہاں تک زبانِ خلق نے آپ کو امین کا لقب دے دیا تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان اسباب کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ ''آپ میرا مال تجارت لے کر شام کو جائیں، جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں آپ کو اس کا مضاعف دوں گی۔'' آنحضرت ﷺ نے قبول فرمایا اور مال تجارت لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔

واپس آنے کے تقریباً تین مہینہ کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا، ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے، عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی العدۃ: ٤٩٩٦۔ [2] ابو داود، کتاب الادب، باب فی کراھیۃ المراء: ٤٨٣٦۔ [3] اصابہ، (ج ٥، ص: ٣٥٣) ترجمۃ قیس بن سائب۔
[4] زرقانی، ج ١، ص: ٢٣١ پر اس کا ذکر ہے۔

شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کرسکتی تھیں اور اس میں بالغہ نابالغہ کی قید نہ تھی، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے چچا کے ہوتے ہوئے خود براہ راست تمام مراتب طے کیے۔ تاریخ معین پر ابوطالب اور تمام رؤسائے خاندان جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر آئے، ابوطالب نے خطبہ نکاح پڑھا اور پانچ سوطلائی درہم مہر قرار پایا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد زندہ تھے اور ان کی موجودگی میں نکاح ہوا، لیکن شراب میں مخمور تھے، جب ہوش میں آئے تو نکاح کا حال سن کے برہم ہوئے کہ یہ برابر کا جوڑ نہیں۔

لیکن یہ روایت صحیح نہیں، امام سہیلی نے بہ تصریح اور بدلیل ثابت کیا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد جنگ فجار سے قبل انتقال کر چکے تھے۔ [1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جس مکان میں رہتی تھیں، وہ آج بھی (حسب بیان مؤرخ طبری) انہیں کے نام سے مشہور ہے، امیر معاویہ نے اس مکان کو خرید کر مسجد بنا دیا۔ [2]

شادی کے وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس برس کی تھی اور پہلے دو شوہروں سے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں، ان کے نام اور مفصل حالات آگے آئیں گے۔ [3]

آنحضرت ﷺ کی جس قدر اولاد ہوئی، بجز حضرت ابراہیم کے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی کے بطن سے ہوئی، ان کے حالات آگے تفصیل سے آئیں گے۔

جستہ جستہ واقعات

یہ واقعات تھے جن میں تاریخی ترتیب معلوم ہے، اس لئے مسلسل لکھے گئے، ان امور کے سوا جستہ جستہ واقعات کا بھی پتہ لگتا ہے، چونکہ ان کے سنین اور تاریخیں غیر معلوم ہیں، اس لئے ان کو عام سلسلہ سے الگ یکجا لکھنا زیادہ موزوں ہوگا۔

حدودِ سفر

اہل مکہ عموماً تجارت کی غرض سے سفر کرنے کے عادی تھے، آنحضرت ﷺ نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کیے، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گزر چکا ہے، اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپ کا تشریف لے جانا ثابت ہے۔ عرب میں مختلف مقامات میں جو بازار قائم تھے ان میں سے حباشہ کا ذکر ابن سید الناس نے کیا ہے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جہاں جہاں آپ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا، ان میں جرش بھی

---

[1] الروض الانف، ج۱، ص:۱۲۲ وطبقات ابن سعد، الجزء الاول، القسم الاول، ص:۸۵۔

[2] تاریخ طبری، ج۳، ص:۱۱۳۰۔

[3] حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے واقعات ابن ہشام، ابن سعد وطبری میں باختلاف اجمال وتفصیل واثبات ونفی مذکور ہیں، میں نے قرائن سے جو روایت زیادہ قابل اعتبار پائی نقل کی ہے، یکجا تمام حالات دیکھنے ہوں تو زرقانی جلد اول صفحہ ۲۳۲ سے ۲۳۶ تک دیکھنا چاہیے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مکان کا ذکر صرف طبری، (ج۳، ص:۱۱۳۰) نے کیا ہے، ابن حنبل، (مسند ابن عباس، ج۱، ص:۳۱۲) میں بھی واقعات مذکور ہیں۔

ہے، جو یمن میں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپ ﷺ دو دفعہ تشریف لے گئے اور ہر دفعہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے معاوضہ میں ایک اونٹ دیا۔ ❶

نبوت کے بعد جس سال آپ ﷺ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے۔ ان میں جب بحرین سے عبدالقیس کا وفد آیا تو آپ ﷺ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی۔'' ❷ مؤرخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے۔ ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ ''آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا جس کی دلیل یہ ہے، کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی صحیح تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے۔'' ❸ مؤرخ مذکور کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپ مصر بھی تشریف لے گئے تھے اور ڈیڈسی (بحرمیت) کا بھی معائنہ کیا تھا، لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہے۔ ❹

مراسم شرک سے اجتناب

یہ قطعاً ثابت ہے کہ آپ بچپن اور شباب میں بھی جب کہ منصب پیغمبری سے ممتاز نہیں ہوئے تھے، مراسم شرک سے ہمیشہ مجتنب رہے۔

ایک دفعہ قریش نے آپ ﷺ کے سامنے کھانا لا کر رکھا، یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا، جانور جو ذبح کیا گیا تھا کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا، آپ ﷺ نے کھانے سے انکار کیا۔ ❺

نصاریٰ نے دعویٰ کیا ہے کہ آپ کے اعتقادات میں جو تغیر ہوا ہے وہ عہد نبوت سے ہوا ہے، ورنہ اس سے پہلے آپ ﷺ کا طرز عمل وہی تھا، جو آپ کے خاندان اور اہل شہر کا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے پہلے صاحبزادہ کا نام عبدالعزیٰ ❻ رکھا تھا اور یہ روایت خود امام بخاری کی تاریخ صغیر میں موجود ہے، ❼ لیکن یہ

---

❶ نور النبراس فی شرح ابن سید الناس۔ ❷ مسند امام احمد بن حنبل، ج ٤، ص: ٢٠٦ (س)

❸ مارگولیتھ، صفحہ ٥٧۔ ❹ یورپین مؤرخین جن کی بنیاد صرف قیاس ورائے پر ہوتی ہے، اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کا مصر جانا درحقیقت یورپ کے عہد مظلم کی مضحکہ انگیز روایت ہے۔ بحری سفر آپ نے یقیناً نہیں کیا، لیکن اگر بحرین تشریف لے جانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہوگا، بحرمیت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے کیونکہ اس کا موقع عرب و شام کے درمیان میں ہے، جہاں سے آپ کئی بار تجارت کے ساتھ گزرے ہوں گے۔ (س) ❺ صحیح بخاری، کتاب المناقب الانصار، حدیث زید بن عمرو بن نفیل: ٣٨٢٦ یہ حدیث امام بخاری نے اور ابواب میں بھی نقل کی ہے، اس کے الفاظ میں اجمال رہ گیا ہے، جو اس روایت میں صاف ہو گیا ہے، مسند امام ابن حنبل، ١٩٠ میں ایک روایت ہے جس میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے زید کو اس کھانے پر بلایا اور زید نے انکار کیا اور پھر آنحضرت ﷺ نے اس تاریخ سے کبھی بتوں پر ذبح کیا ہوا کھانا نہیں کھایا، لیکن اس روایت کے راویوں کا حال نہیں ملتا اور یوں بھی بخاری کے سامنے اس روایت کی کیا وقعت ہے۔ ❻ عزیٰ ایک بت کا نام تھا۔ ❼ ص: ٣۔

روایت اگر صحیح بھی ہوتو اس سے آنحضرت ﷺ کی نسبت کیونکر استدلال ہوسکتا ہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اسلام سے پہلے بت پرست تھیں، انہوں نے یہ نام رکھا ہوگا، آنحضرت ﷺ ابھی تک منصب ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے، اس لئے آپ ﷺ نے تعرض نہ فرمایا ہوگا اور اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت فی نفسہٖ بھی ثابت نہیں، اس روایت کا سب سے زیادہ صحیح سلسلہ وہ ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے، اس کا پہلا راوی اسمٰعیل ہے، جس کا پورا نام اسمٰعیل بن ابی اویس ہے، اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے، لیکن گروہ کثیر کی رائے حسب ذیل ہے: (ماخوذ از تہذیب التہذیب، ج۱، ص: ۳۱۰ تا ۳۱۲)

معاویہ بن صالح	اسماعیل اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔
یحیٰی بن مخلط	وہ جھوٹ بولتا ہے اور محض ہیچ ہے۔
امام نسائی	ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔
نصر بن سلمہ مروزی	وہ کذاب ہے۔
دارقطنی	میں اس کو صحیح روایت کے لئے پسند نہیں کرتا۔
سیف بن محمد	وہ جھوٹی حدیثیں بناتا ہے۔
سلمہ بن شیب	مجھ سے اس نے خود اقرار کیا کہ جب کبھی کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو میں ایک حدیث بنالیتا تھا

یہ امر واقعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کردی تھی اور جن لوگوں پر آپ کو اعتماد تھا، ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے۔ [1]

---

[1] (مستدرك حاكم، ج۳، ص: ۲۱۶ـ۲۱۷ ذكر زيد رضی اللہ عنہ بن حارثه) (س) مسٹر مارگولیتھ نے اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے اور اس کے ثبوت میں دعویٰ سے زیادہ تر حیرت انگیز فریب کاری کی ہے کہ ''آنحضرت ﷺ اور خدیجہ رضی اللہ عنہا دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کرلیا کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا۔''

مصنف موصوف نے اس کی سند میں امام احمد بن حنبل کی روایت (جلد۴ صفحہ ۲۲۲) پیش کی ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

حدثنی جار لخديجة بنت خويلد انه سمع النبی ﷺ وهو يقول لخديجة ای خديجة والله لا اعبد اللات والعزی والله لا اعبد ابدا قال فتقول خديجة خل اللات خل العزیٰ قال كانت صنمهم التی كانوا يعبدون ثم يضطجعون۔

''مجھ سے خدیجہ (بنت خویلد) کے ایک ہمسایہ نے بیان کیا کہ میں نے پیغمبر صاحب ﷺ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہ! بخدا میں کبھی لات اور عزیٰ کی پرستش نہ کروں گا، خدیجہ کہتی تھی کہ لات کو جانے دیجئے، عزیٰ کو جانے دیجئے (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے) اس نے کہا کہ لات وعزیٰ وہ بت تھے جس کی پرستش اہل عرب سونے سے پیشتر کرلیا کرتے تھے۔''

ایک معمولی عربی دان بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکور میں ''كانوا'' کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اہل عرب لات، عزیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے، اگر آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہوتا تو تثنیہ کا صیغہ ہوتا نہ کہ جمع کا، اس کے علاوہ خود اسی روایت میں لات وعزیٰ کی پرستش سے آنحضرت ﷺ کا سخت انکار کرنا مذکور ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

موحدین کی ملاقات

اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے فیض الٰہی کی خفیف شعاعیں عرب میں پھیلنی شروع ہوگئی تھیں، چنانچہ قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل نے بت پرستی سے انکار کردیا تھا [1] ان میں سے آنحضرت ﷺ نے زید سے ملاقات کی تھی، جس کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے، ورقہ عیسائی ہو گئے تھے اور چونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادر عم زاد تھے اور مکہ ہی میں رہتے تھے، اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ آپ ان سے بھی ملے ہوں گے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ان سے آپ کی دوستی تھی۔

ادب و محاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدہ نے عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا، آنحضرت ﷺ اس خطبہ میں شریک تھے، اس خطبہ کا بڑا حصہ اکثر اہل ادب نے نقل کیا ہے اور چونکہ اس کے فقرے بظاہر قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور مقفیٰ ہیں اس لئے عیسائی مؤرخین نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ طرز انہی سے لیا ہے، چنانچہ بعض فقرے یہ ہیں:

ایها الناس اسمعوا ووعوا واذا وعیتم فانتفعوا۔ انه من عاش مات۔ ومن مات فات وکل ماهواٰتٍ اٰت۔ مطر ونبات۔ وارزاق واقوات۔ و آباء وامهات۔ واحیاء واموات، وجمیع واشتات ان فی السماء لخبرا۔ وان فی الارض لعبرا، لیل داج۔ و سماء ذات ابراج وبحار ذات امواج۔ مالی اری الناس یذهبون فلا یرجعون۔ ارضوا بالمقام فاقاموا۔ ام ترکوا ههناك فناموا۔ این من بنی وشید۔ وزخرف ونجد وعدّ المال والولد۔ این من بغی وطغی۔

قس بن ساعدہ کی روایت اور اس کا خطبہ مختصر و مطول بہ عبارات مختلفہ۔ بغوی، ازدی، بیہقی، جاحظ وغیرہ نے نقل کیا ہے، لیکن وہ سرتاپا مصنوعی اور موضوع ہے، اس کے رواۃ عموماً ناقابل سند بلکہ کذاب ہیں، چنانچہ سیوطی نے موضوعات میں اس روایت کے تمام طریقوں کو نقل کر کے ان کے رواۃ سے بحث کی ہے اور علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ کے اقوال تفصیل سے نقل کئے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ یہ روایت مختلف طریقوں

(گزشتہ سے پیوستہ) مارگولیتھ صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی، لیکن صاحب موصوف نے اسکی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے (دیکھو مارگولیتھ کی کتاب صفحہ: ۶۸ تا ۷۰) معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے (لیکن اولاً تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے، ثانیاً یہ روایت) کلبی سے ہے، جو مشہور دروغ گو ہے۔

[1] ابن ہشام، ج ۱، ص: ۱۴۳ تا ۱۴۸ (نسخہ محمد علی صبیح) میں قس بن ساعدۃ کے سوا باقی سب لوگوں کے نام اور حالات مذکور ہیں، زید کا ذکر بخاری [کتاب المناقب، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل، ج ۱، ص: ۵۴۰] میں بھی ہے۔ قس کا ذکر نہایت کثرت سے تمام تاریخوں اور ادب کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

سے مروی ہے، لیکن ہر طریقہ میں کوئی نہ کوئی راوی ایسا ہے جو موضوع حدیثیں بنایا کرتا تھا، اس کا ایک مشترک راوی محمد بن حجاج ہے، اس کی نسبت ابن معین کا قول ہے کہ ''کذاب اور خبیث ہے۔'' ابن عدی نے لکھا ہے کہ ''ہریسہ کی حدیث اسی نے وضع کی ہے۔'' ایک طریقہ کا راوی سعید بن ہبیرہ ہے، اس کی نسبت ابن حبان نے لکھا ہے کہ ''ثقہ لوگوں کی زبانی جھوٹی حدیثیں روایت کرتا تھا، یا تو وہ خود یہ حدیثیں تصنیف کرتا تھا، یا اور لوگ اس کے لئے بنا دیا کرتے۔'' ایک طریقہ کے راوی قاسم بن عبداللہ اور احمد بن سعید ہیں اور یہ دونوں حدیث بنانے میں بدنام ہیں، بیہقی نے اس روایت کے متعلق ایک بڑا قصہ نقل کیا ہے جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قس بن ساعدہ کا پورا خطبہ اپنی یاد سے بیان کیا ہے، یہ روایت پوری کی پوری موضوع ہے۔ [1]
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے اور طریقے بھی نقل کئے ہیں اور ان کی تضعیف کی ہے۔ [2]

---

[1] یہ پوری تفصیل اللآلی المصنوعۃ، مطبوعہ مصر، صفحہ: ۹۵ تا صفحہ: ۱۰۰ میں ہے۔

[2] ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے بنوامیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے زمانہ کے شعرا اور فصحا سے اشعار اور خطبے تصنیف کراتے تھے اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعرا اور خطبا کے نام سے مشہور کرتے تھے۔ محمد بن اسحاق اس رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاری نے جزء القراءۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال، (مطبوعہ مصر، صفحہ: ۹۲) میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دے دیتے تھے۔ ان کے بارے میں اشعار کہہ دو ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے۔ ابن ہشام میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، ابوبکر، امیہ بن ابی الصلت، ابوطالب کے سینکڑوں اشعار نقل کئے ہیں، جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کر کے اکثر موقعوں پر لکھ دیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہران اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں، مثلاً سریہ عبیدۃ بن الحرث میں (ابن ہشام، جلد اول، صفحہ: ۳۶۰ مطبوعہ مصر) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

واكثر اهل العلم والشعر ينكر بهذه القصيدة لا بى بكر۔

''اور اکثر اہل علم اور فن شعر والے اس بات کے منکر ہیں کہ یہ قصیدہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔''

یہ وضاعی مختلف اغراض سے کی جاتی تھی، زیادہ اس وجہ سے کہ ان جلسوں یا شعروں میں آنحضرت ﷺ کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی یا اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے، مثلاً یہی قس بن ساعدہ کا خطبہ اس میں یہ فقرے بھی ہیں۔

نبيا قد حان حينه واظلكم اوانه فطوبى لمن امن به فهداه وويل لمن خالفه وعصاه (اللآلى المصنوعة، صفحه: ۲۸)

ایک پیغمبر کا زمانہ قریب آ گیا ہے سو اس کو مبارکی ہے جو اس پر ایمان لائے گا اور وہ اس کو ہدایت کرے گا اور تباہی ہے اس کے لئے جو اس کی مخالفت اور نافرمانی کرے گا۔''

ابوطالب کے نام سے جو لامیہ قصیدہ ابن ہشام وغیرہ نے نقل کیا ہے (ابن ہشام، جلد ا، صفحہ: ۱۶۷، ۱۷۷) سرتاپا موضوع ہے اس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں:

فاصبح فينا احمد فى ارومه تقصر عنه سورة المتطاول
فايده رب العباد بنصره واظهر دينا حقه غير باطل

(اس قصیدہ کو سرتاپا موضوع کہنے کے بجائے جیسا کہ مصنف نے کہا ہے اکثر کہنا صحیح ہے کیونکہ اس کے دو شعر صحاح میں بھی مذکور ہیں مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الاستسقاء (مگر صحیح بخاری: ۱۰۰۸، و سنن ابن ماجه، باب الاستسقاء: ۱۲۷۲، اور مسند احمد، ج ۱، ص: ۷ و ج ۲، ص: ۹۳ میں ایک ہی شعر مذکور ہے اور صحیح مسلم میں وہ بھی نہیں ہے) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

احباب خاص

نبوت سے پہلے جو لوگ آپ کے احباب خاص تھے۔ سب نہایت پاکیزہ اخلاق، بلند رتبہ اور عالی منزلت تھے، ان میں سب سے مقدم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، جو برسوں آپ کے شریک صحبت رہے۔ ❶

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچیرے بھائی حکیم بن حزام جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے۔ وہ بھی احباب خاص میں تھے، حرم کا منصب رفادہ انہی کے ہاتھ میں تھا، دارالندوہ کے بھی یہی مالک تھے۔ چنانچہ اسلام کے بعد امیر معاویہ کے ہاتھ ایک لاکھ درہم پر بیچ ڈالا۔ لیکن یہ کل رقم خیرات کر دی، آنحضرت ﷺ سے عمر میں ۵ برس بڑے تھے۔ ❷

اگرچہ یہ مدت تک یعنی ہجرت کے آٹھویں سال تک ایمان نہیں لائے، لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت ﷺ سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کعبہ میں ذویزن کا اسباب نیلام ہوا تھا، اس میں ایک عمدہ حلہ تھا، انہوں نے پچاس اشرفیوں میں اس کو خریدا اور مدینہ لے کر آئے کہ آنحضرت ﷺ کو نذر کریں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں مشرکوں کا ہدیہ قبول نہیں کرتا، البتہ قیمت لو تو لے سکتا ہوں۔'' مجبور ہو کر انہوں نے قیمت لینی گوارا کی اور آنحضرت ﷺ نے اس کو لے لیا۔ ❸

حضرت ضماد بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ جو ازد کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں طبابت اور جراحی کا پیشہ کرتے تھے، یہ

(گزشتہ سے پیوستہ) خود ابن اسحاق نے اس قصیدہ کو نقل کر کے لکھا ہے وبعض اهل العلم بالشعر ينكر اكثرها، یعنی بعض ماہرین شعر اس کے اکثر اشعار کی صحت سے انکار کرتے ہیں (س)۔ اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں، ان کے مطابق اشعار تصنیف کراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی۔ امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان کو دیکھ کر صاف یقین ہو جاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں، مثلاً:

فقلت له اذهب بهارون فادعوا ... الى الله فرعون الذى كان طاغيا

وقولا لها انت رفعت هذه ... بلا عمد ارفق اذابك بانيا

وقولا لها انت سويت وسطها ... منيرًا اذا ما جنه الليل هاديا

ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگولیتھ نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں: ''قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے۔'' (صفحہ ۶۲ تا صفحہ ۶۳) ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا، آج یورپ والے اسی سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطبا اور شعرا سے معتقدات اور خیالات بلکہ طرز ادا تک اخذ کرتے تھے، لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لئے ابھی ایک زمانہ درکار ہے اور جب وہ زمانہ آئے گا تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی۔

❶ اصابه ذكر ابى بكر رضی اللہ عنہ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ تھا، اصابہ میں اسی نام کے ذیل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حال لکھا ہے (جلد ۲، ص: ۳۴۱) (س)

❷ اصابه ذكر حكيم بن حزام، (ج ۱، ص: ۳٤۹)، (س)

❸ مسند امام ابن حنبل، ج ۳، ص: ٤۰۳۔

بھی احباب خاص میں سے تھے۔ نبوت کے زمانہ میں یہ مکہ آئے، آنحضرت ﷺ کو اس حالت میں دیکھا کہ راستہ میں جا رہے ہیں اور پیچھے لونڈوں کا غول ہے، مکہ کے کفار آنحضرت ﷺ کو مجنوں کہتے تھے، لونڈوں کا غول دیکھ کر ضماد نے یہی قیاس کیا اور آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا، محمد (ﷺ)! میں جنون کا علاج کر سکتا ہوں، آپ نے حمد وثنا کے بعد چند مؤثر جملے ادا کیے، ضماد مسلمان ہو گئے۔ اس واقعہ کو مختصراً مسلم ونسائی [1] نے بھی لکھا ہے، لیکن زیادہ تفصیل مسند امام احمد بن حنبل (جلد ا۔ صفحہ ۳۰۲) میں ہے۔

جو لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تجارت کے کاروبار میں شریک تھے، ان میں سے ایک صاحب قیس بن سائب مخزومی تھے۔ مجاہد بن جبیر جو مشہور مفسر گزرے ہیں، انہی کے غلام تھے، ان کا بیان ہے کہ شرکا کے ساتھ آپ کا معاملہ نہایت صاف رہتا تھا اور کبھی کوئی جھگڑا یا مناقشہ پیش نہیں آتا تھا۔ [2]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلاة والخطبة:۲۰۰۸؛ سنن النسائی، کتاب النکاح، ما یستحب من الکلام عند النکاح:۳۲۸۰۔

[2] استیعاب، ج ۲، ص: ۵۳۷ واصابه (س) (ج۵، ص:۲۵۳)

آفتاب رسالت ﷺ کا طلوع

رسول اللہ ﷺ جس زمانہ میں پیدا ہوئے مکہ بت پرستی کا مرکز اعظم تھا، خود کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے، رسول اللہ ﷺ کے خاندان کا تمغۂ امتیاز صرف اس قدر تھا کہ اس صنم کدہ کے متولی اور کلید بردار تھے، بایں ہمہ آنحضرت ﷺ نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا، دیگر رسوم جاہلیت میں بھی کبھی شرکت نہیں کی، قریش نے اس بنا پر کہ ان کو عام لوگوں سے ہر بات میں ممتاز رہنا چاہیے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ ایام حج میں قریش کے لئے عرفات جانا ضروری نہیں اور یہ کہ جو لوگ باہر سے آئیں، وہ قریش کا لباس اختیار کریں، ورنہ ان کو عریاں ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ہوگا۔ ❶ چنانچہ اسی بنا پر طواف عریاں کا عام رواج ہو گیا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان باتوں میں کبھی اپنے خاندان کا ساتھ نہ دیا۔ ❷

عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا۔ راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا، داستان شروع کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق وشوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا، لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے، وہیں نیند آ گئی، اٹھے تو صبح ہو چکی تھی۔ ❸ ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا، اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا، چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا لیکن دونوں دفعہ توفیق الٰہی نے بچا لیا کہ ''تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے۔'' ❹

یہ فطرت سلیم اور نیک سرشتی کا اقتضا تھا، لیکن ایک شریعت کبریٰ کی تاسیس، ایک مذہب کامل کی تشیید اور راہنمائی کونین کے منصب عظیم کے لئے کچھ اور درکار تھا، اسی زمانہ کے قریب میں اور حق پرستوں (ورقہ، زید، عثمان بن حویرث) کے دل میں خیال آیا کہ جماد لایعقل کے آگے سر جھکانا حماقت ہے، چنانچہ سب مذہب حق کی تلاش کے لئے نکلے، لیکن ناکامی کی دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر رہ گئے۔ ورقہ اور عثمان عیسائی ہو گئے اور زید یہ کہتے کہتے مر گئے ''اے خدا! اگر مجھ کو یہ معلوم ہوتا کہ تجھ کو کس طریقہ سے پوجنا چاہیے تو میں اسی طریقہ سے تجھ کو پوجتا۔'' ❺

آنحضرت ﷺ کے بہت سے دنیاوی تعلقات تھے، تجارت کا کاروبار تھا، متعدد اولادیں تھیں، تجارت کی ضرورت سے اکثر سفر کرنا پڑتا تھا، لیکن دست قدرت کو جو کام لینا تھا، وہ ان تمام مشاغل سے بالاتر تھا۔ دنیا اور دنیا کے تمام کام آپ کو ہیچ نظر آتے تھے، تاہم مطلوب حقیقی کا اب تک پتہ نہ تھا۔

---

❶ ابن هشام، مطبوعه مصر ۱۲۹۵ھ جلد ۱، ص: ٦٧۔ ❷ ابن هشام، ص: ٦٩۔ ❸ بزار ومستدرك بحواله نسيم الرياض، ج ۱، ص: ٦٠٩ وخصائص الكبرىٰ سيوطى، ج ۱، ص: ۸۸ حيدر آباد: ۱۳۱۹ھ (س)۔

❹ سر ولیم میور صاحب ''لائف آف محمد ﷺ'' میں لکھتے ہیں: ہماری تمام تصنیفات محمد ﷺ کے بارہ میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کمیاب تھی، متفق ہیں۔

❺ سیرت ابن هشام، ج ۱، ص: ۱٤٤، مطبعه محمد على صبيح مصر۔

مکہ معظمہ سے تین میل پر ایک غار تھا، جس کو حرا کہتے ہیں، آپ مہینوں وہاں جا کر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے، کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے، وہ ختم ہو چکتا تو پھر گھر پر تشریف لاتے اور پھر واپس جا کر مراقبہ میں مصروف ہوتے۔

صحیح بخاری [1] میں ہے کہ غار حرا میں آپ ﷺ تحنث یعنی عبادت کیا کرتے تھے، یہ عبادت کیا تھی؟ عینی شرح بخاری (ج ۱ص: ۴۷) میں ہے:

قیل ماکان صفة تعبده اجیب بان ذلك كان بالتفكر والاعتبار۔

''یہ سوال کیا گیا کہ آپ ﷺ کی عبادت کیا تھی؟ جواب یہ ہے کہ غور وفکر اور عبرت پذیری۔''

یہ وہی عبادت تھی جو آپ ﷺ کے دادا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کی تھی۔ ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکا ہوا، چاند نکلا تو اور بھی شبہ ہوا، آفتاب پر اس سے زیادہ، لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بے ساختہ پکار اٹھے:

﴿ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ...... اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ﴾.

(٦/ الانعام: ٧٧ تا ٨٠)

''میں فانی چیزوں کو نہیں چاہتا...... میں اپنا منہ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے زمین وآسمان پیدا کیا۔''

ایک مغربی مؤرخ نے آنحضرت ﷺ کی اس عبادت کی کیفیت اس طرح ادا کی ہے:

''سفر وحضر میں ہر جگہ محمد ﷺ کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے، میں کیا ہوں؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں؟ کیا کوہ حرا کی چٹانیں، کوہ طور کی سر بفلک چوٹیاں، کھنڈر اور میدان، کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا، نہیں ہرگز نہیں! بلکہ گنبد گرداں، گردش لیل ونہار، چمکتے ہوئے ستارے، برستے ہوئے بادل، کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔'' [2]

نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ خواب میں آپ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے، جو کچھ آپ ﷺ خواب میں دیکھتے تھے بعینہ وہی پیش آتا تھا، [3] ایک دن جب کہ آپ حسب معمول غار حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے، فرشتۂ غیب نظر آیا کہ آپ سے کہہ رہا ہے:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۭ ﴾. (٩٦/ العلق: ١ تا ٥)

---

[1] باب کیف کان بدء الوحی: ۳۔ [2] کارلائل ہیروز، تذکرہ رسول اللہ ﷺ۔ [3] وحی کے انواع میں سے ایک خواب بھی ہے، صحیح بخاری کے شروع میں ہے: اول ما بدء به رسول اللہ ﷺ من الوحی الرؤیا الصالحة فی النوم (۳) و کتاب التعبیر، باب اول مابدئ به رسول اللہ ﷺ من الوحی: ٦٩٨٢۔ میں زیادہ صاف طریقہ پر یہ مسئلہ ادا کیا گیا ہے۔

”پڑھ اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا، جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ تیرا خدا کریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔“

آپ گھر تشریف لائے تو جلال الٰہی سے لبریز تھے۔ [1]

آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تمام واقعہ بیان کیا، وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو عبری زبان جانتے تھے اور توریت وانجیل کے ماہر تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے واقعہ کی کیفیت سنی تو کہا یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا۔

روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ڈر پیدا ہوا! حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ”آپ متردد نہ ہوں، خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا“ پھر وہ آپ کو ورقہ کے پاس لے گئیں، انہوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی۔

آنحضرت ﷺ کی زبان سے بے شبہ یہ الفاظ نکلے ”مجھ کو ڈر ہے“ لیکن یہ تردد، یہ ہیبت، یہ اضطراب، جلال الٰہی کا تاثر (اور نبوت کے بارگراں کی عظمت کا تخیل تھا) آپ نے کیا دیکھا؟ ناموسِ اعظم نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں۔

صحیح بخاری، کتاب التعبیر [2] میں ہے کہ چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرادیں، دفعتہ حضرت جبریل علیہ السلام نظر آتے تھے اور کہتے تھے: ”اے محمد (ﷺ) تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو۔“ اس سے آپ ﷺ کو اس وقت تسکین ہو جاتی تھی لیکن جب پھر وحی کچھ دنوں کے لئے رک جاتی تھی تو پھر آپ ﷺ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرادینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے حصہ اول کی شرح میں معترضین کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ ”ایک پیغمبر کو نبوت میں کیونکر شک ہو سکتا ہے اور ہو تو کسی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین ہو سکتی ہے“۔ پھر ایک مشہور محدث کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ ”نبوت ایک امر عظیم ہے، اس کا تحمل دفعتہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے پہلے آنحضرت ﷺ کو خواب کے ذریعہ سے مانوس کیا گیا، پھر جب دفعتہ فرشتہ نظر آیا تو آپ اقتضائے بشریت سے خوف زدہ ہو گئے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو تسکین دی، پھر جب ورقہ نے تصدیق کی تو

---

[1] صحیح بخاری، باب بدء الوحی:۳۔

[2] صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب اول مابدئ به رسول الله ﷺ من الوحی: ٦٩٨٢، یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھیں، محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں، لیکن صحابہ کا مرسل محدثین کے نزدیک قابل حجت ہے کیونکہ متروک راوی بھی صحابہ ہی ہوں گے۔ (رضی اللہ عنہم)

آپ کو پورا یقین ہو گیا، محدث مذکور کے الفاظ یہ ہیں:

فلما سمع كلامه ايقن بالحق واعترف به.

''جب آپ ﷺ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپ کو حق کا یقین آ گیا اور آپ نے اس کا اعتراف کیا۔''

محدث مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''وحی بار بار اس لئے رک جاتی تھی کہ آپ رفتہ رفتہ اس کے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔'' ❶

لیکن جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ ''نبوت سے پہلے سفر شام میں (بمقام بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے تھے اس کی تمام شاخیں آپ پر جھک آئیں جس سے بحیرا نے آپ کے نبی ہونے کا یقین کیا۔'' ❷ جبکہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ''میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔'' ❸ جب کہ صحاح میں موجود ہے کہ ''نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلائش نکال کر پھینک دی۔'' ❹ تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپ اس قدر خوفزدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا اور آپ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے اور بار بار حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی تھی، کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخت سے آواز سنی ''کہ میں خدا ہوں'' تو کیا ان کو کوئی شبہ پیدا ہوا؟

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں، ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ خود اصل روایت بہ سند مرفوع متصل ہے، یا نہیں، یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے، یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، چنانچہ خود شارحین بخاری نے تصریح کر دی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لئے سند مقطوع کافی نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب فرض نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں، اگر آپ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغِ دعوت پر اکتفا فرمائیں، یا حضرت کلیم علیہ السلام کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں، تو مشکل نہ تھی۔ لیکن خاتمِ انبیا ﷺ کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغِ اسلام سے منور کر دینا تھا اس لئے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا

❶ فتح الباری، شرح صحیح بخاری، کتاب التعبیر، جلد ۱۲، صفحہ: ۳۱۷۔ مطبوعہ مصر۔

❷ ابواب المناقب، باب ماجاء في بدء نبوة النبي ﷺ: ۳۶۲۰۔

❸ کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبي ﷺ وتسليم الحجر عليه قبل النبوة: ۵۹۳۹۔

❹ ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ الم نشرح: ۳۳٤٦۔

مرحلہ یہ تھا کہ یہ پرخطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس کے لئے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جا سکتے تھے جو فیض یاب صحبت رہ چکے تھے، جن کو آپ ﷺ کے اخلاق و عادات کی تمام حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپ کے صدق دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے، یہ لوگ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کی حرم محترم تھیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، جو آپ کی آغوش تربیت میں پلے تھے، زید رضی اللہ عنہ تھے، جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور بندۂ خاص تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ [1] تھے جو برسوں سے فیضیاب خدمت تھے۔ سب سے پہلے آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یہ پیغام سنایا وہ سننے سے پہلے مومن تھیں، پھر اور بزرگوں کی باری آئی اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دولت مند، ماہر انساب، صاحب الرائے اور فیاض تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، [2] غرض ان اوصاف کی وجہ سے مکہ میں ان کا عام اثر تھا اور معززین شہر ان سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے، ارباب روایت کا بیان ہے کہ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص فاتح ایران، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم سب انہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے۔ [3] ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگوں میں بھی پھیلا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ان سابقین اولین میں عمار، خباب بن الارت، حضرت عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص طلحہ، ارقم، سعید بن زید، عبداللہ بن مسعود، عثمان بن مظعون، عبیدہ اور صہیب رومی رضی اللہ عنہم زیادہ ممتاز ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا۔ نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمان خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے، جب نماز کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے۔ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ چاشت کی نماز آپ حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی۔ [4] ایک دفعہ آپ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے آپ کے چچا ابوطالب آ نکلے، ان کو اس جدید طریقہ عبادت پر تعجب ہوا، کھڑے ہو گئے اور بغور دیکھتے رہے، نماز کے بعد پوچھا کہ یہ کون سا دین ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے دادا ابراہیم علیہ السلام کا یہی دین تھا۔'' ابوطالب نے کہا: میں اس کو اختیار تو نہیں کر سکتا لیکن تم کو اجازت ہے اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہو سکے گا۔ [5]

یہ تاریخ اسلام کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیونکر پھیلا؟ مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی، لیکن ایک خاص پہلو پر یہیں نگاہ ڈال لینی

---

[1] اصابہ فی تمییز الصحابۃ میں بزرگانِ موصوف کا تذکرہ ملاحظہ کرنا چاہیے۔ [2] الجزء الثالث، القسم الاول فی البدریین من المهاجرین، ص:۱۲۲۔ [3] دیکھو ریاض النضرۃ لمحب الطبری، مطبوعہ مصر، ص: ۱۵۷۔

[4] کامل ابن اثیر، ج ۲، ص: ۲۱ مطبوعہ مصر ذکر الاختلاف فی اول من اسلم (س)

[5] مسند احمد، ج ۱، ص: ۹۹ واصابہ، ج ۷، ص: ۱۱۲۔

چاہیے، یعنی یہ کہ اوائل اسلام میں جب کہ اسلام لانا جان و مال سے ہاتھ دھونا تھا، کون لوگ اور کس قسم کے لوگ ایمان لائے؟

اس زمانہ میں جو لوگ اسلام لائے، ان میں چند خصائص مشترک تھے، اسی قسم کے (لیکن بالعکس) مشترک خصائص ان لوگوں میں بھی پائے جاتے تھے، جنہوں نے شدت سے مخالفت کی، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے:

① اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاشِ حق میں سرگرداں اور فطرۃً نیک طبع اور پاکیزہ اخلاق تھے۔ مثلاً: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جاہلیت میں بھی عفیف، پارسا اور صدق و دیانت میں مشہور تھے۔ عثمان بن مظعون صوفی مزاج تھے اور اسلام سے پہلے شراب چھوڑ چکے تھے۔ اسلام کے بعد چاہتے تھے کہ راہب بن جائیں لیکن آنحضرت ﷺ نے روکا۔ صہیب رضی اللہ عنہ عبداللہ بن جدعان کے تربیت یافتہ تھے جو اسلام سے پہلے تارکِ شراب ہو کر وفات پا چکے تھے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جن کا اسلام لانے والوں میں چھٹا یا ساتواں نمبر تھا، ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے بت پرستی چھوڑ چکے تھے اور غیر متعین طریقہ سے جس طرح ان کے ذہن میں آتا تھا، خدا کا نام لیتے تھے اور نماز پڑھتے تھے، جب آنحضرت ﷺ کا حال سنا تو اپنے بھائی کو بھیجا کہ صحیح خبر لائیں، وہ مکہ میں آئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن مجید کی سورتیں سنیں واپس جا کر ابوذر سے کہا کہ "میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کو لوگ مرتد کہتے ہیں۔ وہ مکارم اخلاق سکھاتا ہے اور جو کلام سناتا ہے وہ شعر نہیں کوئی اور چیز ہے، تمہارا طریقہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔" ابوذر رضی اللہ عنہ کو تسکین نہیں ہوئی اور خود مکہ آئے زبان مبارک سے آپ ﷺ کا کلام سنا اور اسلام قبول کیا۔ وہ تمام عمر دنیاوی تعلقات سے الگ رہے، ان کا عقیدہ تھا کہ جو شخص زر و مال جمع کرتا ہے وہ مسلمان نہیں۔ چنانچہ اس بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں ان کو مدینہ سے دور بھیج دیا تھا۔ [1]

② بعض صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے، یعنی وہ لوگ جو زمانۂ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیرو کہتے تھے، لیکن اس اجمالی اعتقاد کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے اور اس لئے تلاشِ حق میں سرگرداں تھے۔ انہی میں زید بھی تھے، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، انہوں نے تو آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پانچ برس پہلے وفات پائی، لیکن ان کے صاحبزادے سعید موجود تھے۔ وہ باپ کے ارشادات سن چکے تھے، آنحضرت ﷺ سے ملے تو ان کو وہ راہنما ہاتھ آ گیا جس کی

---

[1] حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے لیکن باہم اختلاف ہے، میں نے دونوں سے کچھ کچھ لیا ہے لیکن اختصار کے لحاظ سے بہت سی باتیں چھوڑ دیں۔ (بخاری میں دو جگہ کتاب المناقب، باب قصة زمزم: ۳۵۲۲ اور باب بنیان الکعبة، باب اسلام ابی ذر: ۳۸۶۱ اور صحیح مسلم، باب من فضائل ابی ذر: ۶۳۵۹۔۶۳۶۲)

جستجو میں ان کے باپ دنیا سے چلے گئے اور وہ اب تک سرگشتہ تھے۔

③ یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصب اعظم میں سے کوئی منصب نہیں رکھتے تھے، بلکہ اکثر ایسے تھے، مثلاً: عمار، خباب، ابوفکیہ، صہیب رضی اللہ عنہم وغیرہ جن کو دولت و جاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان لوگوں کو لے کر حرم میں جاتے تو رؤسائے قریش ہنس کر کہتے:

﴿ أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا ﴾ (٦/ الانعام:٥٣)

''یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔''

کفار کے نزدیک ان کا افلاس ان کی تحقیر کا سبب تھا، لیکن یہی چیز تھی جس کی وجہ سے ایمان کی دولت سب سے پہلے ان ہی کے ہاتھ آ سکتی تھی، دولت و مال ان کے دلوں کو سیاہ نہیں کر چکا تھا۔ فخر و غرور ان کو انقیاد حق سے روک نہیں سکتا تھا۔ ان کو یہ ڈر نہ تھا کہ اگر بت پرستی چھوڑ دیں گے تو کعبہ کا کوئی منصب عظیم ہاتھ سے جاتا رہے گا، غرض ان کے دل ہر قسم کے زنگ سے پاک تھے اور حق کی شعاعیں ان پر دفعتہً پرتو افگن ہو سکتی تھیں، یہی سبب ہے کہ انبیا کے ابتدائی پیرو کار ہمیشہ نادار اور مفلس لوگ ہوتے تھے۔ عیسائیت کے ارکان اولین ماہی گیر تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مقربین خاص کی نسبت کفار کو علانیہ کہنا پڑا:

﴿ وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ﴾. (١١/ هود:٢٧)

''اور ہم تو بظاہر یہ دیکھتے ہیں کہ تیری پیروی انہی لوگوں نے کی جو رذیل ہیں اور ہم تو تم میں کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو۔''

یہ سابقین اسلام جس قسم کا راسخ ایمان لائے تھے اس کی تفصیل آگے آتی ہے جس سے ظاہر ہوگا کہ قریش کی سخت خونخواریاں، جور و ظلم کے شدائد، دولت و مال کی انتہائی ترغیبیں، کوئی چیز ان کو متزلزل نہ کر سکی اور آخر انہی کمزور ہاتھوں نے قیصر و کسریٰ کا تخت الٹ دیا۔

تین برس تک آنحضرت ﷺ نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتاب رسالت بلند ہو چکا تھا، صاف حکم آیا:

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ ﴾ (١٥/ الحجر:٩٤) ''اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے۔''

اور نیز حکم آیا: ﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢١٤)

''اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا۔''

آنحضرت ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر پکارا: یا معشر القریش! لوگ جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے، تو تم کو یقین آئے گا؟'' سب نے

کہا: ”ہاں۔ کیونکہ تم کو ہمیشہ سے ہم نے سچ بولتے دیکھا ہے“۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا“۔ یہ سن کر سب لوگ جن میں ابولہب آپ کا چچا بھی تھا سخت برہم ہوکر واپس چلے گئے۔ ❶

چند روز کے بعد آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو۔ یہ درحقیقت تبلیغ اسلام کا پہلا موقعہ تھا، تمام خاندان عبدالمطلب مدعو کیا گیا، حمزہ، ابو طالب، عباس سب شریک تھے، آنحضرت ﷺ نے کھانے کے بعد کھڑے ہوکر فرمایا کہ ”میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے، اس بارگراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا۔“ تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعتہً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر کہا: ”گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں، تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔“ ❷

قریش کے لئے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص (جن میں ایک سیزدہ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں، حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آ گئی لیکن آگے چل کر زمانے نے بتایا کہ یہ سراپا سچ تھا۔

اب مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت تیار ہوگئی تھی جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی، آپ نے حرم کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا۔ کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی، اس لئے دفعتہً ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور ہر طرف سے لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے، آنحضرت ﷺ کے ربیب حضرت حارث بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ گھر میں تھے، ان کو خبر ہوئی، دوڑتے ہوئے آئے اور آنحضرت ﷺ کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہو گئے، اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی۔ ❸

قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب

مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی۔ قریش کا خاندان جو تمام عرب پر مذہبی حکومت رکھتا تھا اور جس کی وجہ سے وہ ہمسائگان خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندانِ الٰہی کہلاتے تھے۔ اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور اور کلید بردار تھے، اس تعلق سے قریش کا کاروبار زیادہ پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ متعدد محکمے اور بڑے بڑے مناصب قائم کئے گئے۔ جن کی تفصیل یہ ہے: ❹

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب وانذر عشیرتك الاقربین: ٤٧٧٠۔

❷ طبری نے تاریخ جلد ۳، ص: ۱۷۱ اور تفسیر جلد ۱۹، ص: ۶۸ میں عبدالغفار بن قاسم اور منہال بن عمرو کے واسطہ سے اس کو روایت کیا ہے۔ پہلا شیعی اور متروک ہے اور دوسرا بدمذہب۔ اس روایت میں اور بھی وجوہ ضعف بلکہ وجوہ وضع ہیں (س)

❸ اصابه فی تمییز الصحابة ذکر حارث بن ابی هالة، (ج ۱، ص: ۳۰۶)۔

❹ یہ تمام تفصیل عقد الفرید، جلد دوم، صفحہ: ۳۱ میں ہے۔ (س)

منصب	منصب کی تفصیل	کس خاندان کو کون سا منصب حاصل تھا	آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں کون لوگ ان مناصب پر فائز تھے
حجابہ	کعبہ کی کلید برداری اور تولیت		عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ
رفادہ	غریب حجاج کی خبر گیری	خاندان نوفل	حارث بن عامر رضی اللہ عنہ
سقایہ	حجاج کے پانی پلانے کا انتظام	خاندان ہاشم	حضرت عباس رضی اللہ عنہ
مشورہ		خاندان اسد	یزید بن ربیعہ الاسود
دیات ومغارم	خون بہا کا فیصلہ کرنا	خاندان تیم	حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ
عقاب	علم برداری	خاندان امیہ	ابوسفیان رضی اللہ عنہ
قبہ	خیمہ وخرگاہ کا انتظام اور سواروں کی افسری	خاندان مخزوم	ولید بن مغیرہ رضی اللہ عنہ
سفارت ومنافرت	سفیر ہو کر جانا اور جن قبیلوں میں یہ نزاع پیش آئے کہ شریف تر کون ہے؟ اس کا فیصلہ کرنا۔	خاندان عدی	حضرت عمر رضی اللہ عنہ
ازلام وایسار	محکمہ فال کا انتظام	خاندان جمح	صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ
اموال	مہتمم خزانہ	خاندان سہم	حارث بن قیس

آغازِ اسلام میں جو لوگ قریش کے رؤسائے اعظم تھے اور جن کی عظمت واقتدار کا اثر تمام مکہ پر تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابوسفیان بن حرب (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے باپ)	حرب فجار میں انہی کا باپ قریش کا سپہ سالار تھا۔
ابولہب (آنحضرت ﷺ کا چچا)	
ابوجہل	ولید بن مغیرہ کا بھتیجا اور اپنے قبیلہ کا سردار۔
ولید بن مغیرہ (حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا باپ)	قریش کا رئیس اعظم تھا۔
عاص بن وائل سہمی (حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا باپ)	نہایت دولت مند، کثیر الاولاد اور صاحب اثر تھا۔
عتبہ بن ربیعہ (امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نانا)	نہایت شریف الطبع اور صاحب ریاست تھا۔

ان کے علاوہ، اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث بن کلدہ، اخنس بن شریق ثقفی، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، صاحب اثر تسلیم کئے جاتے تھے۔

اس موقعہ پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خاندان ہاشم اور بنو امیہ برابر کے حریف تھے اور دونوں میں مدت سے رشک ورقابت چلی آتی تھی۔

پہلا سبب

ناتربیت یافتہ اور تندخو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو ان کے آبائی رسم وعقائد کے خلاف ہو، ان کو سخت برہم کر دیتی ہے۔ ان کے ساتھ ان کی مخالفت محض زبانی مخالفت نہیں ہوتی اور ان کی تشنگی انتقام کو، خون کے سوا کوئی چیز بجھا نہیں سکتی۔ آج ہندوستان اس قدر مہذب ہو گیا ہے لیکن اب بھی کسی عام مسئلہ مذہبی کی مخالفت کی جائے تو ایک حشر برپا ہو جاتا ہے اور حکومت موجودہ اگر منتظم اور صاحب جبروت نہ ہوتی تو اس زمین پر بارہا خون کا بادل برس چکا تھا۔

عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا۔ خلیلِ بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی، جن میں ''ہبل'' خدائے اعظم تھا، یہی بت ہر قسم کے خیر وشر کے مالک تھے، پانی برساتے تھے، اولادیں دیتے تھے، معرکہ ہائے جنگ میں فتحیں دلاتے تھے، خدا، یا تو سرے سے نہ تھا، یا تھا تو وجودِ معطل تھا۔

دوسرا سبب

اسلام کا اصل فرض اس طلسم کو دفعتۃً برباد کر دینا تھا، لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت واقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا۔ اس لئے قریش نے شدت سے مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اسی قدر مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے۔

قریش کا رئیس اعظم حرب بن امیہ تھا، چنانچہ حرب فجار میں وہی سپہ سالار اعظم تھا۔ لیکن حرب کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان اس منصبِ عظیم کے حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا، اس لئے ولید بن مغیرہ نے اپنی لیاقت اور اثر سے ریاست حاصل کی، ابوجہل اس کا بھتیجا تھا اور وہ بھی قریش میں امتیاز رکھتا تھا۔

ابوسفیان گو اپنے باپ کا منصب نہ حاصل کر سکا لیکن بنوامیہ کے خاندان کا سردار وہی تھا۔ خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ کبیر السن ابولہب تھا، جو رسول اللہ ﷺ کا حقیقی چچا تھا۔

قبیلہ سہم میں سب سے زیادہ بااثر عاص بن وائل تھا۔ جو نہایت دولت مند اور کثیر الاولاد تھا۔

قریش کی عنان حکومت انہی رؤسا کے ہاتھ میں تھی اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی، قریش کے اور اکابر مثلاً: اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط انہیں لوگوں کے زیر اثر تھے اور اس وجہ سے اعدائے اسلام میں ان کے نام ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

قریش کا یہ خیال تھا کہ نبوت کا منصب اعظم اگر کسی کو ملتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو ملتا۔

﴿ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ﴾. (۴۳/ الزخرف:۳۱)

''وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو اترنا تھا، تو ان دو شہروں (مکہ وطائف) میں سے کسی رئیس اعظم

پر اترنا تھا" (یعنی ولید بن ربیعہ یا ابو مسعود ثقفی)

عرب میں ریاست کے لئے دولت اور اولاد سب سے پہلی اور سب سے ضروری شرط تھی، اولاد کی نسبت اکثر وحشی قوموں میں (ہندوستان میں بھی) یہ خیال رہا ہے کہ جو شخص صاحب اولاد نہ ہو، وہ عالم آخرت کی برکات سے محروم رہتا ہے۔

ہندوؤں میں بھی یہ خیال ہے کہ اولاد کے بغیر انسان کو پوری نجات نہیں مل سکتی۔

قریش میں اوصاف مذکورہ کے لحاظ سے جو لوگ ریاست کا استحقاق رکھتے تھے۔ وہ ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل سہمی اور ابو مسعود ثقفی تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان اوصاف سے بالکل خالی تھے، دولت کے غبار سے آپ کا دامن پاک تھا اور اولاد ذکور سال دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔

تیسرا سبب

قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی جس کی وجہ یہ تھی ابراہۃ الاشرم (بادشاہ حبش) جو کعبہ کے ڈھانے کو آیا تھا، عیسائی تھا، یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیوں کے مقابلہ میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے، ایران اور روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان شکستہ ہوئے، چنانچہ یہ آیات اتریں:

﴿ الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۗ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ ﴾.

(۳۰/ الروم: ۱ تا ۵)

"قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے، لیکن یہ لوگ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر غالب آ جائیں گے، خدا ہی کو اختیار ہے پہلے بھی اور پیچھے بھی اور تب مسلمان اللہ کی مدد سے خوشی منائیں گے۔"

اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا، ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت ﷺ عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبب

ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی۔ قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یک دگر تھے، بنو ہاشم و بنو امیہ، عبدالمطلب نے اپنے زور اور اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا۔ لیکن ان کے بعد اس خاندان میں کوئی صاحب اثر پیدا نہیں ہوا، ابو طالب دولت مند نہ تھے، عباس دولتمند تھے۔ لیکن فیاض نہ تھے، ابولہب

بدچلن تھا، اس پر بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی نبوت کو خاندان بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا، اس لئے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی، بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابوسفیان ہی نے برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیس لشکر رہا۔

عقبہ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ آنحضرت ﷺ کا دشمن تھا اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت میں آپ کے دوش مبارک پر اونٹ کی اوجھ لاکر ڈالی تھی (اموی تھا) بنو امیہ کے بعد جس قبیلہ کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا، وہ بنو مخزوم تھے، ولید بن المغیرہ اسی خاندان کا رئیس تھا، اس لئے اس قبیلہ نے بھی آنحضرت ﷺ کی سخت مخالفت کی۔ ابوجہل کی ایک تقریر سے اس بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے، ایک دفعہ اخنس بن شریق، ابوجہل کے پاس گیا اور کہا کہ ''محمد ﷺ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟'' ابوجہل نے کہا: ہم اور بنو عبد مناف (یعنی آل ہاشم) ہمیشہ حریفِ مقابل رہے، انہوں نے مہمانداریاں کیں تو ہم نے بھی کیں۔ انہوں نے خون بہا دیئے تو ہم نے بھی دیے، انہوں نے فیاضیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں، یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا، تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعویدار ہیں، خدا کی قسم! ہم اس پیغمبر پر کبھی ایمان نہیں لا سکتے۔ [1]

پانچواں سبب

ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابولہب جو خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھے، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا، [2] اخنس بن شریق جو بنوزہرہ کا حلیف اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر ارباب جاہ مختلف قسم کے اعمال شنیعہ میں گرفتار تھے۔ آنحضرت ﷺ ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے، دوسری طرف ان بداخلاقیوں میں سخت دارو گیر کرتے تھے جس سے ان کی عظمت و اقتدار کی شہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی، قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں اور گو طریقہ بیان عام ہوتا تھا۔ لیکن لوگ جانتے تھے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔

﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۝ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝﴾. (٦٨/ القلم: ١٠ تا ١٤)

''اور اس شخص کے کہنے میں نہ آنا جو بات بات میں قسم کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، طاعن ہے،

---

[1] ابن ھشام، ج ١، ص: ١٩٣ مطبوعه مصر۔

[2] حرم میں ایک سونے کا ہرن مدت سے خزانہ میں محفوظ تھا، ابولہب نے چرا کر فروخت کر دیا۔ یہ واقعہ عموماً تاریخوں میں مذکور ہے، ابن قتیبہ نے بھی معارف (ص ٥٥ مطبوعہ مصر) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (تاریخ طبری، ج ٣، ص: ١١٣٥)

چغلیاں کھاتا ہے، لوگوں کو اچھے کاموں سے روکتا ہے، حد سے بڑھ گیا ہے، بد ہے، تند خو ہے اوران سب باتوں کے ساتھ جھوٹا نسب بناتا ہے، اس لئے کہ وہ مالدار اور لڑکوں والا ہے۔"

﴿ كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝ ﴾.

(۹۶/ العلق:۱۵، ۱۶)

"وہ سن رکھے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے جو کہ جھوٹی اور خطا کار ہے۔"

ممکن تھا کہ وعظ و پند کا نرم طریقہ اختیار کیا جاتا، لیکن مدت کی عربی نخوت، دولت و اقتدار کا فخر، ریاست کا زعم ان چیزوں کے ہوتے ہوئے جب تک ضرب نہایت سخت نہ ہوگی وہ خبردار نہ ہوتے، اس لئے بڑے بڑے جبار اس طرح مخاطب کئے جاتے تھے:

﴿ ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۝ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا ۝ وَبَنِينَ شُهُودًا ۝ وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ۝ كَلَّا ۖ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ۝ ﴾. (۷۴/ المدثر:۱۱ تا ۱۶)

"ہم کو اور اس کو تنہا چھوڑ دو۔ میں نے اس کو اکیلا پیدا کیا، پھر بہت سا مال دیا۔ بیٹے دیے سامان دیا۔ پھر چاہتا ہے کہ ہم اس کو اور دیں، ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا دشمن ہے۔"

یہ خطاب ولید بن مغیرہ کے ساتھ ہے جو قریش کا سرتاج تھا اور یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے ادا ہوتے تھے جس کو ظاہری جاہ واقتدار حاصل نہ تھا۔

لیکن مخالفت کی جو سب سے بڑی وجہ تھی اور جس کا اثر تمام قریش بلکہ تمام عرب پر یکساں تھا یہ تھا کہ جو معبود سینکڑوں برس سے عرب کے حاجت روائے عام تھے اور جن کے آگے وہ ہر روز پیشانی رگڑتے تھے، اسلام ان کا نام ونشان مٹاتا تھا اور ان کی شان میں کہتا تھا:

﴿ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۹۸)

"بلاشبہ تم اور جن چیزوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو۔ سب دوزخ کے ایندھن ہوں گے۔"

قریش کے تحمل کے اسباب

ان اسباب کے ساتھ جن میں سے ہر ایک قریش کو سخت مشتعل کر دینے کے لئے کافی تھا، توقع یہ تھی کہ اعلانِ دعوت کے ساتھ سخت خونریزیاں شروع ہو جاتیں، لیکن قریش نے تحمل سے کام لیا اور اس کے ناگزیر اسباب تھے۔ قریش خانہ جنگیوں میں تباہ ہو چکے تھے اور حرب فجار کے بعد اس قدر عاجز آ گئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے۔ قبیلہ پرستی کی وجہ سے لڑائی صرف اتنی سی بات پر شروع ہو جاتی تھی کہ کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے، مقتول کا قبیلہ بغیر کسی تحقیق کے انتقام کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا اور جب تک بدلہ نہ لے لیا

جائے، یہ آگ بجھ نہیں سکتی تھی، رسول اللہ ﷺ کے قتل پر آمادہ ہونا قریش کے لئے نہایت آسان تھا،لیکن وہ جانتے تھے کہ بنو ہاشم خون کا انتقام نہ چھوڑیں گے اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ تمام مکہ جنگ میں مبتلا ہو جائے گا، بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے اور قریباً کوئی قبیلہ ایسا باقی نہ تھا جس میں دو ایک شخص اسلام نہ لا چکے ہوں، اس لئے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اس کا مجرم نہ تھا، بلکہ سینکڑوں تھے اور سب کا استیصال کرنا ممکن نہ تھا۔

رؤسائے قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے، وہ بدنفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں نیک نیتی کی بنا پر مخالفت کرتے تھے، اس بنا پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی سے طے ہو جائے۔ [1]

غرض جب آنحضرت ﷺ نے اعلان دعوت کیا اور بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کے چند معززوں نے ابوطالب سے آکر شکایت کی، ابوطالب نے نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا۔ لیکن چونکہ بنائے نزاع قائم تھی یعنی آنحضرت ﷺ ادائے فرض سے باز نہ آسکتے تھے، اس لئے یہ سفارت دوبارہ ابوطالب کے پاس آئی، اس میں تمام رؤسائے قریش یعنی عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے، ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آباء واجداد کو گمراہ کہتا ہے، ہم کو احمق ٹھہراتا ہے، اس لئے یا تو تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے۔ قریش اب تحمل نہیں کر سکتے اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آنحضرت ﷺ سے مختصر لفظوں میں کہا کہ ''جانِ عم! میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں''۔ رسول اللہ ﷺ کی ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے ابوطالب تھے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ اب ان کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے، آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا، خدا، اس کام کو پورا کرے گا، یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا''۔ آپ کی پر اثر آواز نے ابوطالب کو سخت متاثر کیا، رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''جا! کوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔'' [2]

آنحضرت ﷺ بدستور دعوتِ اسلام میں مصروف ہوئے، قریش اگرچہ آنحضرت ﷺ کے قتل کا ارادہ نہ کر سکے، لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، نماز پڑھنے میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بدزبانیاں کرتے تھے، ایک دفعہ آپ ﷺ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، قریش متحیر تھے کہ آپ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں۔ انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت

---

[1] یہ آیت غالباً انہیں لوگوں کی شان میں ہے: ﴿ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ ﴾ (٦/ الانعام:٢٦) یعنی آنحضرت ﷺ کی ایذارسانی سے تو لوگوں کو منع کرتے تھے، لیکن آپ کے دعوائے نبوت سے دور ہٹتے تھے۔'' اصابہ ذکر ابی طالب بحوالہ عبدالرزاق، ج٧، ص:١١٣۔ (س) [2] ابن ہشام، ج١، ص:١٦٤ مطبوعہ مصر۔

اور نام ونمود کی خواہش کے سوا اور کیا کر سکتا ہے، قریش نے بھی یہی خیال کیا، اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ قریش کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہا: "محمد (ﷺ)! کیا چاہتے ہو؟ کیا مکہ کی ریاست؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ تمہارا زیر فرمان ہو جائے لیکن ان باتوں سے باز آؤ"۔

عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ ﷺ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ﴾.

(٤١/ حٰمٓ السجدة:٦)

"اے محمد کہہ دے کہ میں تمہیں جیسا آدمی ہوں، مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک خدا ہے، بس سیدھے اس کی طرف جاؤ اور اسی سے معافی مانگو۔"

﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾. (٤١/ حٰمٓ السجدة:٩)

"اے محمد (ﷺ)! کہہ دے کہ کیا تم لوگ خدا کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں یہ زمین پیدا کی اور تم خدا کے شریک قرار دیتے ہو، یہی سارے جہان کا پروردگار ہے۔"

عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، اس نے قریش سے جا کر کہہ دیا کہ محمد (ﷺ) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ جائیں گے تو یہ تمہاری ہی عزت ہے، ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دے گا"۔ لیکن قریش نے یہ رائے نامنظور کی۔ [1]

حضرت حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما کا اسلام، ۶ نبوی

آنحضرت ﷺ کے اعمام میں سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو آپ سے خاص محبت تھی، وہ آپ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے، وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا مذاق طبیعت سپاہ گری اور شکار افگنی تھا، معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے، دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے، طواف کرتے، قریش کے رؤسا صحن حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے، اس طریقہ سے سب سے یارانہ تھا اور سب لوگ ان کی قدر ومنزلت کرتے تھے۔

[1] ابن هشام، ج۱، ص:۱۷۹، ۱۸۰ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی تاریخ الکبیر، ج۷، ص:۵۱ میں یہ واقعہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخالفین جس بے رحمی سے پیش آتے تھے، بیگانوں سے بھی دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ ایک دن ابوجہل نے رودررو آپ کے ساتھ نہایت سخت گستاخیاں کیں، ایک کنیز دیکھ رہی تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شکار سے آئے تو اس نے تمام ماجرا کہا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ غصہ سے بے تاب ہو گئے، تیر و کمان ہاتھ میں لئے حرم میں آئے اور ابوجہل سے کہا ''میں مسلمان ہو گیا ہوں۔''

آنحضرت ﷺ کے جوشِ حمایت میں انہوں نے اسلام کا اظہار تو کر دیا، لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعتہً کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے، بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دین حق یہی ہے [1] دو ہی چار روز کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اسلام لائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ستائیسواں [2] سال تھا کہ آفتابِ رسالت طلوع ہوا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعید رضی اللہ عنہ اسلام لائے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی مسلمان ہو گئیں، اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے، ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے دشمن بن گئے، لُبینہ رضی اللہ عنہا ان کے خاندان کی کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ ''دم لے لوں تو پھر ماروں گا، لبینہ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زد و کوب سے دریغ نہیں کرتے تھے، لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا، ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کر سکے۔ آخر مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود ذاتِ نبوی ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا، تلوار کمر سے لگا کر سیدھے رسول اللہ ﷺ کی طرف چلے، کارکنانِ قضا نے کہا:

ع آمد آں یارے کہ مامی خواستیم

راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ مل گئے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا: خیر ہے؟ بولے کہ محمد ﷺ کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں، انہوں نے کہا: ''پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔'' فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہ قرآن پڑھ رہی تھیں، ان کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں اور قرآن کے اجزا چھپا لئے، لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی، بہن سے پوچھا: یہ کیا آواز تھی؟ بولیں: کچھ نہیں، انہوں نے کہا: میں سن چکا ہوں تم دونوں مرتد ہو گئے ہو، یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریباں ہوئے اور جب ان کی بہن

---

[1] حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام کا واقعہ عموماً سب نے لکھا ہے لیکن یہ اخیر واقعہ میں نے صرف ''روض الانف'' میں دیکھا ہے (ج ۱، ص: ۱۸۶)۔ [2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام میں الفاروق میں مفصل لکھ چکا ہوں، اسی کو بعینہ یہاں نقل کر دیا ہے، کہیں کہیں بعض الفاظ یا جملے بدل دیے ہیں (جامع نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے واقعہ کی دوسری روایتیں سیرۃ النبی ﷺ جلد سوم باب استجابت دعا (ص: ۵۴۷ تا ۵۴۱ طبع جدید) میں مفصل درج کر دی ہیں۔ وہاں دیکھی جائیں)۔ (س)

بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی۔ یہاں تک کہ ان کا جسم لہولہان ہو گیا۔ لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی، بولیں کہ ''عمر جو بن آئے کرو۔ لیکن اسلام اب دل سے نکل نہیں سکتا۔'' ان الفاظ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل پر خاص اثر کیا، بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا، ان کے جسم سے خون جاری تھا، دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی، فرمایا تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی سناؤ، فاطمہ رضی اللہ عنہا نے قرآن کے اجزاء لا کر سامنے رکھ دیے، اٹھا کر دیکھا تو یہ سورہ تھی:

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ ﴾. (۵۷/ الحدید:۱)

''زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے خدا کی تسبیح پڑھتا ہے اور خدا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔''

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے:

﴿ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (۵۷/ الحدید:۷) ''خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔''

تو بے اختیار پکار اٹھے کہ: (اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ).

''میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد خدا کے پیغمبر ہیں۔''

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان میں جو کوہِ صفا کی تلی میں واقع تھا، پناہ گزین تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آستانۂ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف گئے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم کو تردد ہوا، لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے، ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ ﷺ خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کے فرمایا: ''کیوں عمر! کس ارادے سے آیا ہے؟'' نبوت کی پرجلال آواز نے ان کو کپکپا دیا، نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ ''ایمان لانے کے لیے۔'' آنحضرت ﷺ بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے نے اسلام کی تاریخ میں نیا دور پیدا کر دیا، اس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی اسلام لا چکے تھے، عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہ سید الشہداء رضی اللہ عنہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم مسلمان اپنے فرائض مذہبی علانیہ نہیں ادا کر سکتے تھے اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے ساتھ دفعتہً یہ حالت بدل گئی، انہوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا، کافروں نے اول اول بڑی شدت کی، لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی، ابن ہشام نے اس واقعہ کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زبانی ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

---

[1] انساب الاشراف بلاذری وطبقات ابن سعد الجزء الثالث، القسم الاول فی البدریین من المهاجرین، ص:۱۹۲ واسد الغابه، ج ٤، ص:۵۳، ۵٤ وابن عساکر وکامل ابن الاثیر، ج۲، ص: ٦٤ تا ٦٦ مطبوعه لیڈن۔

فلما اسلم عمر قاتل قریشا حتّی صلّی عند الکعبة و صلینا معه۔

''جب عمر اسلام لائے تو قریش سے لڑے یہاں تک کعبہ میں نماز پڑھی اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی پڑھی۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، اتفاق سے عاص بن وائل آ نکلا، اس نے پوچھا: کیا ہنگامہ ہے، لوگوں نے کہا: عمر مرتد ہو گئے، عاص بن وائل نے کہا: ''تو کیا ہوا، میں نے عمر کو پناہ دی۔'' [1]

تعذیب مسلمین

رسوخ عزم، قوتِ ارادہ، شدتِ عمل، انسان کے اصلی جوہر ہیں اور داد کے قابل ہیں، لیکن انہی اوصاف کا رخ جب بدل جاتا ہے تو وہ سخت دلی، بے رحمی، درندہ طبعی اور سفاکی کا مہیب قالب اختیار کر لیتے ہیں۔ اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کے قبیلوں نے اپنے حصارِ حفاظت میں لے لیا تو قریش کا طیش وغضب ہر طرف سے سمٹ کر ان غریبوں پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، ان میں کچھ غلام اور کنیزیں تھیں، کچھ غریب الوطن تھے، جو دو ایک پشت سے مکہ میں آ رہے تھے اور کچھ کمزور قبیلوں کے آدمی تھے، جو کسی قسم کی عظمت و اقتدار نہیں رکھتے تھے، قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور و ستم کی تاریخ میں اس کی مثال پیدا کرنا قریش کی یکتائی کی تحقیر ہے۔

یہ آسان تھا کہ مسلمانوں کے خس و خاشاک سے سرزمین عرب دفعتہً پاک کر دی جاتی، لیکن قریش کا نشہ انتقام اس سے نہیں اتر سکتا تھا، مسلمان اگر اپنے مذہب پر ثابت قدم رہ کر پیوند خاک کر دیے جاتے تو اس میں جس قدر قریش کی تعریف نکلتی، اس سے زیادہ ان بیکسوں کا صبر و استقلال دادطلب ہوتا، قریش کی شان اس وقت قائم رہ سکتی تھی جب یہ لوگ جادۂ اسلام سے پھر کر پھر قریش کے مذہب میں آ جاتے، یا شاید ان کو مسلمانوں کی سخت جانی کا امتحان لینا اور اس کی داد دینا منظور تھا۔

قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا دل واقعی اس حالت پر جلتا تھا کہ ان کا مدتوں کا بنا بنایا کارخانہ درہم برہم ہوا جاتا ہے، ان کے آباء و اجداد کی تحقیر کی جاتی ہے، قابل احترام معبودوں کی عظمت مٹی جاتی ہے، یہ لوگ صرف حسرت و افسوس کر کے رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ چند خام طبقوں کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔ عتبہ، عاص بن وائل وغیرہ اسی قسم کے لوگ تھے۔ لیکن ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ کا معیار اس سے زیادہ بلند تھا۔

مسلمانوں پر ظلم کے طریقے

بہر حال قریش نے جور و ظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کیے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ، ریتلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہ ان غریبوں کو

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر بن الخطاب: ٣٨٦٤، ٣٨٦٥۔

اسی توے پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے۔ ❶ یہ مصیبتیں اگرچہ تمام بیکس مسلمانوں پر عام تھیں لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے، ان کے نام یہ ہیں:

حضرت خباب بن الارت، رضی اللہ عنہ تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے تھے۔ ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اس زمانہ میں اسلام لائے جب آنحضرت ﷺ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں مقیم تھے اور صرف چھ سات شخص اسلام لا چکے تھے۔ قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، اس پر چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے، خباب رضی اللہ عنہ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی ❷ [حضرت خباب رضی اللہ عنہ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ ان کا بقایا تھا، مانگتے تو جواب ملتا جب تک محمد کا انکار نہ کرو گے، ایک کوڑی نہ ملے گی، یہ کہتے کہ نہیں جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں۔] ❸

حضرت بلال رضی اللہ عنہ یہ وہی حضرت بلال ہیں جو مؤذن کے لقب سے مشہور ہیں۔ حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو امیہ ان کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں، ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آ، ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا، لیکن اس وقت بھی ان کی زبان سے ''احد'' کا لفظ نکلتا، جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالہ کیا، وہ ان کو شہر کے اس سرے سے اس سرے تک گھسیٹتے پھرتے تھے، لیکن اب بھی وہی رٹ تھی اَحَدْ اَحَدْ ❹۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ یمن کے رہنے والے تھے، ان کے والد ''یاسر'' مکہ میں آئے، ابو حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جس کا نام سمیہ رضی اللہ عنہا تھا، شادی کر دی تھی۔ عمار رضی اللہ عنہ اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص ❺ اسلام لا چکے تھے۔ قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بیہوش ہو جاتے، ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں، ان کو ابو جہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اور وہ ہلاک ہو گئیں۔ ❻

یاسر رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے والد تھے، یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک

---

❶ یہ واقعات ابن سعد نے بلال وصہیب رضی اللہ عنہما کے حال میں بہ تفصیل لکھے ہیں۔ دیکھو کتاب مذکور۔ جلد ثالث تذکرہ صحابہ بدر (بلال رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ص: ۱۶۵ تا ۱۷۰ اور صہیب رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ص: ۱۶۱ تا ۱۶۴ میں ہے)۔ ❷ طبقات ابن سعد، ج۳، تذکرة خباب، ص: ۱۱۶ تا ۱۱۸۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة مریم: ۴۷۳۲ تا ۴۷۳۵۔(س)
❹ طبقات ابن سعد، ج سوم، ص: ۱۶۵، ۱۶۶۔ ❺ [تین شخص کتابت کی غلطی ہے صحیح تیس (۳۰) شخص سے زیادہ ہے۔ دیکھئے حاشیہ نمبر (۲) وطبقات ابن سعد، ج سوم، ص: ۱۷۷ تذکرہ عمار رضی اللہ عنہ] ❻ کامل ابن اثیر ج، ۲، ص: ۵۰۔

ہو گئے۔ ❶

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ یہ رومی مشہور ہیں۔لیکن درحقیقت رومی نہ تھے،ان کے والد سنان کسریٰ کی طرف سے ابلہ کے حاکم تھے اوران کا خاندان موصل میں آباد تھا،ایک دفعہ رومیوں نے اس نواح پرحملہ کیااور جن لوگوں کو قید کر کے لے گئے ان میں صہیب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ یہ روم میں پلے۔اس لئے عربی زبان اچھی طرح بول نہ سکتے تھے،ایک عرب نے ان کوخریدااور مکہ میں لایا یہاں عبداللہ بن جدعان نے ان کوخرید کر کے آزاد کر دیا۔

آنحضرت ﷺ نے جب دعوت اسلام شروع کی تو یہ اور عمار بن یاسر ایک ساتھ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے،آپ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہو گئے۔ ❷ قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے تھے۔جب انہوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا:اپنا سارا مال ومتاع چھوڑ جاؤ تو جا سکتے ہو،انہوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ ❸

حضرت ابوفکیہ رضی اللہ عنہ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ اسلام لائے امیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے پاؤں میں رسی باندھی اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں،ایک ''گبریلا'' راہ میں جارہا تھا،امیہ نے ان سے کہا،''تیرا خدا یہی تو نہیں ہے''۔انہوں نے کہا ''میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے''۔اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا،ایک دفعہ ان کے سینہ پر اتنا بھاری بوجھل پتھر رکھ دیا کہ ان کی زبان نکل پڑی۔

لبینہ رضی اللہ عنہا یہ بیچاری ایک کنیز تھیں،حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس ❹ بےکس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے کہ ''میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں۔'' وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ ''اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو خدا اس کا انتقام لے گا۔''

حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھرانے کی کنیز تھیں اور اس وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ (اسلام سے پہلے) ان کو جی کھول کر ستاتے،ابوجہل نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت نہدیہ اور ام عبیس رضی اللہ عنہما یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں اور اسلام لانے کے جرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں۔ ❺

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دفتر فضائل کا یہ پہلا باب ہے کہ انہوں نے ان مظلوموں میں سے اکثروں کی جان بچائی۔حضرت بلال،عامر بن فہیرہ،لبینہ،زنیرہ،نہدیہ،ام عبیس رضی اللہ عنہم سب کو بھاری بھاری داموں پر

---

❶ کامل ابن اثیر،ج ۲،ص:۵۰۔ ❷ طبقات ابن سعد،ج ۳،ص: ۱۷۷ تذکرۃ عمار بن یاسر،ص: ۱۶۲،ابن الاثیر "ذکر تعذیب المستضعفین"،ج ۲،ص:٤٩ تا ٥٢ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ عمار رضی اللہ عنہ اس وقت ایمان لائے جب آنحضرت ﷺ ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان میں چلے آئے تھے اور جبکہ تیس شخص سے زیادہ اسلام لا چکے تھے۔

❸ طبقات ابن سعد،ج ۳،ص:۱۶۲۔ ❹ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔

❺ (کامل ابن اثیر،ج ۲،ص:۵۱،۵۲ اور انساب الاشراف،ج ۱) میں ان مستضعفین کا ذکر ہے۔

خریدا اور آزاد کر دیا۔ ❶ یہ لوگ وہ تھے جن کو قریش نے نہایت سخت جسمانی اذیتیں پہنچائیں، ان سے کم درجہ پر وہ لوگ تھے جن کو طرح طرح سے ستاتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو کبیر السن اور صاحب جاہ و اعزاز تھے، جب اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ خود ان کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا ❷ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ جو ساتویں مسلمان ہیں جب مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا، ❸ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا، جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے، ❹ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی سعید بن زید رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا۔ ❺

لیکن یہ تمام مظالم، یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں ایک مسلمان کو بھی راہِ حق سے متزلزل نہ کر سکیں۔ ایک نصرانی مؤرخ نے نہایت سچ لکھا ہے:

''عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد ﷺ کے خصائل نے وہ درجہ نشۂ دینی کا آپ کے پیروؤں میں پیدا کیا۔ جس کو عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے..... جب عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا نشۂ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے..... برعکس اس کے محمد ﷺ کے پیرو، اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ ﷺ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔'' ❻

ہجرت حبش ۵ نبوی

قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا تو رحمت عالم نے جان نثارانِ اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں، حبش قریش کا قدیم تجارت گاہ تھا، وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے، اہل عرب حبش کے فرمانروا کو نجاشی ❼ کہتے تھے اور اس کے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی۔

جان نثارانِ اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن مکہ میں رہ

❶ (کامل ابن اثیر، ج ۲، ص: ۵۰ تا ۵۲)۔ ❷ طبقات ترجمہ عثمان بن عفان، ج ۳، ص: ۳۸۔
❸ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام ابی ذر: ۳۸۶۱۔ ❹ ریاض النضرۃ لمحب الطبری، الباب السادس فی مناقب الزبیر الفصل الرابع، ج ۲، ص: ۲۶۳ آستانہ مصر طبع اول۔
❺ بخاری، کتاب الاکراہ، باب من اختار الضرب والقتل والھوان علی الکفر: ۶۹۴۲۔ اس وقت تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام نہیں لائے تھے۔ (س) ❻ اپالوجی گاڈفری ہیگنس، ترجمہ اردو صفحہ: ۶۶ و ۶۷ مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء۔
❼ نجاشی۔ حبشی لفظ نجوش کی تعریب ہے، جس کے معنی حبشی میں بادشاہ کے ہیں۔ نجاشی کا نام ''اصحمہ'' تھا۔ بخاری باب موت النجاشی: ۳۸۷۹۔ (س)

کرفرائضِ اسلام کا آزادی سے بجالانا ممکن نہ تھا، اس وقت تک حرم کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا۔عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو انہوں نے کہا میں اس فرض کو ضرور ادا کروں گا۔ لوگوں نے منع کیا۔لیکن وہ باز نہ آئے ،حرم میں گئے اور مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہوکر سورۂ الرحمٰن پڑھنا شروع کی، کفار ہر طرف ٹوٹ پڑے اوران کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کئے،اگرچہ انہوں نے جہاں تک پڑھنا تھا پڑھ کر دم لیا،لیکن واپس گئے تو چہرہ پر زخم کے نشان لے کر گئے۔ ❶ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جاہ واقتدار میں دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے،لیکن آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے اوراسی بنا پرایک بار ہجرت کے لئے آمادہ ہوگئے)۔ ❷

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی تھیں:

غرض آنحضرت ﷺ کے ایما سے اول اول گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن کے نام حسب ذیل ہیں:

نام	کیفیت
① حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان	مع اپنی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے جو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی تھیں۔
② حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا (بنت سہیل) تھا	ان کا باپ عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا،لیکن چونکہ سخت کافر تھا،اس لئے ان کو گھر چھوڑنا پڑا۔
③ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی اور مشہور صحابی تھے۔
④ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	ہاشم کے پوتے تھے۔
⑤ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ	مشہور صحابی اورعشرۂ مبشرہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔قبیلہ زہرہ سے تھے اوراس بناپر آنحضرت ﷺ کے ننہالی رشتہ دار تھے۔
⑥ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ (بن عبدالاسد) مخزومی مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا (بنت ابی امیہ) کے۔	یہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا وہی ہیں جو ابوسلمہ کے مرنے کے بعد آنحضرت ﷺ کے عقد میں آئیں۔
⑦ حضرت عثمان بن مظعون جمحی رضی اللہ عنہ	مشہور صحابی ہیں۔
⑧ حضرت عامر بن ربیعہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام حضرت لیلیٰ رضی اللہ عنہا (بنت ابی حشمہ) تھا۔	سابقین اولین میں ہیں۔بدر میں بھی شریک تھے،حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سفرحج میں ان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا ❸

❶ طبری، ص: ۱۱۸۸۔ج ۳۔(س)

❷ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرت مدینه: ۳۹۰۵۔(س)

❸ اصابه، ج ٤، ص: ۸ مطبع شرفیه مصر: ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء۔

۹۔ حضرت ابوسبرہ بن ابی رہم [1] یا [2]	ان کی ماں برہ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی تھیں، یہ سابقین فی الاسلام میں ہیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ ہجرت ثانیہ میں گئے تھے۔
حضرت ابو حاطب رضی اللہ عنہ [3] بن عمرو ۱۰ سہیل بن بیضاء	بدر میں شریک تھے، امام زہری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہجرت کی ہے۔ [4]
۱۱ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ	مشہور صحابی اور مجتہدین صحابہ میں داخل ہیں۔

ان لوگوں نے ۵ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا۔ حسن اتفاق یہ کہ جب یہ بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبش کو جا رہے تھے، جہاز والوں نے سستے کرایہ پر ان کو بٹھالیا، ہر شخص کو صرف ۵ درہم دینے پڑے۔ قریش کو خبر ہوئی تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے۔ لیکن موقعہ نکل چکا تھا۔ [5]

عام مؤرخین کا خیال ہے کہ ہجرت انہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا لیکن فہرست مہاجرین میں ہر درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو امیہ سے تھے جو سب سے زیادہ صاحب اقتدار خاندان تھا۔ متعدد بزرگ مثلاً: زبیر اور مصعب رضی اللہ عنہما خود آنحضرت ﷺ کے خاندان سے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور ابوسبرہ رضی اللہ عنہ معمولی لوگ نہ تھے، اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بے کسوں پر محدود نہ تھا، بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی ان کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے اور جن کو انگاروں کے بستر پر سونا پڑا تھا، یعنی حضرت بلال، عمار، یاسر رضی اللہ عنہم وغیرہ ان لوگوں کا نام مہاجرین حبش کی فہرست میں نظر نہیں آتا۔ اس لئے یا

---

[1] طبری، ج۳، ص:۱۱۸۳ وابن سعد، ج۱، ص:۱۳۶ مگر ابن ہشام نے سیرۃ لکھا ہے۔

[2] حبشہ کے مہاجرین اول کی تعداد اور ان کے تعین میں کسی قدر اختلاف ہے۔ ابن اسحاق (ابن ہشام، ج۱، ص:۱۷۹ و ۱۹۸) نے مردوں میں ان ہی دس آدمیوں کا نام لیا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ہجرت اولیٰ میں نہیں بلکہ ہجرت ثانیہ میں تھے (ابن ہشام ج۱، ص:۲۰۰ فتح الباری، جلد ۷ صفحہ ۱۴۳) واقدی نے مردوں میں گیارہ صاحبوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابوسبرہ اور حضرت ابو حاطب رضی اللہ عنہما دونوں کو مہاجرین میں شمار کیا ہے اور ابن اسحاق ان میں سے ایک کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں واقدی سے ایک بڑی فروگزاشت یہ ہوئی کہ انہوں نے گیارہ مردوں کو مہاجرین حبش بتلایا لیکن جب مہاجرین کی فہرست گنائی تو اس میں بارہ آدمیوں کا نام لیا، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی اضافہ کیا (زرقانی علی المواہب، جلد اول، صفحہ:۳۱۴) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے واقدی کی اس فروگزاشت پر گرفت کی ہے۔ (فتح الباری، جلد ۷، ص:۱۴۳) ابن سعد نے انہی تمام مہاجرین کا نام لیا ہے جس کا ذکر واقدی نے کیا ہے۔ (ابن سعد، جلد اول، صفحہ:۱۳۶) ابن سید الناس نے بھی بہ روایت زہری بارہ آدمیوں کا ذکر کیا ہے مگر انہوں نے حضرت زبیر کے بجائے حضرت سلیط بن عمرو رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے (عیون الاثر، اول، صفحہ:۱۱۵) بعض دوسرے سیرت نگار جو بارہ مرد مہاجرین کو تسلیم کرتے ہیں وہ حضرت حاطب بن عمرو اور حضرت سہیل بن بیضاء کے بجائے حضرت حاطب بن حارث رضی اللہ عنہ اور حضرت ہاشم بن عمرو رضی اللہ عنہ کا نام لیتے ہیں۔ (زرقانی، اول، ص:۳۱۴) اسی طرح ہجرت کرنے والی خواتین میں بعض لوگ حضرت ابوسبرہ رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت ام کلثوم بنت سہیل اور حضور ﷺ کی دایہ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کا اضافہ کرتے ہیں (س)

[3] ابو حاطب حسب روایت ابن ہشام، ج۱، ص:۱۹۸ لیکن طبری، ج۳، ص:۱۱۸۳ اور ابن سعد، ج۱، ص:۱۳۷ نے حاطب ہی لکھا ہے۔

[4] اصابہ، ج۷، ص:۴۰۔ [5] یہ تمام تفصیل طبری، ج۳، ص:۱۱۸۲، ۱۱۸۳ میں ہے مہاجرین حبشہ کے نام طبقات ابن سعد جزء اول قسم اول، ص:۱۳۶ اور ۱۳۷ میں بھی ہیں۔

توان کی بے سروسامانی اس حد تک پہنچی تھی کہ سفر کرنا بھی ناممکن تھا یا یہ کہ درد کے لذت آشنا تھے اور اس لطف کو چھوڑ نہ سکتے تھے۔

دلم زجور تو آسودہ است ومی نالم کہ غیر پے نہ برد لذت خدنگ ترا

نجاشی کی بدولت مسلمان حبش میں امن وامان سے زندگی بسر کرنے لگے لیکن قریش یہ خبریں سن سن کر پیچ وتاب کھاتے تھے، آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو، عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) اس کام کے لئے منتخب ہوئے [1] نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لئے گراں بہا تحفے مہیا کئے گئے [2] اور نہایت سروسامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی، یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے، ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے ملک میں بھاگ آئے۔ کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق جو درخواست پیش کریں، آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہم کو حوالہ کر دیے جائیں۔ درباریوں نے بھی تائید کی۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا: ”تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے مخالف ہے؟“

مسلمانوں نے اپنی گفتگو کرنے کے لئے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) کو انتخاب کیا۔ انہوں نے اس طرح تقریر شروع کی:

> ”أَيُّهَا الْمَلِكُ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے۔ بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق ودیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔ نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے۔ اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہوگئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں واپس آجائیں“۔

نجاشی نے کہا: ”جو کلامِ الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو“۔ جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کی چند

---

[1] مسند احمد، ج۱، ص:۲۰۲ (س) [2] ابن ہشام، ج۱، ص:۲۰۵ نے لکھا ہے کہ مکہ کا بڑا تحفہ چمڑا تھا۔ اور کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل مکہ اور شام وغیرہ کو جو مال تجارت لے جاتے تھے، وہ بھی چمڑا ہوتا تھا۔ (مسند امام ابن حنبل میں تصریح ہے کہ یہ تحفہ چمڑا ہی تھا۔ مسند اہل البیت) بلکہ مسند امام احمد، ج۴، ص:۱۹۸ میں خود حضرت عمرو بن عاص کے یہ الفاظ موجود ہیں: "وكان احب ما يهدى اليه من ارضنا الادم فجمعناه له ادما كثيرا"۔

آیتیں پڑھیں۔ نجاشی پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، پھر کہا: ''خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔'' یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا: تم واپس جاؤ میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا۔''

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا، حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں، ان لوگوں کو تردد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے ناراض ہو جائے گا، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: کچھ ہو، ہم کو سچ بولنا چاہیے۔

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے، نجاشی نے کہا: تم لوگ عیسیٰ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے''۔ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھالیا اور کہا: واللہ! جو تم نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔'' [1] بطریق جو دربار میں موجود تھے نہایت برہم ہوئے، نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی، نجاشی نے ان کے غصہ کی کچھ پروانہ کی اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب آئے۔ [2]

اسی اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا، نجاشی اس کے مقابلہ کے لئے خود گیا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جائے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لئے آئیں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے، لیکن انہوں نے اس خدمت کے لئے اپنے کو پیش کیا، مشک کے سہارے دریائے نیل تیر کر رزمگاہ میں پہنچے، ادھر صحابہ رضی اللہ عنہم نجاشی کی فتح کے لئے خدا سے دعا مانگتے تھے، چند روز کے بعد زبیر واپس آئے اور خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی۔ [3]

---

[1] مستدرك حاكم، ج ۲، ص: ۳۱۰ كتاب التفسير (س) [2] مارگولیتھ صاحب نے ہجرت حبش کی بھی بڑی نازک اور دور از نظر وجہ تلاش کر کے پیدا کی ہے، فرماتے ہیں کہ ''جب محمد ﷺ نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے اور یہ پہلے سنا تھا کہ کعبہ کے گرانے کے لئے ابرہۃ الاشرم جو آیا تھا وہ حبش ہی کا تھا، اس لئے انہوں نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تا کہ قریش کا زور ٹوٹ جائے، اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا۔ لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا، مجھ کو کیا ہاتھ آئے گا۔ اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے۔'' یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔ صاحب موصوف کو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر و مکالمت میں اس بنا پر شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے ناواقف تھا۔ حالانکہ اس زمانہ میں (اولاً تو) عربی زبان عام طور سے حبش میں بے تکلف لوگ سمجھ سکتے تھے (کہ یہ دونوں زبانیں باہم نہایت قریب ہیں، ثانیاً درباروں میں ترجمان ہوتے تھے۔ جیسا کہ ابوسفیان اور قیصر روم کے باہمی مکالمہ میں مذکور ہے۔ بخاري، كتاب بدء الوحي باب بدء الوحي: ۷۔ (س) [3] یہ تمام واقعات مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۲۰۲ میں مذکور ہیں، ابن ہشام (ج ا ص: ۲۰۴ تا ۲۰۸) نے بھی تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن طبری اور ابن سعد نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور نجاشی کی تقریر کا ذکر نہیں کیا۔ امام ابن حنبل اور ابن ہشام کا سلسلہ روایت یہ ہے، محمد بن اسحاق، زہری، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحرث بن ہشام مخزومی، ام سلمہ رضی اللہ عنہا یہ سب رواۃ ثقہ ہیں اور سب سے اخیر راوی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا جو رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ اور خود اس واقعہ میں شریک تھیں، وہ اس وقت تک آنحضرت ﷺ کے عقد میں نہیں آئی تھیں، بلکہ اپنے پہلے شوہر ابوسلمہ بن عبدالاسد کے ساتھ حبش میں ہجرت کر کے گئی تھیں، مورخ یعقوبی نے بھی بہ تفصیل یہ واقعہ لکھا ہے۔ (ج ۲ ص: ۲۸، ۲۹) مطبوعہ لیڈن: ۱۸۸۳)

حبش میں کم وبیش ۸۳ مسلمان ہجرت کر کے گئے، (1) چند روز آرام سے گزرنے پائے تھے کہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم نے مکہ معظمہ کا رخ کیا۔ لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے۔ اس لئے بعض لوگ واپس چلے گئے اور اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں آ گئے۔

یہ روایت طبری (ج ۳ ص: ۱۱۹۳، ۱۱۹۴) اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے اور ممکن ہے کہ صحیح ہو۔ لیکن ان کتابوں میں اس خبر کے مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی، کفار بھی موجود تھے جب آپ نے یہ آیت پڑھی:

﴿ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴾ (۵۳/ النجم: ۲۰) تو شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیے۔

تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجیٰ۔

''یعنی (یہ بت) معظم ومحترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے۔''

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپ کی متابعت کی (اس روایت کا یہ آخری حصہ کہ چند کافروں کے سوا تمام جن وانس نے حضور ﷺ کے ساتھ ایک دفعہ سجدہ کیا، صحیح ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے باب قوله: ﴿ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴾ (۵۳/ النجم: ٦٢) مذکور ہے، (2) مگر باقی حصہ بے ہودہ اور ناقابل ذکر ہے اور اکثر کبار محدثین مثلاً: بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی (3) نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے، ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر (4) شہرت عام رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمال فن حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے، اس روایت کی صحت پر اصرار ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: (5)

وقد ذكرنا ان ثلاثة اسانيد منها على شرط الصحيح وهي مراسيل يحتج بمثلها من يحتج بالمراسيل۔

''ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت کی تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور یہ روایتیں مرسل ہیں اور ان سے وہ لوگ استدلال کر سکتے ہیں جو مرسل روایتوں کے قائل ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ کفار کی عادت تھی کہ جب آنحضرت ﷺ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے

---

(1) ابن هشام، ج۲، ص:۲۰۳۔ (2) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة نجم: ٤٨٦٢۔ (س)

(3) دیکھو زرقانی بر مواہب لدنیہ (ج۱ص:۳۲۶ وبعد) وشفائے قاضی عیاض (مع شرح شہاب خفاجی، ج۴، ص:۹۵ وبعد) وعینی شرح بخاری، تفسیر سورۂ نجم، (ج۹ص:۱۸۱) ونور النبراس۔ علامہ نووی کے یہ الفاظ ہیں: لا يصح فيه شيء لا من جهة النقل ولا من جهة العقل شرح مسلم (باب سجود التلاوة، ج۵، ص:۷۵) اور علامہ عینی لکھتے ہیں: فلا صحة له نقلا وعقلا (ج۹، ص:۱۸۱)۔ (4) دیکھو مواہب لدنیہ اور زرقانی واقعہ ہجرت حبشہ، (ج۱ص:۳۲۶ وبعد)۔ (5) زرقانی بر مواہب، جلد اول، صفحہ:۳۳۰۔

اور اپنے فقرے ملا دیتے، قرآن مجید کی آیت ذیل میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے:

﴿لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۝﴾ (٤١/ حٰمٓ السجدة:٢٦)

''اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں گڑبڑ کردو شاید تم غالب آ ؤ۔''

قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو یہ فقرے کہتے جاتے: [1]

واللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخرٰی فانھن الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی۔

''لات اور عزیٰ اور تیسرے بت مناۃ کی قسم یہ بلند و بزرگ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے جب سورۂ والنجم کی وہ آیتیں پڑھیں تو کسی شیطان (کافر) نے یہی فقرے آپ کی آواز میں ملا کر پڑھ دیئے ہوں گے، دور کے لوگوں کو (کفار میں سے) شبہ ہوا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ہی نے وہ الفاظ ادا کیے، اس واقعہ کا چرچا جب مسلمانوں میں ہوا ہوگا، تو لوگوں نے کہا ہوگا کہ کسی شیطان نے آپ کی طرف سے وہ فقرے کہہ دیئے ہوں گے، اس واقعہ نے روایتوں میں صورت بدل بدل کر یہ صورت اختیار کر لی کہ شیطان نے آنحضرت ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے اور چونکہ عام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان سے بول سکتا ہے اس لئے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کر لیا۔ یہ صرف قیاس نہیں بلکہ اگلے محققین نے بھی تصریح کی ہے، مواہب [2] میں ہے:

قیل انہ لما وصل الی قولہ ومناۃ الثالثۃ الاخری خشی المشرکون ان یأتی بعدھا بشيء یذم الھتھم فبادروا الی ذالک الکلام فخلطوہ فی تلاوۃ النبی ﷺ علی عادتھم فی قولھم لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ او المراد بالشیطان شیطان الانس۔

''بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ اس آیت پر پہنچے ﴿وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى۝﴾ تو مشرکوں کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ اب ان کے معبودوں کی کچھ برائی کا بیان ہوگا، اس بنا پر انہوں نے جھٹ سے آنحضرت ﷺ کی تلاوت میں یہ فقرے غلط کر کے پڑھ دیے جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ کہتے کہ قرآن پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑبڑ مچا دو۔ یا شیطان سے شیطان آدمی مراد ہے۔''

جو لوگ حبش سے واپس آ گئے تھے، اہل مکہ نے اب ان کو اور زیادہ ستانا شروع کیا اور اس قدر اذیت

---

[1] معجم البلدان لفظ عزیٰ۔ (ج٦، ص:١٦٦ طبع اول: ١٣٢٤ھ/ ١٩٠٦ء مصر)

[2] الزرقانی علی المواھب، ج١، ص: ٣٣١، ٣٣٢۔

دی کہ وہ دوبارہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن اب کی ہجرت کچھ آسان نہ تھی۔ کفار نے سخت مزاحمت کی تاہم جس طرح ہوسکا بہت سے صحابہ جن کی تعداد قریباً سو تک پہنچتی ہے مکہ سے نکل گئے اور حبش میں اقامت اختیار کی۔ جب آنحضرت ﷺ نے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تو کچھ لوگ فوراً واپس چلے آئے اور جو لوگ رہ گئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ۷ ھ میں ان کو بلالیا۔ [1]

کفار کی ایذا و تعدی اب کمزوروں اور بیکسوں پر محدود نہ تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قبیلہ معزز اور طاقتور قبیلہ تھا، ان کے یاور اور انصار بھی کم نہ تھے، تاہم وہ بھی کفار کے ظلم سے تنگ آگئے اور بالآخر حبش کی ہجرت کا ارادہ کیا۔ برک الغماد جو مکہ معظمہ سے یمن کی سمت پانچ دن کی راہ ہے، [2] وہاں تک پہنچے تھے کہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہوگئی جو قبیلہ قارہ کا رئیس تھا، اس نے پوچھا: کہاں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا ''میری قوم مجھ کو رہنے نہیں دیتی، چاہتا ہوں کہ کہیں الگ جا کر خدا کی عبادت کروں'' ابن الدغنہ نے کہا: ''یہ نہیں ہوسکتا کہ تم جیسا شخص مکہ سے نکل جائے، میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں'' تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے ساتھ واپس آئے، ابن الدغنہ مکہ پہنچ کر تمام سرداران قریش سے ملا اور کہا کہ ''ایسے شخص کو نکالتے ہو جو مہمان نواز ہے، مفلسوں کا مددگار ہے، رشتہ داروں کو پالتا ہے، مصیبتوں میں کام آتا ہے''۔ قریش نے کہا لیکن شرط یہ ہے کہ ابوبکر نمازوں میں چپکے جو چاہیں پڑھیں، آواز سے قرآن پڑھتے ہیں تو ہماری عورتوں اور بچوں پر اثر پڑتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چندروز یہ پابندی اختیار کی لیکن آخر انہوں نے گھر کے پاس ایک مسجد بنالی اور اس میں خضوع و خشوع کے ساتھ بہ آواز قرآن پڑھتے تھے، وہ نہایت رقیق القلب تھے، قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے، عورتیں اور بچے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے۔ قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی، اس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھ کو خدا کی حفاظت بس ہے، میں تمہاری جوار سے استعفیٰ دیتا ہوں۔'' [3]

محرم ۷ نبوی شعب ابوطالب میں محصور ہونا

قریش دیکھتے تھے کہ اس روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، عمر اور حمزہ رضی اللہ عنہما جیسے لوگ ایمان لاچکے، نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دی، سفراء بے نیل مرام واپس آئے، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے اب یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ ''کوئی شخص نہ خاندان بنی ہاشم سے قربت کرے گا نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا۔ جب تک وہ

[1] یہ تمام تفصیل طبقات ابن سعد (ج ا، قسم اول، ص: ۱۳۸، ۱۳۹) میں ہے، بعض مؤرخوں نے اس ہجرت ثانیہ کا ذکر نہیں کیا اور بعض نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ [2] زرقانی بر مواہب، جلد اول، صفحہ: ۳۴۴ ذکر ہجرت ثانیہ حبش۔ [3] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدينة: ۳۹۰۵ میں ہے۔

محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ نہ کر دیں [1] یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔

ابو طالب مجبور ہو کر تمام خاندان بنی ہاشم کے ساتھ شعب ابو طالب [2] میں پناہ گزیں ہوئے۔ تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی۔ یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثوں میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، چنانچہ سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے، حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا۔ میں نے اس کو پانی سے دھویا۔ پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔ [3]

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ لیکن بعض رحمدلوں کو ترس بھی آتا تھا۔ ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھتیجا تھا۔ تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجے۔ راہ میں ابو جہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا۔ اتفاق سے ابو البختری کہیں سے آ گیا، وہ اگرچہ کافر تھا، لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لئے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے۔ [4]

مسلسل تین برس تک آنحضرت ﷺ اور تمام آل ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں، بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود انہی کی طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک ہوئی، ہشام عامری خاندانِ بنو ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا، وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا، ایک دن وہ زہیر کے پاس جو عبد المطلب کے نواسے تھے، گیا اور کہا: ''کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو؟'' زہیر نے کہا: ''کیا کروں تنہا ہوں، ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں۔'' ہشام نے کہا: میں موجود ہوں۔ دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے، ابو البختری، ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا۔ دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔ زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ''اے اہل مکہ! یہ کیا انصاف ہے! ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو، خدا کی قسم! جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔'' ابو جہل برابر سے بولا: ''ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔'' زمعہ نے کہا ''تو جھوٹ کہتا ہے۔ جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے۔'' غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی، مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابو البختری، زہیر سب ہتھیار باندھ باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے [5] بقول ابن سعد یہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے، اسی زمانہ میں معراج واقع ہوئی، جس کی تفصیل

[1] اس معاہدہ کا ذکر طبری (ج ۳، ص:۱۱۸۹) نے اور ابن سعد (ج ۱، ص:۱۳۹ وابن ہشام، ج ۱، ص:۲۱۵) وغیرہ نے تفصیل سے کیا ہے، لیکن یہ الفاظ کہ وہ محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ کر دیں صرف مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں۔

[2] یہ پہاڑ کا ایک درہ تھا۔ جو خاندان بنو ہاشم کا موروثی تھا۔ [3] روض الانف، ج ۱، ص:۲۳۲۔

[4] ابن ہشام، ج ۱، ص:۲۱۶۔ [5] یہ تفصیل ابن ہشام، (ج ۱، ص:۲۲۸، ۲۲۹) طبری، (ج ۳، ص:۱۱۹۶ تا ۱۱۹۸) وغیرہ میں مذکور ہے، اخیر واقعہ صرف ابن سعد نے بیان کیا ہے۔

تیسرے حصہ میں آئے گی۔ اسی زمانہ میں نماز پنجگانہ فرض ہوئی۔

۱۰ نبوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات

آنحضرت ﷺ اب شعب ابی طالب سے نکلے تھے اور چند روز قریش کے جور و ظلم سے امان ملی تھی کہ ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔

ابو طالب کی وفات کے وقت آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے، ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ پہلے سے موجود تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مرتے مرتے (لا الہ الا اللہ) کہہ لیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔'' ابو جہل اور ابن ابی امیہ نے کہا: ''ابو طالب! کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے۔'' بالآخر ابو طالب نے کہا: ''میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔'' پھر آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے کہا: ''میں وہ کلمہ کہہ دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کروں گا جب تک کہ خدا مجھ کو اس سے منع نہ کر دے۔'' [1]

یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ مرتے وقت ابو طالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے (جو اس وقت تک کافر تھے) کان لگا کر سنا تو آنحضرت ﷺ سے کہا کہ تم نے جس کلمہ کے لئے کہا تھا ابو طالب وہی کہہ رہے ہیں۔ [2] اس بنا پر ابو طالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے، لیکن چونکہ بخاری کی روایت عموماً صحیح مانی جاتی ہے۔ اس لئے محدثین زیادہ تر ان کے کفر ہی کے قائل ہیں۔

لیکن محدثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابل حجت نہیں کہ اخیر راوی مسیب ہیں۔ جو فتح مکہ میں اسلام لائے اور ابو طالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے۔ اسی بنا پر علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ''روایت مرسل ہے۔'' [3] ابن اسحاق کے سلسلہ روایت میں عباس بن عبداللہ بن معبد اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ یہ دونوں ثقہ ہیں۔ لیکن بیچ کا ایک راوی یہاں بھی رہ گیا ہے، اس بنا پر دونوں روایتوں کے درجہ استناد میں چنداں فرق نہیں۔ [4]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا قال المشرك عند الموت لا اله الا الله: ۱۳۶۰ وباب قصة ابی طالب: ۳۸۸٤ اور مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی صحة اسلام من حضره الموت: ۱۳۲ ابو طالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے بخاری میں نہیں۔ [2] ابن ہشام مطبوعہ مصر، صفحہ ۱۴۶۔ نوٹ: یہ روایت درست نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے سیر اعلام النبلاء، ج ۱ص: ۱۲۳ ملاحظہ فرمائیں۔ [3] عینی، کتاب الجنائز، جلد ۴، صفحہ: ۲۰۰ (س) [4] مصنف کے اس نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ بخاری کی روایت کے آخر راوی حضرت مسیب رضی اللہ عنہ ہیں جو صحابی ہیں۔ ظاہر ہے کہ صحابی کی روایت کسی صحابی ہی سے ہو گی اس لئے مراسیل صحابہ حجت ہیں اور ابن اسحاق کی روایت منقطع ہے اور چھوٹا ہوا راوی صحابی نہیں ہے، خود ابن اسحاق بھی استناد کا اعلیٰ درجہ نہیں رکھتے اس لئے دونوں روایتوں کو یکساں نہیں قرار دیا جا سکتا۔ علاوہ بریں حضرت مسیب رضی اللہ عنہ کی اس روایت کی تائید میں خود حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جو اسی مسیب والی روایت سے اوپر صحیح بخاری، باب قصه ابی طالب: ۳۸۸۳ میں موجود ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے چچا (ابو طالب) کو آپ ﷺ سے کیا فائدہ پہنچا کہ وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے لئے آپ کے دشمنوں سے برسر پرخاش رہتے تھے۔ فرمایا: ''وہ دوزخ کی آگ میں صرف ٹخنے تک ہیں مگر اس کا اثر بھی دماغ تک پہنچ جاتا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابو طالب نے آنحضرت ﷺ کے لئے جو جان نثاریاں کیں، اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ اپنے جگر گوشوں تک کو آپ ﷺ پر نثار کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی محبت میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا۔ آپ ﷺ کی خاطر محصور ہوئے، فاقے اٹھائے، شہر سے نکالے گئے، تین تین برس تک آب و دانہ بند رہا، کیا یہ محبت، یہ جوش، یہ جان نثاریاں سب ضائع جائیں گی؟

ابو طالب، آنحضرت ﷺ سے ۳۵ برس عمر میں بڑے تھے، رسول اللہ ﷺ کو ان سے نہایت محبت تھی، ایک دفعہ وہ بیمار پڑے، آنحضرت ﷺ ان کی عیادت کے لئے گئے تو انہوں نے کہا: "بھتیجے! جس خدا نے تجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے دعا نہیں مانگتا کہ مجھ کو اچھا کر دے"۔ آپ نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے، آنحضرت ﷺ سے کہا: خدا تیرا کہنا مانتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "آپ بھی اگر خدا کا کہنا مانیں تو وہ بھی آپ کا کہنا مانے۔" [1]

ابو طالب کی وفات کے چند ہی روز بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی وفات پائی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے ابو طالب سے پہلے انتقال کیا۔ اب آپ کے مددگار اور غمگسار دونوں اٹھ گئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم خود اپنی حالت میں مبتلا تھے، یہی زمانہ ہے جو اسلام کا سخت ترین زمانہ ہے اور خود آنحضرت ﷺ اس سال کو عام الحزن (سالِ غم) فرمایا کرتے تھے [2] حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رمضان ۱۰ نبوی میں وفات کی، ان کی عمر ۶۵ برس کی تھی، مقام حجون میں دفن کی گئیں، آنحضرت ﷺ خود ان کی قبر میں اترے۔ اس وقت تک نماز جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی۔ [3]

ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اٹھ جانے کے بعد قریش کو کس کا پاس تھا، اب وہ نہایت بے رحمی و بیباکی سے آنحضرت ﷺ کو ستاتے تھے، ایک دفعہ آپ ﷺ راہ میں جا رہے تھے، ایک شقی نے آ کر فرق مبارک پر خاک ڈال دی۔ اسی حالت میں آپ ﷺ گھر میں تشریف لائے، آپ کی صاحبزادی نے دیکھا تو پانی لے کر آئیں۔ آپ کا سر دھوتی تھیں اور جوشِ محبت سے روتی جاتی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: "جانِ پدر! رو نہیں، خدا تیرے باپ کو بچا لے گا۔" [4]

اہل مکہ سے تو قطعی ناامیدی تھی۔ اس لئے آپ نے ارادہ فرمایا کہ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں دعوت اسلام فرمائیں۔ طائف میں بڑے بڑے امراء اور ارباب اثر رہتے تھے۔ ان میں عمیر کا خاندان رئیس

(گزشتہ سے پیوستہ) اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوتے۔" اس سے معلوم ہوا کہ خود حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے علم میں تھا کہ ان کا خاتمہ توحید کے اقرار پر نہیں ہوا، اسی مضمون کی روایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی ہے جو صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب قصة ابی طالب: ۳۸۸۳ میں اسی موقع پر موجود ہے۔ (س)

[1] اصابه فی تمییز الصحابه ذکر ابی طالب، ۷، ص: ۱۱۳۔

[2] زرقانی بر مواهب لدنیه، ج ۱، ص: ۳٤٤۔ [3] یہ تفصیل ابن سعد میں ہے، ج ۸، فی النسآء، ص: ۱۱۔

[4] طبری، ج ۳، ص: ۱۱۹۹ اور ابن هشام، ج ۱، ص: ۲۵۲ ذکر وفاة خدیجة۔

القبائل تھا۔ یہ تین بھائی تھے عبد یا لیل، مسعود، حبیب، آنحضرت ﷺ ان کے پاس گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ ان تینوں نے جو جواب دیے وہ نہایت عبرت انگیز تھے۔ ایک نے کہا: ''اگر تجھ کو خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو کعبہ کا پردہ چاک کر رہا ہے۔'' دوسرے نے کہا: ''کیا خدا کو تیرے سوا اور کوئی نہیں ملتا تھا''۔ تیسرے نے کہا: ''میں بہر حال تجھ سے بات نہیں کر سکتا تو اگر سچا ہے تو تجھ سے گفتگو کرنا خلاف ادب ہے اور جھوٹا ہے تو گفتگو کے قابل نہیں۔''

ان بدبختوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، طائف کے بازاریوں کو ابھار دیا کہ آپ ﷺ کی ہنسی اڑائیں شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، یہ مجمع دورویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا، جب آپ ادھر سے گزرے تو آپ کے پاؤں پر پتھر مارنے شروع کر دیے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں، جب آپ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے، جب آپ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالیاں بجاتے جاتے۔ [1] آخر آپ ﷺ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں میں پناہ لی۔ یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا جو باوجود کفر کے شریف الطبع اور نیک نفس تھا، اس نے آپ ﷺ کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے غلام کے ہاتھ جس کا نام عداس تھا انگور کا خوشہ ایک کشتی میں رکھ کر بھیجا۔ اس سفر میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے طائف سے پھر کر چند روز نخلہ میں قیام کیا، پھر حراء میں تشریف لائے اور مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے سکتے ہو، عرب کا شعار تھا کہ جب کوئی ان سے طالب حمایت ہوتا تو گو دشمن ہوتا انکار نہیں کر سکتے تھے، مطعم نے یہ درخواست منظور کی، بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ''ہتھیار لگا کر حرم میں جاؤ'' رسول اللہ ﷺ مکہ میں تشریف لائے، مطعم اونٹ پر سوار ساتھ تھا، حرم کے پاس آیا تو پکارا کہ میں نے محمد ﷺ کو پناہ دی ہے۔'' آنحضرت ﷺ حرم میں آئے نماز ادا کی اور دولت خانہ کو واپس گئے، مطعم اور اس کے بیٹے آپ ﷺ کو تلواروں کے سایہ میں لائے۔ [3]

مطعم نے کفر کی حالت میں غزوۂ بدر سے پہلے وفات کی، حضرت حسان رضی اللہ عنہ جو دربار رسالت کے

---

[1] یہ پوری تفصیل مواہب لدنیہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ (ج ۱، ص: ۳۴۵) اور طبری (ج ۳، ص: ۱۱۹۹ تا ۱۲۰۱) و ابن ہشام، (ج ۱، ص: ۲۵۳، ۲۵۴) میں ہے۔ [2] (طبقات ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۴۲) کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف نگاہوں کو کس طرح مختلف نظر آتا ہے مارگولیتھ نے (نعوذ باللہ) آنحضرت ﷺ کے اس سفر کو سوئے تدبیر میں داخل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ طائف مکہ سے بالکل قریب اور ان کے زیر اثر تھا اور وہاں رؤسائے مکہ کے باغ تھے جس کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی اس لئے جب مکہ کے تمام رؤسا آنحضرت ﷺ کے خلاف تھے تو طائف کے لوگوں سے کیا اُمید ہو سکتی تھی؟ لیکن سر ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کا زور اعتقاد اور اعتماد النفس تھا کہ باوجود تمام ناکامیوں کے وہ تنہا ایک مخالف شہر میں آ گئے اور تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا ع والفضل ماشهدت به الاعداء۔

[3] ابن سعد، ج ۱، صفحہ: ۱۴۲ کسی قدر تفصیل مواہب لدنیہ سے اضافہ کی گئی ہے جو ابن اسحاق کی روایت ہے۔ تعجب ہے کہ ابن ہشام نے یہ حالات قلم انداز کیے ہیں۔

شاعر تھے، انہوں نے مرثیہ لکھا، زرقانی نے یہ مرثیہ بدر میں نقل کیا ہے [1] اور لکھا ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں، مطعم کا یہ کام بے شبہ مدح کا مستحق تھا، لیکن آجکل کے مسلمان حضرت حسان رضی اللہ عنہ اور زرقانی سے زیادہ شیفتہ اسلام ہیں، اس لئے معلوم نہیں حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا یہ فعل آج بھی پسند کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

قبائل کا دورہ

آنحضرت ﷺ کا معمول تھا، جب حج کا زمانہ آتا تھا اور عرب کے قبائل ہر طرف سے آ کر مکہ کے آس پاس اترتے تو آپ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے، عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے، جن میں دور دور کے قبائل آتے تھے، آپ ان میلوں میں جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے۔

ان میلوں میں سے عکاظ جو اہل عرب کا قومی اور علمی دنگل تھا اور مجنہ اور ذوالمجاز کا نام مؤرخین نے خاص طور پر لیا ہے، قبائلِ عرب میں سے بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان، مرہ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنونضر، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ۔ مشہور قبائل ہیں۔ [2] ان سب قبائل کے پاس آپ ﷺ تشریف لے گئے، لیکن ابولہب ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتا اور جب آپ کسی مجمع میں تقریر کرتے تو برابر سے کہتا کہ ''دین سے پھر گیا ہے اور جھوٹ کہتا ہے۔'' [3]

بنی حنیفہ یمامہ میں آباد تھے، ان لوگوں نے نہایت تلخی کے ساتھ جواب دیا۔ [4] مسیلمہ کذاب جس نے آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کیا، اسی قبیلہ کا رئیس تھا۔

قبیلہ بنو ذہل بن شیبان کے پاس جب آپ ﷺ گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مفروق سے کہا: ''تم نے کسی پیغمبر کا تذکرہ سنا ہے؟ وہ یہی ہیں۔'' مفروق نے آنحضرت ﷺ کی طرف رخ کر کے کہا: ''برادر قریش! تم کیا تلقین کرتے ہو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا ایک ہے اور میں اس کا پیغمبر ہوں'' اور یہ آیتیں پڑھیں:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾

(٦/ الانعام:١٥٢)

''کہہ دو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ خدا نے کیا چیزیں حرام کی ہیں، یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کا حق خدمت بجا لاؤ اور اپنے بچوں کو افلاس کے خیال سے قتل نہ کرو،

[1] زرقانی، ج١، ص:٥١٦۔ [2] ابن سعد، (ج١، ص:١٤٥) نے ان تمام قبائل کا ذکر کیا ہے۔
[3] (ابن سعد، ج١، ص:١٤٥) ومستدرك حاكم، ج١، ص: ١٥، حیدر آباد، (س)۔
[4] ابن هشام، ج١، ص:٢٥٦۔

ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیں گے۔ فحش باتوں کے پاس نہ جاؤ۔ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور آدمی کی جان جس کو خدا نے حرام کیا ہے، ناحق ہلاک نہ کرو۔"

اس قبیلہ کے رؤساء، مفروق، مثنیٰ اور ہانی بن قبیصہ تھے اور وہ سب اس موقع پر موجود تھے۔ ان لوگوں نے کلام کی تحسین کی لیکن کہا کہ "مدتوں کا خاندانی دین دفعتہً چھوڑ دینا زوداعتقادی ہے"۔ اس کے علاوہ ہم کسریٰ کے زیر اثر ہیں اور معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم اور کسی کے اثر میں نہ آئیں گے"۔ آپ نے اس کی راست گوئی کی تحسین کی اور فرمایا کہ "خدا اپنے دین کی آپ مدد کرے گا۔" ❶

قبیلہ بنو عامر کے پاس گئے تو ایک شخص نے جس کا نام (بحیرہ بن) فراس تھا۔ آپ ﷺ کی تقریر سن کر کہا: "یہ شخص مجھ کو ہاتھ آ جائے تو میں تمام عرب کو مسخر کر لوں۔" پھر آپ ﷺ سے پوچھا کہ "اگر ہم تمہارا ساتھ دیں اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آ جاؤ تو تمہارے بعد ریاست ہم کو ملے گی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ خدا کے ہاتھ ہے۔" اس نے کہا: "ہم اپنا سینہ عرب کی آماج گاہ بنائیں اور حکومت غیروں کے ہاتھ آئے، ہم کو یہ غرض نہیں۔" ❷

قریش کی آپ ﷺ کو ایذا رسانی

اسباب مذکورۂ بالا کی بنا پر قریش نے آنحضرت ﷺ کی سخت مخالفت کی اور چاہا کہ آپ ﷺ کو اس قدر ستائیں کہ آپ مجبور ہو کر تبلیغ اسلام سے دست بردار ہو جائیں، سوئے اتفاق یہ کہ جو کفار آپ کے ہمسایہ تھے یعنی ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص سب قریش کے سربرآوردہ رؤسا تھے اور یہی سب سے بڑھ کر آپ کے دشمن تھے، ❸ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپ کی گردن پر اوجھڑی لا کر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردن مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں۔ آپ کی روحانی قوت اثر کو دیکھ کر لوگ جادوگر کہتے، دعوائے نبوت کو سن کر مجنوں کہتے، باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے ❹ نماز جماعت میں قرآن زور سے پڑھتے، تو قرآن، قرآن کے لانے والے (رسول اللہ ﷺ) اور قرآن کے اتارنے والے (خدا) کو گالیاں دیتے۔ ❺

ایک دفعہ آپ ﷺ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش بھی موجود تھے، ابوجہل نے کہا "کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا کہ جب محمد ﷺ سجدہ میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا۔" عقبہ نے کہا: "یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں۔" چنانچہ اوجھ لا کر آپ کی گردن پر ڈال

---

❶ روض الانف، بحوالہ قاسم بن ثابت، ج ۱، ص: ۲٦٤، ۲٦٥۔ ❷ طبری، ج ۳، ص: ۱۲۰۵ (س) و ابن ہشام، ج ۱، ص: ۲٥٦۔ ❸ ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۳٤۔ ❹ مسند امام ابن حنبل، ج ۱، ص: ۳۰۲۔
❺ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ بنی اسرائیل، باب لا تجهر بصلاتك الخ: ٤٧٢٢۔

دی، قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے، کسی نے جا کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر کی، وہ اگرچہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں لیکن جوشِ محبت سے دوڑی آئیں اور اوجھ ہٹا کر عقبہ کو برا بھلا کہا اور بددعائیں دیں۔ ❶

آنحضرت ﷺ جب کہیں کسی مجمعِ عام میں دعوتِ اسلام کا وعظ فرماتے تو ابولہب جو آپ کے ساتھ ساتھ رہتا تھا برابر سے کہتا جاتا کہ ''یہ جھوٹ کہتا ہے۔'' ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب کہ میں اسلام نہیں لایا تھا آنحضرت ﷺ بازار ذوالمجاز میں گئے اور مجمع میں گھس کر لوگوں سے کہا کہ ''لا الہ الا اللہ کہو۔'' ابوجہل آپ پر خاک پھینکتا جاتا تھا اور کہتا کہ ''اس کے فریب میں نہ آنا، یہ چاہتا ہے کہ تم لات وعزیٰ کی پرستش چھوڑ دو۔'' ❷ طائف میں کفار نے آپ ﷺ کو جو اذیتیں پہنچائیں ان کا بیان پیچھے گزر چکا۔

ایک دفعہ آپ ﷺ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ نے آپ کی گردن میں چادر لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچی، اتفاقاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے اور آپ کا شانہ پکڑ کر عقبہ کے ہاتھ سے چھڑایا اور کہا کہ ''اس شخص کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔'' ❸

جو لوگ آنحضرت ﷺ کی دشمنی میں نہایت سرگرم تھے اور رات دن اسی شغل میں رہتے تھے ان کے نام جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں لکھے ہیں حسب ذیل ہیں:

''ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، حارث بن قیس بن عدی، ولید بن مغیرہ، امیہ، ابی بن خلف، ابوقیس بن فاکہہ بن مغیرہ، عاص بن وائل، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، زہیر بن ابی امیہ، سائب بن سیفی، اسود بن عبدالاسد، عاص بن سعید بن العاص، عاص بن ہاشم، عقبہ بن ابی معیط، ابن الاصدی ہذلی، حکم بن ابی العاص، عدی بن حمراء۔'' ❹

یہ سب کے سب آنحضرت ﷺ کے ہمسایہ اور ان میں سے اکثر صاحب جاہ واقتدار تھے۔ یہ جو کچھ ہوا، گو نہایت درد انگیز اور حسرت خیز تھا۔ لیکن تعجب انگیز نہ تھا، دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں بہ رغبت سن لی گئی ہوں، حضرت نوح علیہ السلام کو سینکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور وحشت کا سامنا رہا، یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے۔ تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دار ورسن کا منظر پیش آیا۔ اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلہ واقعات کی

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب اذا القی علی ظهر المصلی قذرا وجیفة الخ: ۲۴۰، کتاب الصلاة: ۵۲۰ وکتاب الجهاد، باب الدعاء علی المشرکین بالهزیمة: ۲۹۳۴ وصحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین: ۴۶۴۹۔ ❷ مسند امام ابن حنبل، ج ۴، ص: ۶۳۔

❸ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ما لقی النبی ﷺ واصحابه من المشرکین بمکة: ۳۸۵۶۔

❹ طبقات ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۳۳، ۱۳۴۔

غیر معمولی کڑی نہ تھی۔ لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں سرور عالم ﷺ نے کیا کیا؟

مسلمانوں کا گھبرانا اور آپ ﷺ کا تسلی دینا

سقراط (زہر کا) پیالہ پی کر فنا ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے مخالفت سے تنگ آ کر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایت نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے، [1] لیکن سرور کائنات ﷺ کا فرض ان سب سے بالاتر تھا، حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ نے جب قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے تو آپ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ "تم سے پہلے وہ لوگ گزرے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے، تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے، خدا اس کام کو پورا کرے گا یہاں تک کہ شتر سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا۔" [2]

کیا یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری نہیں ہوئی؟

---

[1] حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دینے کا قصہ موجودہ چاروں انجیلوں میں موجود ہے لیکن قرآن کریم نے اس کی بڑی سختی سے تردید کی ہے اور کہا ہے کہ درحقیقت یہ غلط فہمی ہے ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے، انسانی معلومات کی ترقی کے ساتھ قرآن کریم کی صداقت خود بخود واضح ہوتی ہے چند سو سال پہلے انجیل برناباس کا نسخہ دریافت ہوا تھا اس میں برناباس نے نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی نہیں دی گئی تھی بلکہ ان کی جگہ یہوداہ اسکریوتی مصلوب ہوا تھا، حال ہی میں انجیل کا ایک اور نسخہ دریافت ہوا ہے جو پطرس حواری کی طرف منسوب ہے اس میں بالکل صاف الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دینے سے کچھ پہلے آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ (ملخص حاشیہ بائبل سے قرآن تک کا مقدمہ صفحہ: ٦٦، ٦٧، ١٢) منجانب: مصحح محمد محی الدین سواتی)۔

[2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ما لقی النبی ﷺ واصحابه من المشركين بمكة: ٣٨٥٢، باب علامات النبوة: ٣٦١٢، وكتاب الاكراه، باب من اختار الضرب الخ: ٦٩٤٣۔

مدینہ منورہ اور انصار رضی اللہ عنہم

آفتاب کی روشنی دور پہنچ کر تیز ہوتی ہے، شمیم گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بنتی ہے، آفتاب اسلام مکہ میں طلوع ہوا لیکن کرنیں مدینہ کے افق پر چمکیں۔

مدینہ کا اصلی نام یثرب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہاں آ کر قیام کیا تو اس کا نام مدینۃ النبی یعنی ''پیغمبر ﷺ کا شہر'' پڑ گیا اور پھر مختصر ہو کر مدینہ مشہور ہو گیا۔

یہ شہر مدتوں سے آباد ہے، بہت قدیم زمانہ میں یہودی یہاں آ کر آباد ہوئے۔ ان کی نسلیں کثرت سے پھیلیں اور مدینہ کے اطراف ان کے قبضہ میں آ گئے۔ انہوں نے مدینہ اور اس کے حوالی میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے تھے اور ان میں سکونت رکھتے تھے (یہود کے متعلق زائد تحقیق آگے آئے گی)۔

انصار اصل میں یمن کے رہنے والے اور قحطان کے خاندان سے تھے، یمن میں جب مشہور سیلاب آیا جس کو ''سیلِ عرم'' کہتے ہیں۔ یہ لوگ یمن سے نکل کر مدینہ میں آباد ہوئے، یہ دو بھائی تھے، اوس اور خزرج تمام انصار انہی دو کے خاندان سے ہیں۔ [1] یہ خاندان جب یثرب میں آیا تو یہود نہایت اقتدار اور اثر رکھتے تھے۔ آس پاس کے مقامات ان کے قبضہ میں تھے اور دولت و مال سے مالا مال تھے، چونکہ آل و اولاد کی کثرت سے بیس اکیس قبیلے بن گئے تھے اس لئے دور دور تک بستیاں بسا لی تھیں، انصار کچھ زمانہ تک ان سے الگ رہے، لیکن ان کا زور اور اثر دیکھ کر بالآخر ان کے حلیف۔ [2] بن گئے، ایک مدت تک یہ حالت قائم رہی، لیکن اب انصار کا خاندان پھیلتا جاتا تھا اور اقتدار حاصل کرتا جاتا تھا، یہود نے پیش بینی کے لحاظ سے ان سے معاہدہ توڑ دیا۔

یہودیوں میں ایک رئیس فطیون پیدا ہوا جو نہایت عیاش اور بدکار تھا، اس نے یہ حکم دیا کہ جو دوشیزہ لڑکی بیاہی جائے، پہلے اس کے شبستان عیش میں آئے، یہود نے اس کو گوارا کر لیا تھا، لیکن جب انصار کی نوبت آئی تو انہوں نے سرتابی کی، اس زمانہ میں انصار کا سردار ایک شخص مالک بن عجلان تھا، اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گزری، مالک کو غیرت آئی، اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی، اس نے کہا: ''ہاں! لیکن کل جو کچھ ہو گا اس سے بھی بڑھ کر ہے''۔ دوسرے دن حسبِ دستور جب مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانے کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ گیا اور فطیون کو قتل کر کے شام کو بھاگ گیا، یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابو جبلہ حکمران تھا اس نے یہ حالات سنے تو ایک فوج گراں لے کر آیا اور اوس اور خزرج کے رؤسا کو بلا کر ان کو خلعت اور صلے دیے، پھر رؤسائے یہود کی دعوت کی اور ایک ایک کو دھوکے سے قتل کرا دیا، یہود کا زور

[1] انصار کے نسب اور مدینہ میں آباد ہونے کی پوری تفصیل وفاء الوفاء، جلد اول، صفحہ: ۱۱۶ تا ۱۵۲ میں مذکور ہے۔
[2] جو قبیلے آپس میں ایک دوسرے کی اعانت وشرکت کا (تحالف) معاہدہ کرتے تھے وہ باہم حلیف کہلاتے تھے۔

اب ٹوٹ گیا اور انصار نے نئے سرے سے قوت حاصل کی۔ [1]

انصار نے مدینہ اور حوالی مدینہ میں کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے۔ اوس اور خزرج ایک مدت تک باہم متحد رہے لیکن پھر عرب کی فطرت کے موافق خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں اور سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں، سب سے اخیر لڑائی جس کو بعاث کہتے ہیں میں ایسے زور کا معرکہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے تمام نامور لڑ لڑ کر مر گئے، انصار اب اس قدر ضعیف ہوگئے کہ انہوں نے قریش کے پاس سفارت بھیجی کہ ہم کو حلیف بنا لیجئے۔ لیکن ابوجہل نے معاملہ درہم برہم کر دیا۔

انصار گو بت پرست تھے، تاہم چونکہ یہود سے میل جول تھا، اس لئے نبوت اور کتب آسمانی سے گوش آشنا تھے، یہود سے گو انصار اک گونہ رقابت رکھتے تھے۔ لیکن ان کے علمی فضل وکمال کے معترف تھے، یہود نے مدینہ میں جو علمی مدارس قائم کئے تھے اور جن کو بیت المدارس کہتے تھے (بخاری وغیرہ میں نام مذکور ہے) [2] ان میں توراۃ کی تعلیم ہوتی تھی، انصار جاہل تھے، اس لئے ان پر یہود کے علمی تفوق کا خواہ مخواہ اثر پڑتا تھا، یہاں تک کہ انصار میں سے جس کے اولاد زندہ نہیں رہتی تھی، وہ منت مانتا تھا کہ بچہ زندہ رہے گا تو یہودی بنا دیا جائے گا۔ [3]

یہودی عموماً یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک پیغمبر ابھی اور آنے والا ہے، اس بنا پر انصار بھی ایک پیغمبر موعود کے نام سے آشنا تھے۔

انصار میں ایک شخص، سوید بن صامت جو شاعری اور جنگ آوری میں ممتاز تھا، اس کو امثال لقمان کا نسخہ ہاتھ آ گیا تھا جس کو وہ کتاب آسمانی سمجھتا تھا، وہ ایک دفعہ حج کو گیا، آنحضرت ﷺ نے اس کے حالات سنے تو خود اس کے پاس تشریف لے گئے، اس نے امثال لقمان پڑھ کر سنایا، آپ نے فرمایا: ''میرے پاس اس سے بھی بہتر چیز ہے۔'' یہ کہہ کر قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، سوید نے تحسین کی، [4] اگرچہ وہ مدینہ واپس آ کر جنگ بعاث میں مارا گیا، لیکن اسلام کا معتقد ہو چکا تھا۔

سوید شجاعت اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا تھا، ایسے شخص کو اہل عرب ''کامل'' کہتے تھے اور اسی بنا پر سوید اسی لقب سے پکارا جاتا تھا، [5] سوید کے میلان اسلام کا اثر انصار پر پڑ چکا تھا۔

اوس اور خزرج کے معرکوں میں اوس کو جب شکست ہوئی تو اوس کے عمائد قریش کے پاس گئے کہ خزرج کے مقابلہ میں ان کو حلیف بنائیں، اس سفارت میں ایاس بن معاذ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کا

---

[1] وفاء الوفا، ج ۱، ص: ۱۲۶ یہ واقعہ مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے اور وفاء الوفاء میں یہ تمام روایتیں مذکور ہیں۔ (اس کا ذکر معجم البلدان، ج ۷، ص: ۴۲۸ و ۴۲۹ میں بھی ہے) [2] بخاری، کتاب الاکراہ، باب فی بیع المکرہ ونحوہ فی الحق وغیرہ: ۶۹۴۴۔ (س) [3] کتب تفسیر میں ﴿لا اکراہ فی الدین﴾ کی تفسیر دیکھو (ابن جریر، ج ۳، ص: ۹ مصر وابن کثیر، ج ۱، ص: ۳۱۰، ۳۱۱۔ مطبوعہ مصر: ۱۳۵۶ھ، ۱۹۳۷ء)۔

[4] البدایہ والنہایہ ابن کثیر، ج ۳، ص: ۱۴۷ (س) [5] سوید کا ذکر ابن ہشام (ج ۱، ص: ۲۵۷) میں ہے لیکن روض الانف (ج ۱، ص: ۲۶۵، ۲۶۶) میں زیادہ تفصیل ہے، اصابہ میں بھی اس کا حال ہے، لیکن نسب میں اختلاف ہے اور امثال لقمان کا ذکر نہیں ہے، طبری میں بھی سوید کا پورا واقعہ مع اس کے اشعار کے مذکور ہے، دیکھو، ج ۳، صفحہ: ۱۲۰۷۔

آنا معلوم ہوا تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں، ایاس نے ساتھیوں سے کہا کہ ''خدا کی قسم! تم جس غرض کے لئے آئے ہو یہ کام اس سے بھی بہتر ہے'' لیکن قافلہ سالار یعنی ابوالحیسیس نے کنکریاں اٹھا کر ان کے منہ پر ماریں اور کہا کہ ''ہم اس کام کے لئے نہیں آئے'' اس کے بعد بعاث کا معرکہ پیش آ گیا اور ایاس آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ مرتے وقت ایاس کی زبان پر تکبیر جاری تھی۔ ❶

انصار کے اسلام لانے کی ابتدا ۱۰ نبوی

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ حج کے زمانہ میں روسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے، اس سال (رجب ۱۰ نبوی) میں بھی آپ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے، عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد العقبہ ہے، خزرج کے چند اشخاص آپ کو نظر آئے، آپ نے ان سے نام و نسب پوچھا، انہوں نے کہا: ''خزرج'' آپ نے دعوت اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں، ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا: ''دیکھو، یہود ہم سے اس اولیت میں بازی نہ لے جائیں''۔ یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا، ❷ یہ چھ شخص تھے جن کے نام حسب ذیل ہیں: ❸

❶ طبری اور اصابہ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اصابہ میں لکھا ہے کہ ایاس کا حال امام بخاری ؒ نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ابن کثیر، ج ۳، ص: ۱۴۸)۔ (س)۔ ❷ مدینہ منورہ کے یہ حضرات جو پہلے پہل اسلام لائے۔ بعض مصنفین سیرت نے ان کے اس قبول اسلام کے واقعہ کا تذکرہ بیعت عقبہ اولیٰ کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ عنوان کتب سیرت کے ناظرین کے لئے اس وقت پریشانی کا موجب بن جاتا ہے جب وہ دوسری کتابوں (مثلاً مستدرک حاکم، ج ۲، ص: ۶۲۴، ابن کثیر علیٰ حاشیہ فتح البیان، ج ۹، ص: ۴۴۳) میں دیکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں بارہ آدمی تھے۔ اسی اختلاف روایت کے سبب سے بعض مصنفین سیرت، بیعت عقبہ ثانیہ میں بارہ آدمی اور بعض ۷۳ آدمی بتلاتے ہیں حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع میں اسلام لائے، ان کے واقعہ قبول اسلام کا عنوان بیعت عقبہ اولیٰ نہیں بلکہ ابتدائے اسلام انصار ہونا چاہیے اور دوسرے سال جبکہ گیارہ بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے ہیں یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے (سیرت حلبیہ، ج ۲، ص: ۸) حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے بصراحت فرمایا ہے کہ کنا احد عشر فی العقبۃ الاولیٰ من العام المقبل (مستدرک، ج ۲، صفحہ: ۶۲۴ حیدر آباد دکن) اس روایت میں حضرت عبادہ العام المقبل میں بیعت عقبہ اولیٰ کا ہونا فرماتے ہیں اور اس میں گیارہ آدمیوں کے ہونے کی صراحت فرماتے ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے پہلے جو لوگ آ کر اسلام قبول کر چکے تھے ان کا تعلق بیعت عقبہ اولیٰ سے نہیں ہے۔

جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام بیعت عقبہ اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا عنوان دیتے ہیں۔ یعنی ایک یہ بیعت عقبہ اولیٰ، دوسری وہ بیعت عقبہ جس میں گیارہ یا بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعت عقبہ جس میں ۷۳ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے اور یہ تینوں واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں پیش آئے اور جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ابتدائے اسلام انصار کے عنوان سے ذکر کیا ہے انہوں نے گیارہ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور ۷۳ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو تاریخ خمیس اول، صفحہ: ۳۰۶، ۳۱۶، ۳۱۷ و زرقانی علی المواہب، ج ۱، ص: ۳۶۲، ۳۶۷ (س)

❸ یہ واقعات تمام تاریخوں میں مذکور ہیں ہم نے زرقانی کو پیش نظر رکھا ہے، کیونکہ اس نے تمام مختلف روایتیں جمع کر دی ہیں ان لوگوں کی تعداد بعضوں نے آٹھ بیان کی ہے اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ، اور ابوالہیثم کا پہلے سے موجود ہونا ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے۔ دیکھو کتاب مذکور، جزء ثالث، انصار بدریین، صفحہ: ۴۴۔

واقدی کا بیان ہے کہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ اس واقعہ سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت ﷺ پر ایمان لا چکے تھے۔ (بعضوں نے ابوالہیثم بن تیہان کی جگہ عقبہ بن عامر بن نابی کا نام لیا ہے اور بعض نے جابر بن ریاب کے بجائے عبادہ بن صامت کو جگہ دی ہے۔ (س)

۱۔ ابوالہیثم بن تیہان	
۲۔ابوامامہ اسعد بن زرارہ	صحابہ میں سب سے پہلے ان ہی نے ۱ھ میں وفات پائی۔
۳۔عوف بن حارث	بدر میں شہادت پائی۔
۴۔رافع بن مالک بن عجلان	اس وقت تک جس قدر قرآن اتر چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے ان کو عنایت فرمایا، جنگ احد میں شہید ہوئے۔
۵۔قطبہ بن عامر بن حدیدہ	تینوں عقبات میں شریک رہے۔
۶۔جابر بن عبداللہ (بن ریاب)	(یہ مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے علاوہ تھے بدر وغیرہ میں شریک تھے)۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ ۱۱ نبوی

دوسرے سال بارہ شخص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی، اس کے ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی کہ احکام اسلام کے سکھانے کے لئے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ مصعب رضی اللہ عنہ ہاشم بن عبد مناف کے پوتے اور سابقین اسلام میں سے تھے، غزوۂ بدر میں لشکر کی علمبرداری کا منصب انہی کو ملا تھا، وہ مدینہ میں آ کر اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے مکان پر ٹھہرے جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے، روزانہ معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے، روزانہ ایک دو نئے آدمی اسلام قبول کرتے، رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا۔ صرف خطمہ، وائل، واقف کے چند گھرانے باقی رہ گئے۔ ابن سعد نے طبقات [1] میں یہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔

قبیلۂ اوس کے سردار، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے جب ان کے پاس جا کر اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے پہلے نفرت ظاہر کی۔ لیکن جب مصعب رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو پھر موم تھا، ان کا اسلام لانا تمام قبیلۂ اوس کا اسلام قبول کر لینا تھا۔

بیعتِ عقبہ ثانیہ ۱۲ نبوی

اگلے سال بہتر (۷۲) شخص حج کے زمانہ میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے (جو بت پرست تھے) چھپ کر بمقام منیٰ (عقبہ) آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے، انہوں نے انصار سے خطاب کر کے کہا: ''گروہ خزرج! محمد ﷺ اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر

[1] طبقات ابن سعد، ج ۱، قسم اول، ص: ۱۴۸۔

رہے، اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں۔ اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ ابھی سے جواب دے دو۔'' [1]

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے کہا: ''ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں۔'' وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابوالہیثم رضی اللہ عنہ نے بات کاٹ کر کہا، ''یارسول اللہ! ہمارے یہود سے تعلقات ہیں، بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ جب آپ کو قوت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں۔'' آپ ﷺ نے مسکرا کر فرمایا: ''نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔''

آپ نے اس گروہ میں سے بارہ شخص نقیب انتخاب کیے، جن کے نام خود انصار نے پیش کیے تھے، ان میں نو خزرج کے اور تین اوس کے تھے۔ ان کے نام حسب روایت ابن سعد [2] حسب ذیل ہیں:

۱۔ اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ	جنگ بعاث میں انہی کے باپ اوس کے سردار تھے۔
۲۔ ابوالہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ	
۳۔ سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ	جنگِ بدر میں شہید ہوئے۔
۴۔ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا، یہ امام نماز تھے۔
۵۔ سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔
۶۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ	مشہور شاعر ہیں۔ جنگِ موتہ میں شہید ہوئے۔
۷۔ سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ	معزز اور مشہور صحابی ہیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں انہوں نے ہی پہلے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔
۸۔ منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ	بیر معونہ میں شہید ہوئے۔
۹۔ براء بن معرور رضی اللہ عنہ	بیعت عقبہ میں انہوں نے انصار کی طرف تقریر کی تھی، آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔
۱۰۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔
عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ	مشہور صحابی ہیں، ان سے اکثر حدیثیں مروی ہیں۔
۱۲۔ رافع بن مالک رضی اللہ عنہ	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔

آنحضرت ﷺ نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی یہ تھیں: ''شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد اور افترا کے مرتکب نہ ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ ان سے جو اچھی بات کہیں گے اس سے سرتابی نہ کریں گے۔'' [3]

[1] یہ اور بعد کی تفصیل بھی طبقات، ج ۱، ص: ۱۴۹، ۱۵۰ پر ہے۔ [2] یہ نام ابن ہشام نے بھی لکھے ہیں، ج ۱، ص: ۲۶۷، ۲۶۸۔

[3] یہ صحیح بخاری کی روایت ہے۔ (کتاب مناقب الانصار باب وفود الانصار الی النبی ﷺ بمكة وبيعة العقبة: ۳۸۹۲۔ ۳۸۹۳) سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ یہ عقبہ اولیٰ کی شرائط ہیں، اخیر بیعت اس بات پر لی گئی تھی کہ انصار آپ ﷺ کی جان کی حفاظت کریں گے۔

جب انصار بیعت کر رہے تھے تو سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا ''بھائیو! یہ بھی خبر ہے کہ کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب وعجم اور جن وانس سے اعلانِ جنگ ہے۔'' سب نے کہا: ''ہاں ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں۔''

بارہ شخص جو نقیب انتخاب کیے گئے رئیس القبائل تھے، ان کا اسلام قبول کرنا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا، صبح کو اس بیعت کی اڑتی سی خبر پھیلی، قریش انصار کے پاس آئے اور شکایت کی، انصار کے ساتھ جو بت پرست تھے ان کو اس بیعت کی خبر نہ تھی، انہوں نے تکذیب کی کہ ''ایسا ہوتا تو ہم سے کیونکر چھپ سکتا تھا۔'' [1]

مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے روک ٹوک شروع کی۔ لیکن چوری چھپے لوگوں نے ہجرت شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ اکثر صحابہ چلے گئے، صرف آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما رہ گئے، جو لوگ مفلسی سے مجبور تھے، وہ مدت تک نہ جا سکے، یہ آیت انہی کی شان میں ہے:

﴿ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ﴾. (٤/ النسآء:٧٥)

''کمزور مرد، عورتیں اور بچے جو یہ کہتے ہیں کہ اے خدا! ہم کو اس شہر سے نکال کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔''

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے۔مسند احمد، ج٣، ص:٣٣٩۔٣٤٠، زاد المعاد، ج٣، ص:٤٧۔٤٩، سیر اعلام النبلاء، ج١، ص:١٥٥، ١٥٦؛ المغازی والسیر:١٢٥، ١٢٦؛ ابن ہشام، ج٢، ص:٦٥۔٦٦۔

۱ھ
ہجرت

(اس وقت جبکہ دعوت حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں، حافظِ عالم نے مسلمانوں کو دارالامان مدینہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن خود وجود اقدس ﷺ جو ان ستم گاروں کا حقیقی ہدف تھا، اپنے لئے حکم خدا کا منتظر تھا، مکہ کے باہر اطراف میں جو صاحبِ اثر مسلمان ہو چکے تھے وہ جان نثارانہ اپنی حفاظت کی خدمت پیش کرتے تھے۔ قبیلۂ دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا، اس کے رئیس طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اپنا قلعہ پیش کیا کہ آپ یہاں ہجرت کر آئیں لیکن آپ ﷺ نے انکار فرمایا۔ [1] اسی طرح بنی ہمدان کے ایک شخص نے بھی یہی خواہش کی تھی۔ بعد میں اس نے کہا کہ وہ اپنے اہلِ قبیلہ کو مطلع کر کے آیندہ سال آئے گا۔ [2] لیکن کارسازِ قضا وقدر نے یہ شرف صرف انصار کے لئے مخصوص کیا تھا۔ چنانچہ قبلِ ہجرت آنحضرت ﷺ نے خواب دیکھا کہ دارالہجرہ ایک پر باغ و بہار مقام ہے۔ خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہو گا لیکن وہ شہر مدینہ نکلا)۔ [3]

نبوت کا تیرھواں سال شروع ہوا اور اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم مدینہ پہنچ چکے تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت ﷺ نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا۔ یہ داستان نہایت پُر اثر ہے اور اسی وجہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی لکھا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں، لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ انہی سے سن کر کہا ہو گا اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینہ میں جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے۔ اس بنا پر انہوں نے دارالندوہ میں، جو دارالشوریٰ تھا، اجلاس عام کیا، ہر قبیلہ کے رؤسا یعنی عتبہ، ابوسفیان، جبیر بن مطعم، نضر بن حارث بن کلدہ ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب، حکیم بن حزام، ابوجہل، نبیہ ومنبہ، امیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ، یہ سب شریک تھے، لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں، ایک نے کہا: ''محمد ﷺ کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے۔'' دوسرے نے کہا: ''جلاوطن کر دینا کافی ہے''۔ ابوجہل نے کہا: ''ہر قبیلہ سے ایک شخص کا انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے، اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور آل ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے''۔ اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا اور جھٹ پٹے سے آ کر رسول اللہ ﷺ کے آستانہ مبارک کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے۔ اس لئے باہر ٹھہرے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان قاتل نفسہ لا یکفر: ۳۱۱۔

[2] مستدرک، ج ۲، ص: ۶۱۳ وزرقانی علی المواہب، ج ۱، ص: ۳۵۹۔

[3] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی ﷺ واصحابہ الی المدینۃ۔(س)

رہے کہ آنحضرت ﷺ نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی، تاہم آپ ﷺ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا آپ ہی کے پاس لا کر رکھتا تھا اس وقت بھی آپ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں، آپ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی، اس بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ ''مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے۔ میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا۔ تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا۔'' یہ سخت خطرے کا موقعہ تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ ﷺ کا بسترِ خواب، قتل گاہ کی زمین ہے لیکن فاتح خیبر کے لئے قتل گاہ، فرشِ گل تھا۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ ﷺ دو پہر کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر پر گئے، دستور کے موافق دروازہ پر دستک دی، اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''کچھ مشورہ کرنا ہے، سب کو ہٹا دو۔'' بولے کہ ''یہاں آپ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔'' (اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہو چکی تھی) آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہایت بیتابی سے کہا: ''میرا باپ آپ پر فدا ہو، کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہو گا؟'' ارشاد ہوا ''ہاں۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے لئے چار مہینہ سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں، عرض کی کہ ان میں سے ایک آپ پسند فرمائیں، محسن عالم کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہو سکتا تھا، ارشاد ہوا ''اچھا، مگر بہ قیمت۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجبوراً قبول کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت کمسن تھیں، ان کی بڑی بہن اسماء رضی اللہ عنہا نے جو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ماں تھیں، سفر کا سامان کیا، دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا، نطاق، جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی ہیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔ یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک ان کو ''ذات النطاقین'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ [1]

کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا، آنحضرت ﷺ ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا: ''مکہ! تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پہلے سے قرارداد ہو چکی تھی، دونوں صاحب پہلے جبل ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے، یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہ خلائق ہے۔ [2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں۔ جو کچھ خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرت ﷺ

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب الهجرة: ۳۹۰۵۔ (س) [2] یہ غار مکہ سے تین میل داہنی جانب ہے، پہاڑ کی چوٹی قریباً ایک میل بلند ہے، سمندر یہاں سے دکھائی دیتا ہے، دیکھو زرقانی، جلد ا، صفحہ: ۳۳۸۔ (س)

سے عرض کرتے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا اور آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کا دودھ پی لیتے، تین دن تک صرف یہی غذا تھی، لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو اسماء گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں، اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں۔ [1]

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت ﷺ کے بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا۔ [2] پھر آنحضرت ﷺ کی تلاش میں نکلے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آ گئے، آہٹ پا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غمزدہ ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ ''اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: [3]

﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (۹/ التوبۃ: ٤٠) ''گھبراؤ نہیں، خدا ہمارے ساتھ ہے۔''

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آ گئے تو خدا نے حکم دیا۔ دفعتہً ببول کا درخت اگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت ﷺ کو چھپا لیا، ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلہ بنا کر انڈے دیے، حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو مواہب لدنیہ [4] میں تفصیل سے نقل کیا ہے اور زرقانی [5] نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں، لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں اس روایت کا اصل راوی عون بن عمرو ہے، اس کی نسبت امام فنِ رجال یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کا قول ہے ''لا شيء'' یعنی ہیچ ہے، امام بخاری نے کہا ہے کہ ''وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے''۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابومصعب مکی ہے، وہ مجہول الحال ہے، چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال [6] میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کئے ہیں اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔ [7]

بہر حال چوتھے دن آپ غار سے نکلے، عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا، راہنمائی کے لئے اجرت پر مقرر کر لیا گیا۔ وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک رات دن برابر چلے گئے دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہو گئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سایہ میں آرام فرمالیں، چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھا دی، آنحضرت ﷺ نے آرام فرمایا، تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں، پاس ہی ایک چرواہا

---

[1] ابن هشام ج ١، ص: ٢٩٢ یہ پوری تفصیل صحیح بخاری، كتاب مناقب الانصار، باب الهجرة: ٣٩٠٥ وبعد میں ہے، باب مناقب المهاجرين: ٣٦٥٢ میں بعض مزید حالات ہیں وہ بھی ہم نے شامل کر لئے ہیں۔ [2] تاریخ طبری، ج٣، ص: ١٢٣٤۔(س) [3] صحیح بخاری، باب مناقب المهاجرين وفضلهم منهم ابو بكر: ٣٦٥٢۔

[4] مواهب لدنيه، ج١، ص: ٣٨٤، ٣٨٥۔ [5] زرقانی، ج١، ص: ٣٨٤۔ [6] میزان الاعتدال، ج٢، ص: ٣٠٩۔ [7] (سیرت النبی، ج٣، ص: ٦٦٣ تا ٦٦٩ طبع جدید: ١٩٩٨ء [وطبع هذا ٢٠١٢ء، ج٣، ص: ٤٨٩ تا ٤٩٠] میں بہ ضمن ''مشہور عام دلائل ومعجزات کی روایتی حیثیت'' ان روایات پر مفصل تنقید کی گئی ہے۔)(س)

بکریاں چرا رہا تھا، اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد وغبار سے صاف کر دے، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہا، برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے، دودھ لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا، آپ ﷺ نے پی کر فرمایا کہ ''کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا؟'' آفتاب اب ڈھل چکا تھا، اس لئے آپ وہاں سے روانہ ہوئے۔ [1]

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد ﷺ یا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک خون بہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائے گا، سراقہ بن جعشم [2] نے سنا تو انعام کے لالچ میں نکلا، عین اس حالت میں کہ آپ روانہ ہو رہے تھے، اس نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا، لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، وہ گر پڑا، ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جواب میں ''نہیں'' نکلا لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی، دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا اب کی بار گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے، گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال دیکھی، اب بھی وہی جواب تھا، لیکن مکرر تجربہ نے اس کی ہمت پست کر دی اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے پاس آ کر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمان امن لکھ دیا۔ [3]

حسن اتفاق یہ کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ شام سے تجارت کا سامان لے کر آ رہے تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کئے جو اس بے سروسامانی میں غنیمت تھے۔ [4]

ابن سعد نے طبقات [5] میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں گنائی ہیں۔ اگرچہ عرب کے نقشوں میں آج ان کا نشان نہیں ملتا، تاہم عقیدت مند صرف نام سے لذت یاب ہو سکتے ہیں، خرار، ثنیۃ المرۃ لقف، مدلجہ، مرجح، حدائد، اذاخر، رابغ (یہ مقام آج بھی حجاج کے رستہ میں آتا ہے، یہاں آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھی) ذا سلم، عثانیہ، قاحہ، عرج، جدوات، رکوبہ، عقیق، جثجاثہ۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی، تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا، معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے تھے کہ ''پیغمبر ﷺ آ رہے ہیں۔'' لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دو پہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے جاتے، ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے

[1] یہ پوری تفصیل حرف بہ حرف صحیح بخاری، باب مناقب المهاجرين: ۳۶۵۲ میں ہے، ہم نے تمام جزئیات اس لئے نقل کیں کہ اس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صفائی پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ [2] سراقہ بعد میں اسلام لائے اور جب ایران فتح ہوا اور کسریٰ کے زیورات لوٹ میں آئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی کو وہ زیورات پہنا کر عالم کی نیرنگی کا تماشا دیکھا۔

[3] صحيح بخاری، كتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ: ۳۹۰۶ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریشانی میں بھی دوات قلم ساتھ رہتا تھا۔ [4] ایضاً۔ [5] طبقات ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۵۷۔

قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ ''اہل عرب! لوتم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا۔'' 1 تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا، انصار ہتھیار سجا سجا کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے۔

مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے اس کو عالیہ اور قباء کہتے ہیں۔ یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے، ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا اور کلثوم بن الہدم خاندان کے افسر تھے۔ آنحضرت ﷺ یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوش مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا، یہ فخر ان کی قسمت میں تھا کہ میزبان دو عالم ﷺ نے انہی کی مہمانی قبول کی، انصار ہر طرف سے جوق در جوق آتے اور جوش عقیدت کے ساتھ سلام عرض کرتے۔ 2

اکثر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم جو آنحضرت ﷺ سے پہلے مدینہ میں آ چکے تھے، وہ بھی انہی کے گھر میں اترے تھے، چنانچہ حضرت ابوعبیدہ، مقداد، خباب، سہیل، صفوان، عیاض، عبداللہ بن مخرمہ، وہب بن سعد، معمر بن ابی سرح، عمیر بن عوف رضی اللہ عنہم، اب تک انہی کے مہمان تھے۔ 3

جناب امیر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے روانہ ہونے کے تین دن بعد مکہ سے چلے تھے، وہ بھی آ گئے اور یہیں ٹھہرے۔ تمام مؤرخین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہاں صرف چار دن قیام فرمایا، لیکن صحیح بخاری میں چودہ دن ہے 4 اور یہی قرین قیاس ہے۔

یہاں آپ ﷺ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرانا تھا، حضرت کلثوم رضی اللہ عنہ کی ایک افتادہ زمین تھی، جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں، یہیں دست مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی، یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے:

﴿ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ أَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۸)

''وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے رہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی بہت پسند ہے اور خدا صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپ ﷺ خود بھی کام کرتے تھے، بھاری بھاری پتھروں کے اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا، عقیدت مند آتے اور عرض کرتے: ''ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ چھوڑ

---

1 صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ۳۹۰۶۔ 2 صحیح بخاری، باب هجرة النبی ﷺ: ۳۹۰۵ میں ابن شہاب نے عروہ بن زبیر کے حوالے سے بنی عمرو بن عوف کے یہاں رسول اللہ ﷺ کے قیام فرمانے کا ذکر کیا ہے اور اسی باب میں انس بن مالک کی روایت: ۳۹۱۱ سے انصار کے سلام عرض کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ طبقات ابن سعد سیرت نبوی، صفحہ:۱۵۸۔ 3 ابن سعد، تذکرة کلثوم بن هدم، جزء ثالث، القسم الثانی فی البدریین من الانصار، ص:۱۴۹، ۱۵۰۔ 4 کتاب مناقب الانصار، باب مقدم النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ۳۹۳۲۔

دیں ہم اٹھالیں گے'' آپ ان کی درخواست قبول فرماتے لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھا لیتے۔ ❶

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ شاعر تھے، وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے اور جس طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کو گاتے جاتے ہیں، وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے:

اَفْلَحَ مَنْ یُّعَالِجُ الْمَسَاجِدَا	''وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا ہے
وَیَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ قَائِمًا وَّقَاعِدًا	اور اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے۔
وَلَا یَبِیْتُ اللَّیْلَ عَنْهُ رَاقِدًا	اور رات کو جاگتا رہتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے۔ ❷

قباء میں آپ کا داخلہ اسلام کے دور خاص کی ابتدا ہے، اس لئے مؤرخین نے اس تاریخ کو زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا ہے، اکثر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ آٹھ ربیع الاول ۱۳ نبوی (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی (محمد بن) موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ جمعرات کا دن اور فارسی ماہ تیر کی چوتھی تاریخ اور رومی ماہ ایلول ۹۳۳ اسکندری کی دسویں تاریخ تھی ❸ مؤرخ یعقوبی نے ہیئت دانوں سے یہ زائچہ نقل کیا ہے۔ ❹

آفتاب	برج سرطان میں	۲۳ درجہ ۲ دقیقہ پر
زحل	برج اسد میں	۲ درجہ
مشتری	برج حوت میں	۶ درجہ
زہرہ	برج اسد میں	۱۳ درجہ
عطارد	برج اسد میں	۱۵ درجہ

چودہ دن کے بعد (جمعہ کو) ❺ آپ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے۔ (راہ میں بنی سالم کے محلہ میں نماز کا وقت آ گیا، جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی، نماز سے پہلے خطبہ دیا، یہ آنحضرت ﷺ کی سب سے پہلی نماز جمعہ اور سب سے پہلا خطبہ نماز تھا۔ لوگوں کو جب تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف لوگ جوش مسرت سے پیش قدمی کے لئے دوڑے) آپ کے ننھیالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار سجا سجا کر آئے ❻ قباء سے مدینہ تک دورویہ جان نثاروں کی صفیں تھیں، راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے، ہر قبیلہ سامنے آ کر عرض کرتا ''حضور!

---

❶ وفاء الوفاء، بحوالہ طبرانی کبیر، ج ۱، ص: ۱۸۰۔ ❷ وفاء الوفاء، بحوالہ ابن ابی شیبہ، ج ۱، ص: ۱۸۱ مصر۔ ❸ عینی شرح بخاری، جلد دوم، صفحہ: ۳۵۴۔ (عینی مطبوعہ قسطنطنیہ میں مطبع کی غلطی سے ۹۳۳ سبعمائۃ لکھا گیا ہے، اس کو تسعمائۃ پڑھنا چاہیے، رومی ماہ ایلول کی دسویں کے بجائے جدید طریقہ حساب سے بیسویں ثابت ہوتی ہے، خوارزمی نے جمعہ کا دن بتایا ہے، لیکن جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آتا ہے)۔ ❹ ج ۲، ص: ۴۱۔ ❺ خوارزمی کے حساب کے مطابق روز ورود (جمعرات) نہ لیا جائے تو ۱۴ دن کے بعد جمعہ ہوگا۔ ❻ یہ واقعہ بخاری کے متعدد ابواب مسجد، ہجرت وغیرہ میں مذکور ہے۔ ہتھیار سجا سجا کر آنے کا ذکر باب ھجرۃ النبی: ۳۹۰۶ پر ہے اور یہ روایت صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ابتناء مسجد النبی ﷺ: ۱۱۷۳ میں بھی ہے۔ طبقات ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۶۰ اور ابن ہشام، ج ۱، ص: ۲۹۷ پر ہے۔

یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے" آپ منت کا اظہار فرماتے اور دعائے خیر دیتے، شہر قریب آ گیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں: [1]

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا	چاند نکل آیا ہے۔
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے۔
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا	ہم سب پر خدا کا شکر واجب ہے۔
مَا دَعٰى لِلّٰهِ دَاعٍ	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں۔"

معصوم لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی تھیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ	ہم خاندان نجار کی لڑکیاں ہیں۔
يَاحَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارِ	محمد ﷺ کیا اچھا ہمسایہ ہے۔

آپ ﷺ نے ان لڑکیوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا: "کیا تم مجھ کو چاہتی ہو؟" بولیں "ہاں" فرمایا کہ "میں بھی تم کو چاہتا ہوں۔"

جہاں اب مسجد نبوی ﷺ ہے، اس سے متصل حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا گھر تھا، کوکبۂ نبوی ﷺ یہاں پہنچا سخت کشمکش تھی کہ آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہو؟ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔ [2]

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کا مکان دو منزلہ تھا، انہوں نے بالائی منزل پیش کی، لیکن آپ ﷺ نے

---

[1] وفاء الوفاء، ج ۱، ص: ۱۸۷، پہلے اشعار کے متعلق زرقانی، (ج ۱، ص: ۴۱۶، ۴۱۸) میں نہایت محققانہ، محدثانہ بحث کی ہے اور ابن قیم رحمہ اللہ کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ثنیۃ الوداع شام کی طرف ہے، نہ کہ مکہ کی طرف، مواہب میں لکھا ہے کہ یہ اشعار حلوانی نے شیخین کی شرط پر روایت کیے ہیں، بخاری میں بھی یہ اشعار منقول ہیں، مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر، (غزوۂ تبوک کے بعد کتاب المغازی، باب کتاب النبی ﷺ الی کسریٰ وقیصر کے باب (حدیث نمبر: ٤٤٢٧) میں امام بخاری نے حضرت سائب بن یزید کا یہ قول نقل کیا ہے: "اذ كرانی خرجت مع الصبيان نتلقى النبی ﷺ الی ثنية الوداع مقدمه من غزوة تبوك" اس کی مزید تفصیل فتح الباری، ج ۸، ص: ۹۸ پر ملاحظہ ہو۔ لیکن ان دونوں روایتوں میں کچھ تناقض نہیں، ممکن ہے دونوں موقعوں پر یہ اشعار پڑھے گئے ہوں۔ [2] ابوایوب رضی اللہ عنہ کا نام خالد ہے، اصابہ فی تمییز الصحابہ میں اسی نام سے ان کا ذکر کیا ہے اور وہیں یہ واقعہ لکھا ہے، (ج ۲، ص: ۹ مطبعہ سعادۃ مصر) اکثر سیر اور تواریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ چونکہ ہر شخص اپنے گھر میں اتارنے کی درخواست کرتا تھا، آپ نے فرمایا کہ "میرے ناقہ کو چھوڑ دو، وہ خدا کی طرف سے مامور ہے۔" چنانچہ ناقہ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا، اس لئے آپ نے انہی کے گھر پر قیام فرمایا۔ (وفاء الوفاء، ج ۱، ص: ۱۸۷) لیکن صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب فی حديث الهجرة، الخ: ۷۵۲۲ میں ہے کہ جب لوگوں میں آپ ﷺ کی میزبانی کے متعلق جھگڑا ہوا تو آپ نے کہا کہ "میں بنو نجار کے ہاں اتروں گا، جو عبدالمطلب کے ماموں ہیں۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عمداً ایسا کیا تھا، حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ اسی خاندان سے تھے، امام بخاری رحمہ اللہ نے تاریخ صغیر میں تصریح کی ہے کہ ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر اترنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا۔ (وفاء الوفاء، ج ۱، ص: ۱۸۷)۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: عن ابی بكر مضى النبی وانا معه حتى اتينا المدينة ليلا فنازعه القوم ايهم ينزل عليه فقال النبی ﷺ انی انزل الليلة على بنی النجار اكرمهم بذلك الخ، ص: ۱٤، ۱٥۔

زائرین کی آسانی کے لئے نیچے کا حصہ پسند فرمایا۔ ابوایوب رضی اللہ عنہ دو وقت آپ کی خدمت میں کھانا بھیجتے اور آپ ﷺ جو چھوڑ دیتے، ابوایوب رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ کے حصہ میں آتا، کھانے میں جہاں آنحضرت ﷺ کی انگلیوں کا نشان پڑا ہوتا، ابوایوب رضی اللہ عنہ تبرکاً وہیں انگلیاں ڈالتے۔

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ ہوا کہ پانی بہہ کر نیچے جائے اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف ہو، گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے۔ ❶

آنحضرت ﷺ نے سات مہینہ تک یہیں قیام فرمایا۔ اس اثنا میں جب مسجد نبوی ﷺ اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپ نے نقل مکان فرمایا، تفصیل آگے آتی ہے۔

مدینہ میں آکر آپ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ (اور اپنے غلام ابورافع) کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جا کر صاحبزادیوں اور حرم نبوی کو لے آئیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر چلے آئیں آنحضرت ﷺ کی صاحبزادیوں میں سے رقیہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبش میں تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے شوہر نے آنے نہ دیا۔ زید رضی اللہ عنہ صرف حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا (اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا) اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا (زوجہ محترم نبوی) کو لے کر آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ آئیں۔ ❷

مسجد نبوی ﷺ اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حجروں کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانہ خدا کی تعمیر تھی، اب تک یہ معمول تھا کہ مویشی خانہ میں آپ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے، ❸ دولت کدہ کے قریب خاندان نجار کی زمین تھی جس میں کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے، آپ ﷺ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا: ''میں یہ زمین بہ قیمت لینا چاہتا ہوں۔'' وہ بولے کہ ''ہم قیمت لیں گے لیکن آپ ﷺ سے نہیں بلکہ خدا سے۔'' چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی آپ ﷺ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا۔ ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی لیکن آپ ﷺ نے گوارا نہ کیا۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے قیمت ادا کی، قبریں اکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، شہنشاہ دو عالم پھر مزدوروں کے لباس میں تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے۔ ❹

---

❶ اصابہ، ذکر ابو ایوب، ج۲، ص:۹۰ مطبع سعادۃ مصر اورزرقانی بحوالہ قاضی ابو یوسف وحاکم، ج۳، ص:٤٦١، و وفاء الوفاء، ج۱، ص: ۱۸۸ وابن ہشام، ج۱، ص: ۲۹۹۔ ❷ ابن سعد، جزء نساء، ص: ۴۳۔

❸ ابوداود، کتاب الصلوۃ، باب فی بناء المسجد:٤٥٣۔ ❹ بخاری، کتاب الصلوۃ، باب ھل ینبش قبور مشرکی الجاھلیۃ ویتخذ مکانھا مساجد: ٤٢٨؛ کتاب المناقب، باب دعاء النبی ﷺ اصلح الانصار والمھاجرۃ:۳۷۹۵و باب الھجرۃ:۳۹۰٦وحج، وباب البیوع، وعینی شرح بخاری، جلد۲ صفحہ:۳۵۷ وزرقانی (ج۱، ص: ٤٢٢ وما بعد)۔

اللھم لا خیرا لا خیرا لاخرۃ　　　فاغفر الا نصار والمھاجرۃ

"اے خدا! کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے۔　　اے خدا! مہاجرین اور انصار کو بخش دے۔"

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی، یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، برگ خرما کا چھپر اور کھجور کے ستون تھے۔ قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا، لیکن جب قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہو گیا تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا، فرش چونکہ بالکل خام تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم نماز کے لئے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشست گاہ پر بچھالیں، آنحضرت ﷺ نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوادیا۔

مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقّف چبوترہ تھا جو صفہ کہلاتا تھا۔ یہ ان لوگوں کے لئے تھا جو اسلام لاتے تھے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔ ❶

مسجد نبوی ﷺ جب تعمیر ہو چکی تو مسجد سے متصل ہی آپ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کیلئے مکان بنوائے۔ اس وقت تک حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نکاح میں آ چکی تھیں، اس لئے دو ہی حجرے بنے جب اور ازواج رضی اللہ عنہن آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے۔ یہ مکانات کچی اینٹوں کے تھے، ان میں سے پانچ کھجور کی ٹٹیوں سے بنے تھے، جو حجرے اینٹوں کے تھے ان کے اندرونی حجرے بھی ٹٹیوں کے تھے۔ ترتیب یہ تھی کہ حضرت ام سلمہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت زینب، حضرت جویریہ، حضرت میمونہ، حضرت زینب رضی اللہ عنہن بنت جحش کے مکانات شامی جانب تھے اور حضرت عائشہ، حضرت صفیہ، حضرت سودہ رضی اللہ عنہن مقابل جانب تھیں۔ ❷ یہ مکانات مسجد سے اس قدر متصل تھے کہ جب آپ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تو مسجد سے سر نکال دیتے اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن گھر میں بیٹھے بیٹھے آپ کے بال دھو دیتی تھیں۔

یہ مکانات چھ چھ، سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لمبے تھے۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا، دروازوں پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ ❸ راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے۔ ❹

آنحضرت ﷺ کے ہمسایہ میں جو انصار رہتے تھے ان میں حضرت سعد بن عبادہ، حضرت سعد بن معاذ، حضرت عمارہ بن حزم اور حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہم رئیس اور دولت مند تھے۔ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں دودھ بھیج دیا کرتے تھے اور اسی پر آپ بسر فرماتے تھے۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے التزام کر لیا تھا کہ رات کے کھانے پر ہمیشہ اپنے ہاں سے ایک بڑا بادیہ بھیجا کرتے تھے جس میں کبھی سالن، کبھی دودھ، کبھی گھی ہوتا تھا۔ ❺ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ماں، اُمِ انس رضی اللہ عنہا نے اپنی جائیداد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش

❶ زرقانی، ج ۱، ص: ۴۲۹، ۴۳۰۔　❷ طبقات ابن سعد، سیرت نبوی ﷺ ص: ۱۶۱۔

❸ منازل نبوی ﷺ کا حال طبقات ابن سعد، جزء ۸، ص: ۱۱۷ اور وفاء الوفاء، (ج ۱، ص: ۳۲۵ وبعد) میں تفصیلاً ہے۔

❹ بخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلوٰۃ علی الفراش: ۳۸۲۔　❺ طبقات ابن سعد، جلد کتاب النساء، ص: ۱۱۶۔

کی۔ آنحضرت ﷺ نے قبول فرما کر اپنی دایہ ام ایمن کو دیدی ❶ اور خود فقر و فاقہ اختیار فرمایا۔

اذان کی ابتدا

اسلام کے تمام عبادات کا اصلی مرکز وحدت واجتماع ہے۔اس وقت تک کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نماز باجماعت کا کوئی انتظام نہ تھا۔لوگ وقت کا اندازہ کر کے آتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو یہ پسند نہ تھا،آپ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کر دیے جائیں جو وقت پر لوگوں کو گھروں سے بلا لائیں،لیکن اس میں زحمت تھی،صحابہ رضی اللہ عنہم کو بلا کر مشورہ کیا،لوگوں نے مختلف رائیں دیں،کسی نے کہا نماز کے وقت مسجد پر ایک علم کھڑا کر دیا جائے،لوگ دیکھ دیکھ کر آتے جائیں گے،آپ نے یہ طریقہ ناپسند فرمایا، عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں اعلان نماز کے جو طریقے ہیں وہ بھی آپ کی خدمت میں عرض کئے گئے،لیکن آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پسند کی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اذان دیں ❷ اس سے ایک طرف تو نماز کی اطلاع عام ہو جاتی تھی،دوسری طرف دن میں پانچ دفعہ دعوت اسلام کا اعلان ہو جاتا تھا۔

صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں ہے کہ اذان کی تجویز عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے پیش کی تھی جو انہوں نے خواب میں دیکھی تھی۔ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی خواب میں توارد ہوا،لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ میں کسی اور روایت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ ❸

بخاری میں صاف تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے بوق اور ناقوس کی تجویزیں پیش کی گئیں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اذان کی تجویز پیش کی اور آپ ﷺ نے اس کے موافق حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلا کر اذان کا حکم دیا،خواب کا ذکر نہیں۔

مواخات

مہاجرین مکہ معظمہ سے بالکل بے سروسامان آئے تھے۔گو ان میں دولت مند اور خوشحال بھی تھے،لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے،اس لئے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الهبة، باب فضل المنيحة: ۲٦۳۰۔ ❷ ابو داود، كتاب الصلوة، باب بدء الاذان: ٤٩٨، ٤٩٩ و بخاری، کتاب الاذان، باب بدء الاذان: ٦٠٤، بخاری میں زید کے واقعہ کا ذکر نہیں۔ ❸ یہ روایت صحیح بخاری (٦٠٦) کے علاوہ صحیح مسلم (٨٣٧)، نسائی، كتاب الاذان، باب بدء الاذان: ٦٢٧) اور ترمذی، ابواب الصلوة، باب ماجاء فی بدء الاذان، ١٩٠ میں بھی ہے۔لیکن تمام روایات کو اور علما کی تحقیقات کو سامنے رکھنے سے مسئلہ کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوسرے لوگوں کی راؤں کے مقابلے میں اپنی رائے یہ پیش کی تھی۔ جیسا کہ بخاری والی روایت (٦٠٤) میں ہے: اولا تبعثون رجلا ينادى بالصلوٰة کہ ایک آدمی بھیجا جائے جو پکار کر نماز کا اعلان کر دے۔آنحضرت ﷺ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور الصلوٰة جامعة کے لفظ سے اس کا اعلان کر دیا اسکے بعد آنحضرت ﷺ نے خود بھی اور بعض دوسرے صحابہ نے بھی خواب میں اذان کے مروجہ الفاظ کے ساتھ اذان کو خواب میں دیکھا اور آنحضرت ﷺ نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر قبول فرمایا اور اسی کے مطابق اذان مروجہ جاری فرمائی گئی فتح الباری (ج ۲، ص: ٦٢ وبعد) ونووی وزرقانی (ج ۱، ص: ٤٣٤ وبعد) وروض الانف باب بدء الاذان ج ۲، ص: ۱۱۹۔۱۲۱) میں یہ تفصیلات بحوالہ وسند مذکور ہیں۔(س)

اگرچہ مہاجرین کے لئے انصار کا گھر مہمان خانۂ عام تھا تاہم ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ مہاجرین نذر اور خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ دست و بازو سے کام لینے کے خوگر تھے، چونکہ بالکل نکھرے تھے اور ایک حبہ تک پاس نہ تھا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے خیال فرمایا کہ انصار اور ان میں رشتہ اخوت قائم کر دیا جائے۔ جب مسجد کی تعمیر قریب ختم ہوئی تو آپ ﷺ نے انصار کو طلب فرمایا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو اس وقت دہ سالہ تھے، ان کے مکان میں لوگ جمع ہوئے، مہاجرین کی تعداد پینتالیس تھی، آنحضرت ﷺ نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا: ''یہ تمہارے بھائی ہیں۔'' پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو اور اب وہ درحقیقت بھائی بھائی تھے۔ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے، سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ جو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بھائی قرار پائے، ان کی دو بیویاں تھیں، عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں آپ اس سے نکاح کر لیجئے۔ لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کیا۔ [1]

انصار کا مال و دولت، جو کچھ تھا نخلستان تھے، روپے پیسے تو اس زمانہ میں تھے نہیں [2] انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ یہ باغ ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیے جائیں، مہاجرین تجارت پیشہ تھے اور اس وجہ سے کھیتی کے فن سے بالکل ناآشنا تھے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف سے انکار کیا، انصار نے کہا سب کاروبار ہم خود انجام دے لیں گے جو کچھ پیداوار ہوگی اس میں نصف حصہ مہاجرین کا ہوگا، مہاجرین نے اس کو منظور کیا۔ [3]

یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا، کوئی انصاری مرتا تھا تو اس کی جائداد اور مال مہاجر کو ملتا تھا [4] اور بھائی بند محروم رہتے، یہ اس فرمان الٰہی کی تعمیل تھی:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ ﴾ (۸/ الانفال:۷۲)

''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں مال و جان سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے ان لوگوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں۔''

جنگ بدر کے بعد جب مہاجرین کو اعانت کی ضرورت نہ رہی تو یہ آیت اتری:

---

[1] مواخات کا ذکر اور ایک ایک کا نام، ابن ھشام ج ۱، ص: ۳۰۴، ۳۰۵ میں ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب اخاء النبی ﷺ: ۳۷۸۰، ۳۷۸۱ اور باب کیف آخی النبی ﷺ بین اصحابه: ۳۹۳۷ میں ہے۔ [2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اخاء النبی ﷺ بین......: ۳۷۸۲۔

[3] ایضًا۔ [4] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة نساء، باب ﴿ولكل جعلنا موالى مما ترك الوالدان......﴾: ۴۵۸۰۔

﴿ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ ﴾ (۸/ الانفال: ۷۵)

"ارباب قرابت، ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔"

اُس وقت سے یہ قاعدہ جاتا رہا۔ چنانچہ کتب تفسیر وحدیث میں یہ تصریح مذکور ہے۔

۴ھ میں بنو نضیر جب جلاوطن ہوئے اور ان کی زمین اور نخلستان قبضہ میں آئے تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا "کہ مہاجرین نادار ہیں، اگر تمہاری مرضی ہو تو نئے مقبوضات تنہا ان کو دے دیے جائیں اور تم اپنے نخلستان واپس لے لو۔" انصار نے عرض کی کہ نہیں ہمارے نخلستان بھائیوں ہی کے قبضہ میں رہنے دیجئے اور نئے بھی انہی کو عنایت فرمائیے۔ (1)

دنیا انصار کے اس ایثار پر ہمیشہ ناز کرے گی، لیکن یہ بھی دیکھو کہ مہاجرین نے کیا کیا؟ حضرت سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ایک ایک چیز کا جائزہ دے کر نصف لے لینے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا: "خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے، مجھ کو صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے۔" انہوں نے قینقاع کا، جو مشہور بازار تھا کر راستہ بتا دیا، انہوں نے کچھ گھی، کچھ پنیر خریدا اور شام تک خرید وفروخت کی چند روز میں اتنا سرمایہ ہو گیا کہ شادی کر لی۔ (2) رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو یہ ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے، ان کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس دن مدینہ میں پہنچتا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔ (3)

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے دکانیں کھول لیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کارخانہ مقام سخ میں تھا جہاں وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے (4) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید وفروخت کرتے تھے (5) حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تجارت میں مشغول ہو گئے تھے (6) اور شاید ان کی اس تجارت کی وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی (7) دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی قسم کی چھوٹی بڑی تجارت شروع کر دی تھی۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر لوگوں نے جب کثرت روایت کی بنا پر اعتراض کیا کہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم تو اس قدر روایت نہیں کرتے تو انہوں نے کہا: "اس میں میرا کیا قصور ہے، دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم بازار میں تجارت کرتے تھے اور میں رات دن بارگاہ نبوت میں حاضر رہتا تھا۔" (8) پھر جب خیبر فتح ہوا تو تمام مہاجرین نے یہ نخلستان انصار کو واپس کر دیے۔ صحیح مسلم باب الجہاد میں ہے:

---

(1) فتوح البلدان، مطبوعہ یورپ، ص: ۲۰۔ (2) صحیح بخاری میں دو مختلف موقعوں پر یہ واقعہ مذکور ہے۔ کتاب البیوع، باب ماجاء فی قول اللہ ﴿فاذا قضیت الصلوة﴾ الخ: ۲۰۴۹ وباب اخاء النبی ﷺ بین المهاجرین والانصار: ۳۷۸۰ وباب کیف اخی النبی ﷺ بین اصحابه: ۳۹۳۷ وباب الولیمة ولو بشاة: ۵۱۶۷۔ (س)

(3) اسد الغابة، ج ۳، ص: ۳۱۴ وص: ۳۱۵، وغیرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ (4) ابن سعد، ج ۳، ص: ۱۳۱۔

(5) مسند امام ابن حنبل، ج ۱، ص: ۶۲۔ (6) مسند ابن حنبل، ج ۴، ص: ۴۰۰۔

(7) مسند ابن حنبلؒ، ج ۳، ص: ۳۴۷۔ (8) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم: ۱۱۸۔

ان رسول الله ﷺ لما فرغ من قتال اهل خيبر وانصرف الى المدينة رد المهاجرون الى الانصار منائحهم التى كانوا منحوهم من ثمارهم۔ ❶

”آنحضرت ﷺ جب جنگ خیبر سے فارغ ہوئے اور مدینہ واپس آئے تو مہاجرین نے انصار کے عطیے جو نخلستان کی صورت میں تھے واپس کر دیے۔“

مہاجرین کے لئے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس پاس جو افتادہ زمینیں تھیں ان کو دے دیں اور جن کے پاس زمین نہ تھی انہوں نے اپنے مسکونہ مکانات دے دیے، سب سے پہلے حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے اپنی زمین پیش کی، بنوزہرہ مسجد نبوی ﷺ کے عقب میں آباد ہوئے، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہاں ایک قلعہ (جس کو گڑھی کہنا زیادہ موزوں ہوگا) بنوایا، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو ایک وسیع زمین ہاتھ آئی، حضرت عثمان، مقداد، حضرت عبید رضی اللہ عنہم کو انصار نے اپنے مکانات کے پہلو میں زمینیں دیں۔ ❷ مواخات کے رشتہ سے، جو لوگ آپس میں بھائی بھائی بنے، ان میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں: ❸

مہاجرین	انصار
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ	حضرت خارجہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ ❹
حضرت عمر رضی اللہ عنہ	حضرت عتبان بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ	حضرت اوس بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ	حضرت سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	حضرت سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ
حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ
حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما	حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ
حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ	حضرت منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ	حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ
حضرت بلال رضی اللہ عنہ	حضرت ابورویحہ رضی اللہ عنہ
حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ	حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ

❶ صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب رد المهاجرين الى الانصار : ٤٦٠٣۔

❷ یہ پوری تفصیل معجم البلدان مدینہ منورہ کے ذکر میں ہے (ج ۷، ص: ۴۳۰)۔

❸ یہ تفصیل ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۰۴، ۳۰۵ میں (اور ناموں کے اضافہ کے ساتھ) ہے۔

❹ ابن ہشام نے خارجہ بن زہیر لکھا ہے۔

حضرت سعید رضی اللہ عنہ بن زید بن عمرو بن نفیل — حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لئے قائم کیا گیا کہ بے خانماں مہاجرین کا چند روزہ انتظام ہو جائے لیکن درحقیقت یہ عظیم الشان اغراض اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا۔

اسلام، تہذیب اخلاق و تکمیلِ فضائل کی شہنشاہی ہے۔ اس سلطنت الٰہی کے لئے وزراء، ارباب تدبیر، سپہ سالاران لشکر، ہر قابلیت کے لوگ درکار ہیں، شرف صحبت کی برکت سے مہاجرین میں ان قابلیتوں کا ایک گروہ تیار ہو چکا تھا اور ان میں یہ وصف پیدا ہو چکا تھا کہ ان کی درسگاہِ تربیت سے اور اربابِ استعداد بھی تربیت پا کر نکلیں، اس بنا پر جن لوگوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا گیا ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ اتحاد مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لئے ضروری ہے، تفحص اور استقصا سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا۔ دونوں میں یہ اتحاد مذاق ملحوظ رکھا گیا اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سینکڑوں اشخاص کی طبیعت اور فطرت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا قریباً ناممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شانِ نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ میں ہیں، ان کے والد زید آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہو چکے تھے اور گویا اسلام کے مقدمۃ الجیش تھے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے ان ہی کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی، اس لئے اسلام کا نام سننے کے ساتھ ہی انہوں نے لبیک کہا۔ ان کی ماں بھی ان کے ساتھ یا ان سے پہلے اسلام لائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہی کے گھر میں اور ان ہی کی ترغیب سے اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔ علم و فضل کے لحاظ سے فضلائے صحابہ میں تھے۔ ان کی اخوت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے قائم کی گئی جنہوں نے یہ مرتبہ حاصل کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو سید المسلمین کہتے تھے، بارگاہِ نبوت میں منصبِ انشا پر سب سے پہلے وہی ممتاز ہوئے، فن قراءت کے وہ امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ [1]

حضرت ابوحذیفہ عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کے فرزند تھے، جو قریش کا رئیس اعظم تھا۔ اس مناسبت سے ان کو حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا گیا جو قبیلۂ اشہل کے سردار تھے۔

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ جن کو رسول اللہ ﷺ نے امین الامۃ کا خطاب دیا تھا، ایک طرف تو فاتح شام ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، دوسری طرف اسلام کے مقابلہ میں پدری اور فرزندی کے جذبات ان پر کچھ اثر نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ غزوۂ بدر میں جب ان کے باپ ان کے مقابلہ میں آئے تو انہوں نے پہلے حقوق ابوت کی مراعات کی لیکن بالآخر اسلام پر باپ کو نثار کر دینا پڑا۔ ان کی تربیت میں حضرت سعد بن

---

[1] اصابہ ذکر ابی بن کعب، ج ۱، ص: ۱۶۔

معاذ رضی اللہ عنہ دیے گئے، جو قبیلہ اوس کے رئیس اعظم تھے، ان میں بھی ایثار کا یہ وصف نمایاں طور پر نظر آتا ہے، بنو قریظہ ان کے حلیف تھے اور عرب میں حلیف کا رشتہ اخوت اور ابوت کے برابر ہوتا تھا۔ تاہم غزوۂ بنی قریظہ میں جب اسلام کا مقابلہ پیش آیا تو انہوں نے اپنے چار سو حلیفوں کو اسلام پر نثار کر دیا۔

حضرت بلال اور حضرت ابورویحہ، حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابودرداء، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت مصعب اور حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہم میں وہ وحدت موجود تھی جس کی بدولت نہ صرف شاگرد، بلکہ استاد بھی شاگرد سے اثر پذیر ہو سکتا تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مدینہ میں آئے تو پنیر سر پر رکھ کر بیچتے تھے، حضرت سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کی صحبت میں جو امیر الامراء تھے دولت اور امارت کے جس درجہ پر پہنچے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

انصار نے مہاجرین کی مہمانی اور ہمدردی کا جو حق ادا کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ ''میں اس کو انصار میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے عرض کی کہ ''پہلے ہمارے بھائی مہاجروں کو اتنی ہی زمین عنایت فرمایئے تب ہم لینا منظور کریں گے۔'' [1]

ایک دفعہ ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا کہ سخت بھوکا ہوں، آپ نے گھر میں دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب آیا کہ ''صرف پانی'' آپ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ''کوئی ہے؟ جو ان کو آج اپنا مہمان بنائے۔'' ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی ''میں حاضر ہوں۔'' غرض وہ اپنے گھر لے گئے۔ لیکن وہاں بھی برکت تھی، بیوی نے کہا: صرف بچوں کا کھانا موجود ہے۔ انہوں نے بیوی سے کہا: چراغ بجھا دو اور وہی کھانا مہمان کے سامنے لا کر رکھ دو، تینوں ساتھ کھانے پر بیٹھے۔ میاں بیوی بھوکے بیٹھے رہے اور اس طرح ہاتھ چلاتے رہے کہ گویا کھا رہے ہیں، اسی واقعہ [2] کے بارہ میں یہ آیت اتری ہے:

﴿ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ ﴾ (۵۹/ الحشر :۹)

''اور گو ان کو خود تنگی ہو، تاہم اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔''

صفہ اور اصحاب صفہ

اصحابِ صُفّہ اسلامی لغت کا ایک متداول لفظ ہے، گو اس کی حقیقت سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں ''صفہ'' سائبان کو کہتے ہیں۔ یہ ایک سائبان تھا جو مسجد نبوی کے ایک کنارے پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اکثر تو مشاغل دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت یا زراعت وغیرہ بھی کرتے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المساقاۃ، باب القطائع: ۲۳۷۶، ۲۳۷۷، ۳۱۶۳۔ [2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب قول اللہ عزوجل [وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ……]: ۳۷۹۸، ۴۸۸۹۔

تھے لیکن چند لوگوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت ﷺ کی تربیت پذیری پر نذر کر دی تھی۔ ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے تھے۔ ان میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لئے کچھ کھانا مہیا کرتی۔

یہ لوگ دن کو بارگاہ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑے رہتے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی انہی لوگوں میں تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہبند دونوں چیزیں کبھی ایک ساتھ مہیا نہ ہو سکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور چھت میں لگا دیتے، کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتیں یہ اٹھا کر کھا لیتے۔ کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے۔ یہ لوگ آ کر شریک نماز ہوتے لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے، باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ دیوانے ہیں [1] آنحضرت ﷺ کے پاس جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو مسلم ان کے پاس بھیج دیتے اور جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے، اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت ﷺ ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے۔ یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نہایت فیاض اور دولتمند تھے، وہ کبھی کبھی اسّی (۸۰) مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے، [2] آنحضرت ﷺ ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں، مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو، تو فرمایا کہ ”یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور صفہ والے بھوکے رہیں۔“ [3] راتوں کو عموماً یہ لوگ عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے، ان کے لئے ایک معلم مقرر تھا اس کے پاس جا کر پڑھتے [4] اسی بنا پر ان میں سے اکثر ”قاری“ کہلاتے تھے، دعوت اسلام کے لئے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے، غزوہ معونہ میں انہی میں سے ستر آدمی اسلام سکھانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

اُن کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی۔ مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی۔ لیکن کبھی ایک زمانہ میں اس قدر تعداد نہیں ہوئی۔ نہ صفہ میں اس قدر گنجائش تھی، ان لوگوں کا مفصل [5] حال ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری المتوفی ۳۴۰ھ (جو ابن مندہ کے استاد تھے) نے ایک الگ تصنیف میں لکھا ہے۔ سلمی نے بھی ان کے حالات

[1] ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی معیشة اصحاب النبی ﷺ: ۲۳۶۸۔

[2] زرقانی، ج۱، ص: ۴۴۷ مصر ذکر اصحاب صفة ومسجد نبوی ﷺ۔

[3] زرقانی، ج۱، ص:۴۴۷، مصر، ذکر اصحاب صفه۔ [4] مسند ابن حنبل، ج۳، ص: ۱۳۷۔

[5] حافظ سیوطی نے دو صفحہ کا ایک رسالہ اصحاب صفہ کے نام سے لکھا ہے اس رسالہ میں سو آدمیوں کے نام بہ ترتیب ہجا مذکور ہیں۔

میں ایک الگ کتاب لکھی ہے۔ [1]

مدینہ کے یہود اور ان سے معاہدہ

مؤرخین عرب کا بیان ہے کہ مدینہ کے یہود نسلاً یہودی تھے اور اس تقریب سے عرب میں آئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو عمالقہ کے مقابلہ کیلئے بھیجا تھا۔ لیکن تاریخی قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہود گو تمام دنیا میں پھیلے لیکن انہوں نے اپنے نام کہیں نہیں بدلے، آج بھی وہ جہاں ہیں اسرائیلی نام رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے عرب کے یہودیوں کے نام، نضیر، قینقاع، مرحب، حارث وغیرہ ہوتے تھے جو خالص عربی نام ہیں، یہود عموماً بزدل اور دنی الطبع ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے لڑنے کے لئے کہا تو بولے:

﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ (٥/ المآئدة: ٢٤)

''تم مع اپنے خدا کے جاؤ اور لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

بخلاف [2] اس کے مدینہ کے یہود نہایت دلیر، شجاع اور بہادر تھے۔ ان قرائن عقلی کے علاوہ ایک بڑے مؤرخ (یعقوبی) نے صاف تصریح کی ہے کہ قریظہ اور نضیر عرب تھے جو یہودی بن گئے تھے۔

ثم كانت وقعة بنى النضير، وهم فخذ من جذام الا انهم تهودوا...... وكذلك قريظة [3]

''پھر بنو نضیر کا معرکہ ہوا۔ یہ قبیلہ جذام کا ایک خاندان تھا، لیکن یہودی ہو گیا تھا اور اسی طرح قریظہ بھی۔''

مؤرخ مسعودی نے بھی ''كتاب الاشراف والتنبيه'' [4] میں ایک روایت لکھی ہے کہ ''یہ جذام کے قبیلہ سے تھے کسی زمانہ میں عمالقہ سے اور ان کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور شام سے نقلِ مکان کر کے حجاز چلے آئے۔''

یہ تین قبیلے تھے، بنو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ، مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اور مضبوط برج اور قلعے بنا لئے تھے۔

---

[1] اصحاب صفہ کا حال بخاری، کتاب الصلوة، (رقم الباب: ٥٨ ورقم الحديث: ٤٤٢) كتاب مواقيت الصلاة، (رقم الحديث: ٦٠٢) كتاب المناقب (رقم الحديث: ٣٥٨١) اور کتاب البيوع، (رقم الحديث: ٢٠٤٧) میں اور جلد دوم کتاب الخمس (رقم الباب: ٦) كتاب الاستئذان، (رقم الحديث: ٦٢٤٦) كتاب الرقاق وغيره (رقم الحديث: ٦٤٥٢ نیز دیکھیں کتاب الحدود، رقم الحديث: ٦٨٠٤) اور صحیح مسلم، كتاب الاماره (رقم الحديث: ٤٩١٧) میں جستہ جستہ مذکور ہیں۔ زرقانی نے اور کتابوں سے لے کر اضافہ کیا ہے۔ (ج۱،ص:۴۲۹ تا ۴۳۲) میں نے یہ واقعات بخاری و مسلم کے علاوہ زرقانی ہی کے حوالہ سے لکھے ہیں۔ (نیز مسند ابن حنبل جلد ۳، صفحہ: ۱۳۷، میں بھی ہیں)

[2] مسٹر مارگولیتھ نے یہود کے متعلق تفصیل سے محققانہ بحث کی ہے، ان کا میلان رائے یہ ہے اور غالباً صحیح ہے کہ یہودیوں کی اس بڑی آبادی میں ایک دو خاندان اصلی یہود بھی تھے۔ عرب جو یہودی ہوتے گئے وہ بھی ان میں شامل ہوتے گئے۔

[3] یعقوبی، ج۲، ص:۴۹۔ [4] مطبوعہ یورپ ص:۲۴۷۔

انصار کے جو دو قبیلے تھے، یعنی اوس اور خزرج، ان میں باہم جو اخیر معرکہ ہوا تھا، (جنگ بعاث) اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا۔ یہود اس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں۔

ان اسباب کی بنا پر جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں، آپ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو فریقین نے منظور کیا، یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے، خلاصہ یہ ہے:

① خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا اب بھی قائم رہے گا۔

② یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

③ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

④ یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

⑤ کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔

⑥ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریک یک دگر ہوں گے۔

⑦ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔ [1]

واقعات متفرقہ

اس سال انصار میں سے دو نہایت معزز شخصوں نے جو مقربین خاص میں تھے، وفات پائی، حضرت کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ اور اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ۔ کلثوم وہ شخص ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قباء میں تشریف لائے تو انہی کے مکان میں ٹھہرے، اکثر بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی انہی کے گھر اترے تھے۔ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ بن زرارہ ان چھ شخصوں میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ابن سعد کی روایت کے موافق ان چھ شخصوں میں جس نے سب سے پہلے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا یہی اسعد تھے، [2] یہ فخر بھی انہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہی نے مدینہ میں آ کر جمعہ کی نماز قائم کی۔ [3]

چونکہ یہ قبیلۂ بنی نجار کے نقیب تھے، اس لئے ان کی وفات کے بعد اس قبیلہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے بجائے کوئی شخص اس منصب پر مقرر کیا جائے، چونکہ یہ احتمال تھا کہ کوئی شخص مقرر ہوگا تو اوروں کو رشک ہوگا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''میں خود تمہارا نقیب ہوں۔'' [4] چونکہ آپ کی ننہال اسی قبیلہ میں تھی، اس لئے اور قبائل کو رشک اور منافست کا موقع نہ ملا۔

---

[1] ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۰۱ تا ۳۰۳۔ [2] طبقات، ج ۱، ص: ۱٤٦۔

[3] طبقات، ابن سعد، ج ۱، ص: ۱٤۸۔ [4] طبری، ج ۳، ص: ۱۲٦۱، ۱۲٦۲۔

حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کی وفات کا آنحضرت ﷺ کو نہایت صدمہ ہوا۔ منافقین اور یہود نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ ”محمد ﷺ اگر پیغمبر ہوتے تو ان کو یہ صدمہ کیوں پہنچتا“ آپ ﷺ نے سنا تو فرمایا:

((لا املك لنفسي ولا لصاحبي من الله شيئا)) [1]

”میں اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے خدا کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔“

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عین اسی زمانہ میں دو بڑے رئیسانِ کفر نے بھی وفات پائی، یعنی ولید بن المغیرہ جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا باپ تھا اور عاص بن وائل سہمی جن کے بیٹے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہیں۔ جو فاتح مصر اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے وزیر اعظم تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی، ان کے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور ان کی والدہ (اسماء رضی اللہ عنہا) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بے مات بہن تھیں۔ اب تک مہاجرین میں سے کسی کے اولاد نہیں ہوئی تھی اس لئے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہودیوں نے جادو کر دیا ہے، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو مہاجرین نے خوشی کا نعرہ مارا۔

اب تک نمازوں میں صرف دو رکعتیں تھیں۔ اب ظہر و عصر و عشاء میں چار چار ہو گئیں لیکن سفر کے لئے اب بھی وہی دو رکعتیں قائم رہیں۔

---

[1] طبری، ج ۱، ص: ۱۲۶۰۔

۲ھ

تحویلِ قبلہ وآغازِ غزوات

(اس سال سے اسلام کی زندگی میں دو عظیم الشان واقعات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اسلام اپنے لئے ایک خاص قبلہ قرار دیتا ہے جو اب ۴۵ کروڑ قلوب کا مرکز ہے، [1] دوسرا یہ کہ دشمنانِ اسلام اب مخالفت کے لئے تلوار اٹھاتے ہیں اور مسلمان اس کی مدافعت کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

تحویل قبلہ، شعبان ۲ھ

ہر گروہ، ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے ایک خاص امتیازی شعار ہوتا ہے جس کے بغیر اس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہوسکتی۔ اسلام نے یہ شعار قبلۂ نماز قرار دیا جو اصل مقصد کے علاوہ اور بہت سے حکم واسرار کا جامع ہے۔ اسلام کا خاص اور نمایاں وصف مساواتِ عام، جمہوریت اور عملی توحید ہے۔ یعنی تمام مسلمان یکساں اور متحد الجہتہ نظر آئیں۔ مذہب اسلام کا رکنِ اعظم نماز ہے، جس سے ہر روز پانچ وقت کام پڑتا ہے۔ نماز کی اصلی صورت یہ ہے کہ جمعیت اور افراد کثیر کے ساتھ ادا کی جائے، لیکن اس طرح کہ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی منفرد ہستیاں مٹ کر ایک ہستی بن جائے۔ اسی بنا پر نماز با جماعت میں ایک امام ہوتا ہے کہ مقتدیوں کی ایک ایک حرکت اس کے اشاروں سے وابستہ ہوتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ سب کا مرجع عمل بھی ایک نظر آئے، یہی اصول ہے جس کی بنا پر نماز کے لئے ایک قبلہ قرار پایا اور اس شعار کا دائرہ اس قدر وسیع کیا گیا کہ اس قبلہ کی طرف رخ کرنا ہی کفر کے دائرہ سے نکل آنا ہے، اب صرف یہ بحث باقی تھی کہ قبلہ کس سمت قرار دیا جائے۔ یہودی اور عیسائی بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے تھے، کیونکہ ان کی قومی اور مذہبی ہستی بیت المقدس سے وابستہ تھی۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام بت شکن کے جانشین کے لئے صرف کعبہ قبلہ ہوسکتا تھا جو اس موحدِ اعظم کی یادگار اور توحید خالص کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب تک مکہ میں تھے دو ضرورتیں ایک ساتھ درپیش تھیں۔ ملتِ ابراہیمی کی تاسیس و تجدید کے لحاظ سے کعبہ کی طرف رخ کرنے کی ضرورت تھی، لیکن یہ مشکل تھی کہ قبلہ کی جو اصلی غرض ہے یعنی امتیاز اور اختصاص وہ نہیں حاصل ہوتی تھی۔ کیونکہ مشرکین اور کفار بھی کعبہ ہی کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ مقام ابراہیم کے سامنے نماز ادا کرتے تھے۔ جس کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا، اس طرح دونوں قبلے سامنے آجاتے تھے، مدینہ میں دو گروہ آباد تھے، مشرکین جن کا قبلہ کعبہ تھا اور اہل کتاب جو بیت المقدس کی سمت نماز ادا کرتے تھے۔ شرک کے مقابلہ میں یہودیت اور نصرانیت دونوں کو ترجیح تھی، اس لئے

---

[1] اب یہ تعداد ایک ارب سے زیادہ ہوگئی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک مدت یعنی تقریباً ١٦ مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی۔ لیکن جب مدینہ میں اسلام زیادہ پھیل گیا تو اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اصل قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رخ کیا جاتا۔ اس بنا پر یہ آیت اتری اور دفعتاً قبلہ بدل گیا: [1]

﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ ﴾

(٢/ البقرة:١٤٤)

”تو اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر دو اور جہاں کہیں رہو اسی طرف منہ پھیرو۔“

تحویل قبلہ نے یہودیوں کو سخت برہم کر دیا، ان کو مشرکین کے مقابلہ میں مذہبی تفوق کا دعویٰ تھا اور اسلام سے پہلے مشرکین بھی ان کے مذہبی امتیاز کے معترف تھے۔ یہاں تک کہ (جیسا ابوداؤد [2] میں روایت ہے) ”جن لوگوں کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی وہ منتیں مانتے تھے کہ بچہ زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنائیں گے۔“ اسلام نے ان کے اس مذہبی اعزاز کو صدمہ پہنچایا۔ تاہم چونکہ اب تک اسلام کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا اس لئے وہ فخر کرتے تھے کہ اسلام بھی انہی کے قبلہ کی طرف رخ کرتا ہے۔ جب اسلام نے قبلہ بھی بدل دیا تو ان کی ناراضی اور برہمی کا پیالہ بالکل لبریز ہو گیا۔ انہوں نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد ﷺ چونکہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرنا چاہتے ہیں، اس لئے قبلہ بھی مخالفت کے ارادہ سے بدل دیا ہے۔ دودلے اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ قبلہ بدلنے کی چیز نہیں اور اس سے بے استقلالی اور تزلزل اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بنا پر قبلہ کی اصلیت اور ضرورت اور تحویل قبلہ کے مصالح کے متعلق چند آیتیں اتریں جن سے یہ مشکلیں حل ہو جاتی ہیں:

﴿ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ ﴾ (٢/ البقرة: ١٤٢۔١٤٣)

”سفہا یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اس سے ان کو کس نے پھیر دیا۔ کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کا ہے۔ وہ جسے چاہے سیدھی رہ کی ہدایت کر دے۔ ہم نے اسی

[1] اس مضمون میں جس قدر واقعات ہیں وہ صحیح بخاری (حدیث قبلہ نماز) کتاب الصلوۃ، باب التوجه نحو القبلة:٣٩٩ وفتح الباری شرح صحیح بخاری، ج١، ص: ٤٢١، ٤٢٢ وصحیح بخاری، کتاب التفسیر قبلہ سے متعلق ابواب:٤٤٨٦ تا٤٤٩٤ وفتح الباری، ج٨، ص:١٣١، ١٣٢ سے ماخوذ ہیں۔

[2] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الاسیر یکره علی الاسلام: ٢٦٨٢۔

طرح تمہیں عادل امت بنایا ہے، تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہو جائیں۔ تیرا جو پہلے قبلہ تھا (کعبہ) اس کو جو ہم نے پھر قبلہ کر دیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبر کا پیرو کون ہے اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے اور بے شبہ یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے، بجز ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت کی ہے۔''

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''پورب پچھم رخ کرنا یہی کوئی ثواب کی بات نہیں، ثواب تو یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، قیامت پر، ملائکہ پر، اللہ کی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں عزیزوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کو (آزاد کرانے میں) اپنی دولت دے۔''

ان آیتوں میں اللہ نے پہلے یہ بتایا کہ قبلہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، اللہ کی عبادت کے لئے پورب پچھم سب برابر ہیں، اللہ ہر جگہ ہے، ہر سمت، ہر طرف ہے، پھر قبلہ کے تعین کی ضرورت بتائی کہ وہ اختصاصی شعار ہے، اصلی اور نمائشی مسلمانوں کو الگ کر دیتا ہے۔ بہت سے یہودی تھے جو منافقانہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ نماز میں بھی شرکت کرتے تھے۔ یہ اسلام کے لئے مار آستین تھے۔ لیکن جب قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ سے بدل گیا تو نفاق کا راز بالکل فاش ہو گیا۔ کوئی یہودی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ جو چیز اس کی قومیت، مذہب بلکہ اس کی ہستی کی بنیاد ہے، (یعنی بیت المقدس) اسی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے۔ پھر دوبارہ اللہ نے اس نکتہ کو زیادہ واضح کر دیا کہ کسی خاص قبلہ کی طرف رخ کرنا اصلی ثواب نہیں، بلکہ ثواب درحقیقت ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نام ہے۔

سلسلۂ غزوات ❶

کیا عجیب بات ہے کہ ارباب سیر، مغازی کی داستان جس قدر زیادہ دراز نفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں، یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے کیونکہ اس کو اسلام کے جور وستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے اس کے نقش و نگار کے لئے لہو کے چند قطرے نہیں بلکہ چشمہ ہائے خون درکار ہیں۔ یورپ کے تمام مؤرخوں نے سیرت نبوی کو اس انداز میں لکھا ہے کہ وہ لڑائیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے جائیں۔ لیکن یہ خیال چونکہ واقع میں غلط بلکہ سرتاپا غلط ہے اس لئے مغازی کی ابتدا سے پہلے ضروری ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کیا جائے۔ عام خیال یہ ہے کہ اسلام جب تک مکہ میں تھا، مصائب گوناگوں کی آماجگاہ تھا۔ مدینہ میں آ کر اس کی کلفتیں دور ہوئیں۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ مکہ میں جو مصیبت تھی گو سخت تھی لیکن تنہا اور منفرد تھی۔ مدینہ میں آ کر وہ متعدد اور گوناگوں بن گئی۔ مکہ کل ایک قوم تھا۔ مدینہ میں انصار کے ساتھ یہود بھی تھے۔ جو عادات، خصائل، مذہب اور دیانت میں انصار سے بالکل مختلف اور ان کے حریف مقابل تھے۔ اس پر ایک تیسری قسم (منافقین) کا اضافہ ہوا، جو مار آستین ہونے کی وجہ سے دونوں سے زیادہ خطرناک تھے۔ مکہ اگر قابو میں آ جاتا تو حرم کی وسعتِ اثر کی وجہ سے تمام عرب کی گردنیں خم ہو جاتیں، لیکن مدینہ کا اثر چار دیواری تک محدود تھا۔ مدینہ اب تک بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی قیام گاہ ہونے نے اس کو قریش کے غیظ و غضب کا تاراج گاہ بنا دیا۔ آنحضرت ﷺ جب مکہ سے چلے آئے تو چند ہی روز کے بعد قریش نے عبداللہ بن ابی کو جو واقعہ ہجرت کے قبل رئیس الانصار تھا اور انصار نے اس کی تاجپوشی کی شاہانہ رسم ادا کرنے کے لئے تیاری کر لی تھی۔ ❷ خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

انكم آويتم صاحبنا وانا نقسم بالله لتقاتلنه او لتخرجنه او لنسيرن اليكم باجمعنا حتى نقتل مقاتلتكم ونستبيح نسائكم ❸

''تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو۔ ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے اور تم کو گرفتار کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔''

جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ عبداللہ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس کو سمجھایا کہ

---

❶ غزوات کا سلسلہ جن اسباب سے پیدا ہوا اور جس قسم کے واقعات غزوات میں پیش آئے ان کے لئے ہم نے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے کیونکہ ضمنی طریقے سے وہ ادا نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ عنوان اچھی طرح سے اسی وقت ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ تمام غزوات سرسری نظر سے گزر جائیں اس لئے ہم نے اس کو تمام غزوات کے بعد لکھا ہے۔ ناظرین ابھی سے اس کا خیال رکھیں۔

❷ بخاري، كتاب الاستئذان، باب التسليم في مجلس فيه اخلاط من المسلمين والمشركين: ٦٢٥٤۔ (س)

❸ سنن ابو داود، كتاب الخراج، باب خبر النضير: ٣٠٠٤۔

"کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے"۔ چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے، اس لئے عبداللہ اس نکتہ کو سمجھا اور قریش کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔ بدر کے بعد پھر قریش نے اسی مضمون کا خط لکھا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ (تاہم قریش کی شہ سے منافقین و یہود مدینہ کا سر پھر چکا تھا۔ اسی زمانہ میں یعنی بدر سے پہلے آنحضرت ﷺ بنو الحارث بن خزرج کے محلّہ میں سوار ہو کر تشریف لے گئے، ایک جگہ مشرکین و منافقین مدینہ، یہود اور بعض مسلمان بیٹھے تھے۔ گدھے کے چلنے سے گرد اڑی تو عبداللہ بن ابی نے منہ پر کپڑا ڈال دیا اور حقارت سے بولا: "گرد نہ اڑاؤ۔" آنحضرت ﷺ نے مجمع کو سلام کیا اور کچھ قرآن کی آیتیں سنائیں، عبداللہ نے کہا: [1] "اے شخص! مجھ کو یہ پسند نہیں، اگر تمہاری بات سچ بھی ہو تو ہماری مجلس میں آ کر ہم کو نہ ستایا کرو۔ جو تمہارے پاس جائے اس سے بیان کیا کرو۔" مسلمان اس تحقیر سے برافروختہ ہو گئے اور قریب تھا کہ کشت و خون ہو جائے، آخر آنحضرت ﷺ نے دونوں کو ٹھنڈا کیا)۔

اسی زمانہ کے قریب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ اوس کے رئیس الاعظم تھے۔ عمرہ کرنے کے لئے مکہ معظمہ گئے، امیہ بن خلف سے اور ان سے مدت کا یارانہ تھا اور یہ تعلق اسلام کے بعد بھی قائم رہا۔ اس تعلق سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ اب بھی امیہ ہی کے مہمان ہوئے۔ ایک دن وہ امیہ کو لے کر کعبہ کے طواف کو نکلے، اتفاق سے ابوجہل سامنے سے آ گیا۔ امیہ سے اس نے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا: "سعد رضی اللہ عنہ ہیں۔" ابوجہل نے کہا: "تم لوگوں نے صابیوں (کفار آنحضرت ﷺ اور اہل اسلام کو صابی یعنی مرتد کہتے تھے) کو پناہ دی ہے، میں کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم کعبہ میں آ سکو۔ اللہ کی قسم! اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو بچ کر واپس نہیں جا سکتے تھے۔" حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: "اگر تم نے ہم کو حج سے روکا تو ہم تمہارا مدینہ کا راستہ روک دیں گے۔" [2] (یعنی شام کی تجارت کا راستہ)

حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے سب قریش کے زیر اثر تھے، [3] اس بنا پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کا مخالف بنا دیا۔ ہجرت کے چھٹے سال تک یمن وغیرہ کے لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس نہیں پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ ۶ ھ میں جب بحرین سے عبدالقیس کی سفارت آئی تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ مضر کے قبائل ہم کو آپ تک پہنچنے نہیں دیتے۔ اس لئے ہم صرف ایام حج میں جب کہ لڑائی عموماً موقوف ہو جاتی ہے، آپ ﷺ کی خدمت میں آ سکتے ہیں۔ [4]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب فی دعاء النبی ﷺ وصبره علی اذی المنافقین: ٤٦٥٩، وبخاری باب مذکور (رقم الحدیث: ۲۲۵۴)۔ [2] یہ پورا واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری، کتاب المغازی: ۳۹۵۰ کی ابتدا میں مذکور ہے۔ [3] ابن ہشام واقعات وفود میں ہے: وذلك ان قريشا كانوا امام الناس ..... وقادة العرب لاينكرون ذلك وكانت قريش هي التي نصبت الحرب لرسول الله ﷺ (ج ۲، ص: ۳٦۲)

[4] وفد بنی عبدالقیس کے ذکر میں صحیح بخاری: ٥٣، ٤٣٦٨ اور دیگر تمام کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

قریش نے انہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جیسا کہ انہوں نے عبداللہ بن ابی کو لکھا تھا، اس کی تیاریاں کر رہے تھے کہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلام کا استیصال کر دیں۔ مدت تک یہ حال رہا کہ آنحضرت ﷺ راتوں کو جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے۔ سنن نسائی میں ہے:

کان رسول اللہ ﷺ اول ما قدم المدینۃ یسھر من اللیل۔ [1]

''آنحضرت ﷺ اول جب مدینہ میں آئے تو راتوں کو جاگا کرتے تھے۔''

صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دیتا۔'' چنانچہ سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا، تب آپ ﷺ نے آرام فرمایا۔ [2] اس سے بڑھ کر حاکم کی روایت ہے جس کے یہ الفاظ ہیں:

عن ابی بن کعب قال لما قدم رسول اللہ ﷺ واصحابہ المدینۃ وآوتھم الانصار رمتھم العرب عن قوس واحدۃ وکانوا لا یبیتون الا بالسلاح ولا یصبحون الا فیہ۔ [3]

''آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم جب مدینہ آئے اور انصار نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ ان سے لڑنے کو آمادہ ہو گئے، صحابہ صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔''

مؤرخین مغازی کی ابتدا انہی واقعات سے کرتے ہیں کہ اسی سال اللہ نے جہاد کی اجازت دی لیکن ایک دقیقہ بیں انہی کی تصریحات سے پتہ لگا سکتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا، مواہب لدنیہ اور زرقانی میں لکھا ہے کہ اللہ نے ۱۲ صفر ۲ ھ میں جہاد کی اجازت دی اس کی سند میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے: [4]

اول آیۃ نزلت فی الاذن بالقتال ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُۙ﴾

''پہلی آیت جو قتال کی اجازت میں نازل ہوئی وہ یہ ہے، ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ﴾ الخ یعنی جن سے لڑائی کی جاتی ہے (مسلمان) ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔''

تفسیر ابن جریر میں ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے: [5]

﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۰)

---

[1] فتح الباری، ج ۲، ص: ۶۰ میں ابو اسحٰق الفزاری کے واسطہ سے نسائی کی یہ روایت مذکور ہے۔ (سنن الکبری، کتاب المناقب: ۸۱۶۰) [2] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الحراسۃ فی الغزو فی سبیل اللّٰہ: ۲۸۸۵۔

[3] لباب فی اسباب النزول للسیوطی، سورۃ نور آیت ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ﴾ (۲۴/ النور:۵۵) الخ مسند دارمی میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔ [4] زرقانی ۱، ص:۴۴۸ بحوالہ سنن نسائی، کتاب الجهاد، باب وجوب الجهاد: ۳۰۸۷، (علامہ محمد بن عبدالباقی نے اس روایت کو مرفوع بتایا ہے) [5] ج ۲، ص: ۱۰۶ تفسیر آیت مذکور۔

''اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔''

لیکن غور سے دیکھو کہ دونوں آیتوں میں انہی لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو پہلے مسلمانوں سے لڑنے آتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان درحقیقت لڑنے پر مجبور کئے جاتے تھے۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آ کر آنحضرت ﷺ کا سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی، نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی بلکہ انصار کی بھی۔ کیونکہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے، قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا اور اپنے تمام قبائل متحدہ میں یہ آگ بھڑکا دی تھی۔ اس بنا پر آپ نے دو تدبیریں اختیار کیں۔ اول یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو ان کا مایۂ غرور تھی بند کر دی جائے، تاکہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں اور یاد ہوگا کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے مکہ میں ابوجہل کو اسی کی دھمکی دی تھی۔ دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب وجوار کے جو قبائل ہیں، ان سے امن وامان کا معاہدہ ہو جائے۔

بدر سے پہلے کی مہمیں

(غرض ان حالات کی بنا پر غزوۂ بدر سے پہلے سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں مکہ کی طرف روانہ کی جانے لگیں۔ ابواء کی مہم سے پہلے جو صفر ۲ھ میں واقع ہوئی اور جس میں آپ ﷺ نے خود شرکت فرمائی تھی، ارباب سیر نے تین مہموں کا ذکر کیا ہے جن کو ان کی زبان میں ''سریہ'' کہتے ہیں، سریہ حمزہ، سریہ عبیدہ بن حارث، سریہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم لیکن ان میں سے کسی مہم میں کوئی کشت وخون نہیں ہوا۔ یا بیچ بچاؤ ہو گیا۔ یا بچ کر نکل گئے۔ ارباب سیر نے ان سرایا کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ قریش کے تجارتی قافلہ کو چھیڑنے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ یعنی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تہدید کے مطابق ان کی شامی تجارت کو بند کرنا مقصود تھا۔ مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہ کو غارت گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن یہ الزام کس قدر جہالت پر مبنی ہے کہ اول تو اسلام کی شریعت میں یہ سخت تر گناہ ہے، ثانیاً واقعہ کیا بتاتا ہے؟ کیا ان میں سے کسی مہم میں بھی یہ مذکور ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قافلہ کا مال لوٹ لیا؟ ثالثاً اگر ان سرایا کا مقصد لوٹنا اور ڈاکہ ڈالنا ہی ہوتا تو قریش کے قافلۂ تجارت کے سوا یہ مقصد کہیں اور نہیں حاصل ہو سکتا تھا؟)

جہینہ

اطراف کے جن قبائل کے پاس معاہدہ کے لئے مہم بھیجی گئی، ان میں سب سے پہلے جہینہ کا قبیلہ ہے۔ جہینہ کا قبیلہ مدینہ سے تین منزل پر آباد تھا اور ان کا کوہستان دور تک پھیلا ہوا تھا، ان سے معاہدہ ہوا کہ وہ فریقین سے یکساں [1] تعلقات رکھیں گے، یعنی دونوں سے الگ رہیں گے۔

صفر ۲ھ میں آپ ﷺ ساٹھ مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ابواء تک گئے، (جس کے قریب

[1] اس واقعہ کا ذکر مورخین نے مستقل طور پر نہیں کیا بلکہ جہاں سب سے پہلے سریہ ضمرہ کا ذکر کیا ہے وہاں مجدی جہینی (رئیس قبیلہ) کی نسبت لکھا ہے، کان موادعا للفریقین یعنی اس نے دونوں فریقوں سے صلح کر رکھی تھی۔

ہی غزوۂ ابوایا غزوۂ ودّان واقع ہوا) اور جہاں آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کا مزار ہے، ابواء کا صدر مقام فرع ہے جو ایک وسیع قصبہ ہے اور جہاں قبیلہ مزینہ آباد ہے اور جو مدینہ سے تقریباً ۸ منزل (۸۰ میل) ہے، یہ مدینہ کی اخیر سرحد ہے۔ ان اطراف میں قبیلہ بنوضمرہ آباد تھا اور یہ نواح ان کی حدود حکومت میں داخل تھے۔ یہاں آپ نے چند روز قیام کر کے بنوضمرہ سے معاہدہ کیا، جن کا سردار مخشی بن عمرو ضمری تھا۔ معاہدہ کے یہ الفاظ تھے:

هذا كتاب من محمد رسول الله ﷺ لبني ضمرة فانهم آمنون على اموالهم وانفسهم وان لهم النصر على من رامهم الا ان يحاربوا في دين الله مابل بحر صوفة وان النبي اذا دعاهم لنصره اجابوه. الخ ❶

''یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تحریر ہے بنوضمرہ کے لئے ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر ﷺ جب ان کو مدد کے لئے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے۔''

تمام محدثین، مغازی کی ابتدا اسی واقعہ سے کرتے ہیں، صحیح بخاری میں بھی اسی کو اول الغزوات قرار دیا ہے۔ ❷

قریباً ایک مہینہ کے بعد کرز بن جابر فہری نے جو مکہ کے رؤسا میں تھا، ❸ مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت ﷺ کے مویشی لوٹ لئے۔ اس کا تعاقب کیا گیا، لیکن وہ بچ کر نکل گیا تھا۔ (کرز بعد کو مسلمان ہوئے اور فتح مکہ میں تنہا راہ چلتے شہید ہوئے۔)

جمادی الثانی یعنی اس واقعہ کے تیسرے مہینہ آپ دو سو مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور مقام ذوالعشیرہ پہنچ کر بنومدلج سے معاہدہ کیا۔ یہ مقام مدینہ سے ۹ منزل پر ینبوع کے نواح میں ہے۔ بنومدلج، بنوضمرہ کے حلیف تھے اور چونکہ بنوضمرہ پہلے اسلام کے معاہدہ میں داخل ہو چکے تھے، اس لئے انہوں نے آسانی سے یہ شرائط منظور کر لیں۔ ❹

چند روز کے بعد یعنی رجب ۲ ھ میں آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطن نخلہ کی طرف بھیجا۔ یہ مقام مکہ اور طائف کے بیچ میں مکہ سے ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے۔

---

❶ روض الانف، ج ۲، ص: ۵۸، زرقانی، ج ۱، ص: ۴۵۹۔ ❷ كتاب المغازی، باب غزوة العشيرة (ترجمة الباب) (امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن اسحٰق رحمہ اللہ کا قول نقل فرمایا ہے) ❸ اصابه ذکر کرز فهری، ج ۳، ص: ۲۹۰۔ ❹ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مؤرخین نے دونوں پہلے واقعوں کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا مقصد قریش کے کارواں کا لوٹنا تھا لیکن اتفاق سے کارواں ہاتھ نہ آیا اور بچ کر نکل گیا۔ لیکن میں واقعات کا پابند ہوں، رائے اور قیاس سے غرض نہیں، اس قدر واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ان مقامات تک گئے اور وہاں کے قبائل سے معاہدہ کیا۔ اس سے آگے مؤرخین کا قیاس ہے کہ قریش کے کارواں پر حملہ کرنا مقصود تھا، گو یہ مقصود نہ حاصل ہو سکا۔ اگر خدانخواستہ کارواں کا لوٹنا ہی مقصود ہوتا تو آنحضرت ﷺ کو العیاذ باللہ اس قدر بے تدبیر فرض کرنا پڑے گا کہ ہر مرتبہ ناکامیابی ہوتی تھی اور قافلہ بچ کر نکل جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بار بار تجربہ کے بعد بھی بدر میں اسی قسم کی ناکامی ہوئی اور قافلہ صحیح وسلامت نکل گیا۔

آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط دے کر فرمایا تھا کہ ''دو دن کے بعد اس کو کھولنا۔'' حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے خط کھولا تو لکھا تھا کہ ''مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو۔'' اتفاق یہ کہ قریش کے چند آدمی جو شام سے تجارت کا مال لئے آتے تھے سامنے سے نکلے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ان پر حملہ کیا، ان میں سے ایک شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا۔ دو گرفتار ہوئے اور مال غنیمت ہاتھ آیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں آ کر یہ واقعہ بیان کیا اور غنیمت کی چیزیں پیش کیں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی۔'' غنیمت کے قبول کرنے سے بھی آپ ﷺ نے انکار فرمایا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نہایت برہم ہو کر کہا:

صنعتم مالم تؤمروا به وقاتلتم في الشهر الحرام ولم تؤمروا بقتال [1]

''تم نے وہ کام کیا (قافلہ لوٹا) جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا اور ماہ حرام میں لڑے حالانکہ اس مہینہ میں تم کو لڑنے کا حکم نہ تھا۔''

جو لوگ گرفتار اور قتل ہوئے وہ بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے، عمرو بن الحضرمی جو مقتول ہوا عبداللہ حضرمی کا بیٹا تھا، جو حرب بن امیہ (امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دادا) کا حلیف تھا۔ [2] حرب قریش کا رئیس اعظم تھا اور عبدالمطلب کے بعد ریاست عام اسی کو حاصل ہوئی تھی۔ جو لوگ گرفتار ہوئے یعنی عثمان ونوفل دونوں مغیرہ کے پوتے تھے۔ [3] مغیرہ ولید کا باپ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا دادا اور حرب کے بعد دوسرے درجے کا رئیس تھا اس بنا پر اس واقعہ نے تمام قریش کو مشتعل کر دیا اور ثار یعنی انتقام خون کی بنیاد قائم ہوگئی۔ معرکۂ بدر کا سلسلہ اسی واقعہ سے وابستہ ہے، حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے۔ انہوں نے تصریح کی ہے کہ غزوۂ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش سے پیش آئیں سب کا سبب یہی حضرمی کا قتل ہے، علامہ طبری لکھتے ہیں: [4]

وكان الذي هاج وقعة بدر وسائر الحروب التي كانت بين رسول الله ﷺ وبين مشركي قريش فيما قال عروة بن الزبير ماكان من قتل واقد بن عبدالله السهمي عمرو بن الحضرمي.

''اور جس چیز نے بدر کے واقعہ کو ابھارا اور وہ تمام لڑائیاں چھیڑ دیں جو آنحضرت ﷺ اور مشرکین قریش میں پیش آئیں سب کا سبب یہی تھا کہ واقد سہمی نے حضرمی کو قتل کر دیا تھا۔''

چونکہ غزوۂ بدر تمام غزوات کی اصلی بنیاد ہے، اس لئے ہم پہلے اس واقعہ کو سادہ صورت میں لکھ کر پھر تفصیل سے اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔

---

[1] طبری، ج ۳، ص: ۱۲۷۵۔ [2] اصابہ، ترجمہ علاء حضرمی، ج ۲، ص: ۴۹۷۔
[3] طبری، ج ۳، ص: ۱۲۷٤۔(س) [4] طبری، ج ۳، ص: ۱۲۸٤۔(س)

غزوۂ بدر

﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۲۳)

رمضان ۲ھ

بدر ایک گاؤں کا نام ہے، جہاں سال کے سال میلہ لگتا ہے۔ یہ مقام اسی نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے، مدینہ منورہ سے قریباً ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، عبداللہ بن ابی کو انہوں نے خط لکھ بھیجا کہ یا محمد (ﷺ) کو قتل کر دو، یا ہم آ کر ان کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں، کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آ کر غارت گری کرتا تھا۔

حملہ کے لئے سب سے بڑی ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست تھا۔ اس لئے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت شام کو روانہ ہوا، اس سروسامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی کل کی کل دے دی۔ [1]

نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبار تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں، ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا، قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آ گیا، جس نے قریش کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا دیا۔

اسی اثنا میں یہ غلط خبر مکہ معظمہ میں پھیل گئی کہ مسلمان قافلہ لوٹنے کو آ رہے ہیں، قریش کے غیظ و غضب کا بادل بڑے زور شور سے اٹھا اور تمام عرب پر چھا گیا۔

آنحضرت ﷺ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور واقعہ کا اظہار فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے جان نثارانہ تقریریں کیں، لیکن رسول اللہ ﷺ انصار کی طرف دیکھتے تھے، کیونکہ انصار نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئیں۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ (سردار خزرج) نے اٹھ کر کہا: ''کیا حضور کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ اللہ کی قسم! آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔''

---

[1] ابن سعد، جزء ثانی قسم اول، ص: ۷ میں ابوسفیان سردار قافلہ کا قول لکھا ہے: واللہ مابمکة من قرشي ولا قرشية له نش وصاعدا الا بعث به معنا ہمارے مؤرخین کو اسباب ونتائج کی جستجو نہیں ہوتی، اس لئے انہوں نے اس واقعہ کو محض ایک واقعہ کی حیثیت سے لکھ دیا۔ لیکن ان کو احساس نہیں کہ مکہ کو تمام سرمایہ کے اگل دینے کی ضرورت کیا تھی؟

یہ صحیح مسلم ❶ کی روایت ہے، بخاری میں ہے کہ مقداد نے کہا کہ "ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں، ہم لوگ آپ کے داہنے سے، بائیں سے، سامنے سے، پیچھے سے، لڑیں گے۔" ان کی اس تقریر سے رسول اللہ ﷺ کا چہرہ دمک اٹھا۔ ❷

غرض ۱۲ رمضان ۲ھ کو آپ تقریباً تین سو جان نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے، ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا، جو کم عمر تھے واپس کر دیے گئے ❸ کہ ایسے پر خطر موقع پر بچوں کا کام نہیں۔ عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایک کمسن بچہ تھے جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے، آخر آنحضرت ﷺ نے اجازت دے دی۔ عمیر کے بھائی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کمسن سپاہی کے گلے میں تلوار حمائل کی، ❹ اب فوج کی کل تعداد ۳۱۳ تھی جس میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ چونکہ غیبت کی حالت میں منافقین اور یہود کی طرف سے اطمینان نہ تھا، اس لئے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ مدینہ کو واپس جائیں۔ عالیہ (مدینہ کی بالائی آبادی) پر عاصم بن عدی کو مقرر فرمایا، ان انتظامات کے بعد آپ بدر کی طرف بڑھے، جدھر سے اہل مکہ کی آمد کی خبر تھی۔ دو خبر رساں بسبس اور عدی آگے روانہ کر دیے گئے تھے کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں، روحاء، منصرف، ذات اجذال، معلات، اثیل سے گزرتے ہوئے ۱۷ رمضان کو بدر کے قریب پہنچے۔ خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آ گئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ یہیں رک گئے اور فوجیں اُتر پڑیں۔

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سروسامان سے نکلے تھے۔ ہزار آدمی کی جمعیت تھی، سو سواروں کا رسالہ تھا۔ رؤسائے قریش سب شریک تھے۔ ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آ سکا تھا اس لئے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا۔ رسد کا یہ انتظام تھا کہ امرائے قریش یعنی عباس بن مطلب، عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابوجہل، امیہ وغیرہ وغیرہ باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے۔ ❺ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا فوج کا سپہ سالار تھا۔

قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا "اب لڑنا ضروری نہیں۔" لیکن ابوجہل نے نہ مانا زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے، باقی فوج آگے بڑھی۔ قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے انہوں نے مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا تھا، بخلاف اس کے مسلمانوں کی طرف چشمہ یا کنواں تک نہ تھا۔ زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جاتے تھے۔ حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ جو

❶ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة بدر: ٤٦٢١۔ ❷ کتاب المغازی، باب قول الله تعالیٰ: اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم...... ٣٩٥٢۔ ❸ ابن سعد، جزء مغازی، ص: ٦۔

❹ منتخب کنز العمال بر حاشیه مسند احمد، ج ٤، ص: ١٠٥ به روایت ابن عساکر، بدر۔

❺ معارف ابن قتیبه، باب اسماء المطعمین من قریش فی غزوة بدر و سیرت ابن اسحاق به روایت ابن هشام غزوة بدر، ج ١، ص: ٤٠٦۔

مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے؟ یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ "وحی نہیں ہے۔" حضرت حباب رضی اللہ عنہ نے کہا: "تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنوئیں بیکار کر دیئے جائیں" ❶ آپ ﷺ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ تائید ایزدی اور حسن اتفاق سے مینہ برس گیا جس سے گرد جم گئی اور جا بجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لیئے گئے کہ وضو اور غسل کے کام آئیں۔ اس قدرتی احسان کا اللہ نے قرآن مجید میں بھی ذکر کیا ہے:

﴿ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ ﴾ (۸/ الانفال:۱۱)

"اور جبکہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا کہ تم کو پاک کرے۔"

پانی پر اگرچہ قبضہ کر لیا گیا لیکن ساقی کوثر کا فیض عام تھا۔ اس لئے دشمنوں کو بھی پانی لینے کی عام اجازت تھی۔ ❷ یہ رات کا وقت تھا۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے کمر کھول کھول کر رات بھر آرام کیا۔ لیکن صرف ایک ذات تھی (ذاتِ نبوی ﷺ) جو صبح تک بیدار اور مصروف دعا رہی۔ صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کے لئے آواز دی، بعد نماز جہاد پر وعظ فرمایا۔ ❸

قریش جنگ کے لئے بیتاب تھے، تاہم کچھ نیک دل بھی تھے جن کے دل خونریزی سے لرزتے تھے۔ ان میں حکیم بن حزام (جو آگے چل کر اسلام لائے) نے سردار فوج عتبہ سے جا کر کہا: "آپ چاہیں تو آج کا دن آپ کی نیک نامی کی ابدی یادگار رہ جائے۔" عتبہ نے کہا: کیونکر؟ حکیم نے کہا: "قریش کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے۔ وہ آپ کا حلیف تھا، آپ اس کا خون بہا ادا کر دیجئے۔" عتبہ نیک نفس آدمی تھا۔ اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ لیکن چونکہ ابوجہل کا اتفاق رائے ضروری تھا پس حکیم عتبہ کا پیغام لے کر گئے۔ ابوجہل ترکش سے تیر نکال کر پھیلا رہا تھا۔ عتبہ کا پیغام سن کر بولا: "ہاں عتبہ کی ہمت نے جواب دے دیا۔" عتبہ کے فرزند ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ اسلام لا چکے تھے اور اس معرکہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ آئے تھے اس بنا پر ابوجہل نے یہ بدگمانی کی کہ عتبہ اس لئے لڑائی سے جی چراتا ہے، کہ اس کے بیٹے پر آنچ نہ آئے۔

ابوجہل نے حضرمی کے بھائی ابوعامر کو بلا کر کہا، دیکھتے ہو! تمہارا خون بہا تمہاری آنکھ کے سامنے آ کر نکلا جاتا ہے۔ عامر نے عرب کے دستور کے مطابق کپڑے پھاڑ ڈالے اور گرد اڑا کر واعمراہ واعمراہ کا نعرہ مارنا شروع کیا، اس واقعہ نے تمام فوج میں آگ لگا دی۔ عتبہ نے ابوجہل کا طعنہ سنا تو غیرت سے سخت برہم ہوا اور کہا: میدان جنگ بتا دے گا کہ نامردی کا داغ کون اٹھاتا ہے۔ یہ کہہ کر مغفر مانگا۔ لیکن اس کا سر اس قدر بڑا تھا کہ کوئی مغفر اس کے سر پر ٹھیک نہ اترا۔ مجبوراً سر سے کپڑا لپیٹا اور لڑائی کے ہتھیار سجے۔

چونکہ آنحضرت ﷺ اپنے ہاتھ کو خون سے آلودہ کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے میدان

---

❶ ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۷۸۔ ❷ ابن ہشام، جلد ۲، ص: ۱۶۔

❸ منتخب کنز العمال غزوۃ بدر، ج ٤، ص: ۹۸ بہ روایت مسند ابن حنبل وابن ابی شیبہ۔

کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپ ﷺ اس میں تشریف رکھیں۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ دروازہ پر تیغ بکف کھڑے ہوئے کہ کوئی ادھر نہ بڑھنے پائے۔ اگر چہ بارگاہ الٰہی سے فتح و نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا، عناصر عالم آمادۂ مدد تھے، ملائکہ کی فوجیں ہمرکاب تھیں، تاہم عالم اسباب کے لحاظ سے آپ نے اصول جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں، مہاجرین کا علم مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا، خزرج کے علمبردار حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ اور اوس کے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مقرر ہوئے۔

صبح ہوتے ہوتے آپ نے صف آرائی شروع کی، دست مبارک میں ایک تیر تھا اس کے اشارہ سے صفیں قائم کرتے تھے۔ کہ کوئی شخص تل بھر آگے یا پیچھے نہ رہنے پائے۔ لڑائی میں شور وغل عام بات ہے لیکن منع کر دیا گیا کہ کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلنے پائے۔ اس موقع پر بھی جبکہ دشمن کی عظیم الشان تعداد مقابل تھی اور مسلمانوں کی طرف ایک آدمی بھی آ کر بڑھ جاتا تو کچھ نہ کچھ مسرت ہوتی۔ آنحضرت ﷺ ہمہ تن وفا تھے۔ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اور حضرت حُسیل رضی اللہ عنہ دو صحابی کہیں سے آ رہے تھے، راہ میں کفار نے روکا کہ محمد ﷺ کی مدد کو جا رہے ہو؟ انہوں نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کیا۔ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے تو صورت حال عرض کی، فرمایا: ''ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف اللہ کی مدد درکار ہے۔'' [1]

اب دو صفیں آمنے سامنے مقابل تھیں۔ حق و باطل، نور و ظلمت، کفر و اسلام۔

﴿ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۳)

''جو لوگ باہم لڑے ان میں تمہارے لئے عبرت کی نشانیاں ہیں۔ ایک اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا اللہ کا منکر تھا۔''

یہ عجیب منظر تھا، اتنی بڑی وسیع دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی، صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی، دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے:

''خدایا تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج پورا کر'' محویت اور بے خودی کے عالم میں چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی تھی اور آپ کو خبر تک نہ ہوتی تھی، کبھی سجدہ میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''خدایا! اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا۔'' [2] اس بے قراری پر بندگان خاص کو رقت آ گئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''حضور اللہ اپنا وعدہ وفا کرے گا۔'' آخر روحانی تسکین کے ساتھ:

﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝﴾ (٥٤/ القمر:٤٥)

''فوج کو شکست دی جائے گی اور وہ پشت پھیر دیں گے۔''

پڑھتے ہوئے لب مبارک فتح کی پیشین گوئی سے آشنا ہوئے۔ [3]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب الوفاء بالعهد: ٤٦٣٩۔ (س)

[2] مسلم، کتاب الجهاد، باب الامداد بالملائكة في غزوة بدر: ٤٥٨٨۔

[3] بخاری، کتاب المغازی، باب قول الله تعالى: اذ تستغيثون ربكم فاستجاب لكم : ٣٩٥٣۔

قریش کی فوجیں اب بالکل قریب آ گئیں۔ تاہم آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پیش قدمی سے روکا اور فرمایا: ”جب دشمن پاس آ جائیں تو تیر سے روکو۔“ یہ معرکہ، ایثار اور جان بازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر تھا۔ دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے (جو اب تک کافر تھے) میدان جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تلوار کھینچ کر نکلے۔ [1] عتبہ میدان میں آیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ (عتبہ کے فرزند تھے) اس کے مقابلہ کو نکلے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی۔ [2]

لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ سب سے پہلے عامر حضرمی جس کو بھائی کے خون کا دعویٰ تھا۔ آگے بڑھا، مہجع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام اس کے مقابلہ کو نکلا اور مارا گیا۔

عتبہ جو سردار لشکر تھا، ابوجہل کے طعنہ سے سخت برہم تھا۔ سب سے پہلے وہی بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا اور مبارز طلبی کی۔ عرب میں دستور تھا کہ نامور لوگ کوئی امتیازی نشان لگا کر میدان جنگ میں جاتے تھے۔ عتبہ کے سینہ پر شتر مرغ کے پر تھے۔ حضرت عوف، حضرت معاذ، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم مقابلہ کو نکلے۔ عتبہ نے نام و نسب پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ انصار ہیں تو عتبہ نے کہا ہم کو تم سے غرض نہیں۔ پھر آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے پکارا کہ محمد (ﷺ)! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں۔ [3] آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق انصار ہٹ آئے اور حضرت حمزہ، حضرت علی، حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہم میدان میں آئے، چونکہ (یہ لوگ خود پہنے تھے جس سے چہرے چھپ گئے تھے) [4] ان لوگوں کے چہروں پر نقاب تھی، عتبہ نے پوچھا تم کون ہو، سب نے نام و نسب بتائے۔ عتبہ نے کہا ”ہاں اب ہمارا جوڑ ہے۔“

عتبہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے اور ولید حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مقابل ہوا، اور دونوں مارے گئے، لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو زخمی کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑھ کر شیبہ کو قتل کر دیا اور عبیدہ رضی اللہ عنہ کو کندھے پر اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا میں دولت شہادت سے محروم رہا؟ آپ نے فرمایا ”نہیں تم نے شہادت پائی۔“ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا آج ابوطالب زندہ ہوتے تو تسلیم کرتے کہ ان کے اس شعر کا مستحق میں ہوں: [5]

---

[1] استیعاب، ذکر عبدالرحمن بن ابی بکر، ج ۲، ص: ۴۰۴ حیدر آباد، ۱۳۱۹ھ۔

[2] سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۸۸ مطبع محمد علی مصر۔

[3] کتب حدیث میں جو الفاظ ہیں مختلف ہیں، ابوداود (کتاب الجهاد، باب فی المبارزة: ۲۶۶۵) میں ہے کہ عتبہ نے کہا کہ ہم کو اپنے برادران عم زاد سے غرض ہے، تم سے کام نہیں، انصاری محدثین نے اس کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ ”اس سے انصار کی توہین منظور نہ تھی بلکہ یہ غرض تھی کہ انتقام خون کا مطالبہ قریش سے ہے انصار سے نہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مکہ والے انصار کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ صحیح روایتوں میں مذکور ہے کہ جب ابوجہل انصار کے ہاتھ سے مارا گیا تو مرتے وقت اس نے کہا: کاش! مجھ کو فلاحوں (کاشتکاروں) کے سوا کسی اور نے مارا ہوتا، انصار کھیتی کا پیشہ کرتے تھے جو قریش کے نزدیک معیوب تھا۔

[4] ابن سعد، غزوة بدر والبداية والنهاية ابن كثير ج ۳، ص: ۲۷۳ مطبوعه مصر۔

[5] زرقانی، ج ۱، ص: ۴۸۴ ان واقعات میں روایتیں مختلف ہیں اور قریباً سب ہم مرتبہ ہیں، اس لئے جو روایت اختیار کر لی جائے قابل الزام نہیں۔

ونسلمه حتى نصرّع حوله ونذهل عن ابنائنا والحلائل۔

''ہم محمد ﷺ کو اس وقت دشمنوں کے حوالہ کریں گے جب ان کے گرد لڑ کر مر جائیں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیبیوں سے بھلا نہ دیے جائیں۔''

سعید بن العاص کا بیٹا (عبیدہ) سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا صف سے نکلا اور پکارا کہ میں ابو کرش ہوں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس کے مقابلہ کو نکلے، چونکہ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں، تاک کر آنکھ میں برچھی ماری وہ زمین پر گرا اور مر گیا۔ [1] برچھی اس طرح پیوست ہوگئی تھی کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کی لاش پر پاؤں اڑا کر کھینچا تو بڑی مشکل سے نکلی، لیکن دونوں سرے خم ہو گئے، یہ برچھی یادگار رہی یعنی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ نے مانگ لی۔ پھر چاروں خلفا کے پاس منتقل ہوتی رہی پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی۔ [2]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس معرکہ میں کئی کاری زخم اٹھائے، شانہ پر جو زخم تھا اتنا گہرا تھا کہ اچھے ہو جانے پر اس میں انگلی چلی جاتی تھی، چنانچہ ان کے بیٹے (عروہ) بچپن میں ان زخموں سے کھیلا کرتے تھے، جس تلوار سے لڑے تھے وہ لڑتے لڑتے گر گئی تھی۔ چنانچہ جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو عبدالملک نے عروہ سے کہا: تم زبیر کی تلوار پہچان لو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں، عبدالملک نے پوچھا: کیونکر؟ بولے کہ بدر کے معرکہ میں اس میں دندانے پڑ گئے تھے، عبدالملک نے تصدیق کی اور یہ مصرع پڑھا، بهن فلول من قراع الكتائب، عبدالملک نے تلوار عروہ کو دے دی، انہوں نے اس کی قیمت لگوائی تو تین ہزار ٹھہری، اس کے قبضہ پر چاندی کا کام تھا۔ [3]

اب عام حملہ شروع ہو گیا، مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے۔ لیکن ادھر سرور عالم ﷺ سربسجدہ صرف اللہ کی قوت کا سہارا ڈھونڈ رہے تھے۔

ابوجہل کی شرارت اور دشمنی اسلام کا عام چرچا تھا۔ اس بنا پر انصار میں سے معوّذ اور معاذ دو بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آ جائے گا یا اس کو مٹا دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ دفعتہً مجھ کو داہنے بائیں دو نوجوان نظر آئے۔ ایک نے مجھ سے کان میں پوچھا کہ ابوجہل کہاں ہے؟ میں نے کہا: برادرزادے! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا کہ ''میں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ ابوجہل کو جہاں دیکھ لوں گا یا اسے قتل کر دوں گا یا خود لڑ کر مارا جاؤں گا؟'' میں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ سے کانوں میں یہی باتیں کہیں۔ میں نے دونوں کو اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے، بتانا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا۔ یہ دونوں جوان عفراء

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب: ۳۹۹۸ میں پورا واقعہ منقول ہے۔ [2] ایضًا۔

[3] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی جهل: ۳۹۷۳ کے ذکر میں ہے۔

کے بیٹے تھے "معوذ و معاذ رضی اللہ عنہما" ❶ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آکر معاذ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری، جس سے بازو کٹ گیا، لیکن تسمہ باقی لگا رہا، معاذ نے عکرمہ کا تعاقب کیا وہ بچ کر نکل گیا، معاذ رضی اللہ عنہ اسی حالت میں لڑ رہے تھے لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی، ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہو گیا، اور اب وہ آزاد تھے۔ ❷

آنحضرت ﷺ نے لڑائی سے پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ "کفار کے ساتھ جو لوگ آئے ہیں ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو خوشی سے نہیں بلکہ قریش کے جبر سے آئے ہیں۔" ان لوگوں کے نام بھی آپ نے بتا دیے تھے، ان میں ابوالبختری بھی تھا، مجذر انصاری کی نظر ابوالبختری پر پڑی، مجذر نے کہا چونکہ رسول اللہ ﷺ نے تیرے قتل سے منع فرمایا ہے، اس لئے تجھ کو چھوڑ دیتا ہوں، ابوالبختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا۔ ابوالبختری نے کہا اس کو بھی؟ مجذر نے کہا "نہیں" ابوالبختری نے کہا تو میں خاتونان عرب کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابوالبختری نے اپنی جان بچانے کے لئے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ❸ یہ کہہ کر ابوالبختری یہ رجز پڑھتا ہوا مجذر پر حملہ آور ہوا اور مارا گیا۔ ❹

لن یسلم ابن حُرۃٍ زمیله حتیٰ یموت اویرٰی سبیله

"شریف زادہ اپنے رفیق کو چھوڑ نہیں سکتا جب تک کہ مر نہ جائے یا وہ اپنا راستہ نہ دیکھ لے۔"

عتبہ اور ابوجہل کے مارے جانے سے قریش کا پائے ثبات اکھڑ گیا اور فوج میں بے دلی چھا گئی۔

آنحضرت ﷺ کا شدید دشمن امیہ بن خلف بھی جنگ بدر میں شریک تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس سے کسی زمانہ میں معاہدہ کیا تھا کہ وہ مدینہ میں آئے گا تو یہ اس کی جان کے ضامن ہوں گے۔ بدر میں اس اللہ کے دشمن سے انتقام لینے کا خوب موقع تھا۔ لیکن عہد کی پابندی اسلام کا شعار ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ وہ بچ کر نکل جائے، اس کو لے کر ایک پہاڑ پر چلے گئے۔ اتفاق یہ کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا، انصار کو خبر کر دی۔ دفعتہً لوگ ٹوٹ پڑے، انہوں نے امیہ کے بیٹے کو آگے کر دیا لوگوں نے اس کو قتل کر دیا، لیکن اس پر بھی قناعت نہ کی اور امیہ کی طرف بڑھے، انہوں نے امیہ سے کہا کہ تم زمین پر لیٹ جاؤ، یہ لیٹ گیا تو وہ اس پر چھا گئے کہ لوگ اس کو مارنے نہ پائیں۔ لیکن لوگوں نے ان کی ٹانگوں کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اس کو قتل کر دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی بھی ایک ٹانگ زخمی ہوئی اور زخم کا نشان مدتوں تک قائم رہا۔ ❺

❶ بخاری، کتاب المغازی، باب..... ۳۹۸۸ بعض روایتوں میں ان دونوں نوجوانوں کا نام معاذ بن عمرو بن جموع اور معاذ بن عفراء ہے۔ زرقانی میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور روایتوں کے درمیان تطبیق کی صورت بھی مذکور ہے۔ دیکھو زرقانی، ج ۱، ص:۴۹۶۔
❷ تاریخ طبری، ج ۳، ص ۱۳۲۹، ۱۳۳۰۔ ❸ عیون الاثر، ج ۱، ص:۲۵۸، مکتبہ قدسی: ۱۳۵۶ھ۔
❹ طبری، ج ۳، ص:۲۴۳۵۔ ❺ یہ پورا واقعہ صحیح بخاری میں ہے لیکن چونکہ کتاب المغازی میں نہیں بلکہ کتاب الوکالۃ، باب اذا وکل المسلم حربیاً: ۲۳۰۱ میں ہے، اس لئے ارباب سیر کی نظر نہیں پڑی۔

ابوجہل اور عتبہ وغیرہ کے قتل کے بعد قریش نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ حضرت عباس، حضرت عقیل (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) نوفل، اسود بن عامر، عبداللہ بن زمعہ اور بہت سے بڑے بڑے معزز لوگ گرفتار ہوئے۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی شخص جا کر خبر لائے، ابوجہل کا کیا انجام ہوا؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جا کر لاشوں میں دیکھا تو زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا، بولے: تو ابوجہل ہے؟ اس نے کہا: ''ایک شخص کو اس کی قوم ❶ نے قتل کر، یا تو یہ فخر کی کیا بات ہے'' ابوجہل نے ایک دفعہ ان کو تھپڑ مارا تھا، انہوں نے اس کے انتقام میں اس کی گردن پر پاؤں رکھا، ابوجہل نے کہا: او بکری چرانے والے! دیکھ تو کہاں پاؤں رکھتا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کا سر کاٹ لائے اور آنحضرت ﷺ کے قدموں پر ڈال دیا۔ ❷

مغربی مؤرخین کو جن کے نزدیک عالم اسباب میں جو کچھ ہے صرف اسباب ظاہری کے نتائج ہیں۔ حیرت ہے کہ تین سو پیدل آدمیوں نے ایک ہزار جن میں سو سواروں کا رسالہ تھا کیونکر فتح ہوئی، لیکن تائید آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں۔ تاہم اس واقعہ میں ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں، اوّل تو قریش میں باہم اتفاق نہ تھا۔ عتبہ سردار لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا، قبیلہ زہرہ کے لوگ بدر تک آ کر واپس چلے گئے، پانی برسنے سے موقع جنگ کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ قریش جہاں صف آرا تھے وہاں کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا، قریش مرعوب ہو کر اسلامی فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے، یعنی اپنی تعداد سے دوگنا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ﴾. (۳/ آل عمران:۱۳)

''وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے آپ سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔''

کفار کی فوج میں کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی، بخلاف اس کے آنحضرت ﷺ نے خود دست مبارک میں تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفیں درست کی تھیں۔ مسلمان رات کو اطمینان سے سوئے، صبح اٹھے تو تازہ دم تھے۔ بخلاف اس کے کفار، بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔

تاہم یہ اسباب ہیں، ان کا اجتماع اور تہیہ یہی تائید الٰہی ہے۔ پھر قریش اور مسلمانوں کی فوج کا باہم مقابلہ کرو تو نظر آئے گا کہ عام فوجی نظر کیا مسلمانوں کی فتح کی مقتضی تھی۔ قریش کی فوج میں بڑے بڑے دولتمند تھے، جو تنہا تمام فوج کی رسد کا سامان کرتے تھے، مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا، قریش کی تعداد ایک ہزار تھی، مسلمان صرف ۳۰۰ تھے، قریش میں سو سوار تھے، مسلمانوں کی فوج میں صرف دو گھوڑے تھے، مسلمانوں میں بہت کم سپاہی تمام ہتھیاروں سے لیس تھے اور ادھر قریش کا ہر سپاہی لوہے میں غرق تھا۔

بایں ہمہ خاتمہ جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں سے صرف ۱۴ شخصوں نے شہادت پائی۔ جن میں ٦

❶ بخاري، كتاب المغازي، باب قتل ابى جهل: ٣٩٦٢، ٣٩٦٣۔

❷ زرقانی، ج۱، ص:٤٩٦ بروایتِ ابن اسحاق وحاكم۔

مہاجر اور باقی انصار تھے، لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی، رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قبائل کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے، ان میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج، قریش کے سرتاج تھے، قریباً ۷۰ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے، اسیران جنگ میں سے عقبہ اور نضر بن حارث قتل کر دیے گئے۔ باقی گرفتار ہو کر مدینہ میں آئے۔ ان میں حضرت عباس، حضرت عقیل، (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) ابو العاص (آنحضرت ﷺ کے داماد) بھی تھے۔

لڑائیوں میں آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جہاں کوئی لاش نظر آتی تھی، آپ اس کو زمین میں دفن [1] کرا دیتے، لیکن اس موقع پر کشتوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے ایک ایک کا الگ الگ دفن کرانا مشکل تھا۔ ایک وسیع کنواں تھا، تمام لاشیں آپ نے اس میں ڈلوا دیں، لیکن امیہ کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی کہ جگہ سے ہٹائی جائے، اس لئے وہیں خاک میں دبا دی گئی۔ [2]

اسیران جنگ جب مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے سامنے آئے تو حضرت سودہ (آنحضرت ﷺ کی زوجہ محترمہ) بھی تشریف رکھتی تھیں۔ ان قیدیوں میں ان کے عزیز سہیل بن عمرو بھی تھے، ان پر نگاہ پڑی تو بے ساختہ بول اٹھیں کہ تم نے عورتوں کی طرح خود بیڑیاں پہن لیں، یہ نہ ہو سکا کہ لڑ کر مر جاتے۔ [3] اسیران جنگ دو دو، چار چار صحابہ کو تقسیم کر دیے گئے۔ اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے۔ ان قیدیوں میں ابو عزیز بھی تھے جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے۔ مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا، لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس دیتے اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت ﷺ نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ [4]

(قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا، جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں آنحضرت ﷺ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! اس کے دو نچلے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "کہ میں اگر اس کے عضو بگاڑوں گا (مثلہ) تو گو نبی ہوں لیکن اللہ اس کی جزا میں میرے اعضاء بھی بگاڑ دے گا۔") [5]

اسیران جنگ کے پاس کپڑے نہ تھے، آنحضرت ﷺ نے سب کو کپڑے دلوائے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بدن پر کرتہ نہ تھا لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کرتہ ان کے بدن پر ٹھیک نہیں

[1] روض الانف، ج ۲، ص: ۷۵ مطبعہ مصر: ۱۹۱۴ء۔ [2] ابن ہشام، ج ۲، ص: ۷۴ بر حاشیہ روض الانف۔ [3] ایضاً، ص: ۷۷، ۷۸۔ [4] طبری، ج ۳، ص: ۱۳۳۸۔ [5] طبری، ج ۳، ص: ۱۳۴۴۔

اتر تا تھا۔ عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) نے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ہم قد تھا، اپنا کرتہ منگوا کر دیا، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عبداللہ کے کفن کے لئے جو اپنا کرتہ عنایت فرمایا تھا، وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا۔ [1] عام روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں آ کر صحابہ سے مشورہ کیا کہ اسیران جنگ کے معاملہ میں کیا کیا جائے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیے جائیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ میں دوست دشمن، عزیز و اقارب، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی، اس لئے انہوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیے جائیں اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کرے۔ مگر یہاں آنحضرت ﷺ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا اس پر اللہ کا عتاب آیا اور یہ آیت اتری:

﴿ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ (٨/ الانفال:٦٨)

''اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا، اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔''

آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ عتاب ربانی سن کر رو پڑے۔ [2]

یہ روایت تمام تاریخوں میں مذکور اور احادیث میں بھی موجود ہے لیکن سبب عتاب کے بیان میں اختلاف ہے۔ ترمذی میں جو روایت ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس وقت تک مالِ غنیمت کے متعلق احکام نہیں آئے تھے۔ عرب کے عام دستور کے موافق صحابہ رضی اللہ عنہم غنیمت میں مصروف ہو گئے۔ اس پر عتاب آیا، چونکہ اس کے متعلق پہلے کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لئے یہ جرم معاف کر دیا گیا اور حکم آیا کہ مال غنیمت جو ہاتھ آ چکا حلال ہے۔ قرآن مجید میں عتاب کے بعد یہ الفاظ ہیں:

﴿ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ ﴾. (٨/ الانفال:٦٩)

''تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال، طیب ہے۔'' [3]

اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ مال جو ہاتھ آیا تھا وہ حلال کر دیا گیا اور وہ مال غنیمت تھا، غرض صحیح مسلم اور ترمذی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے یا مال غنیمت کے لوٹنے پر تھا۔ صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ جب عتاب کی آیت نازل ہوئی تو آپ رونے لگے اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ((ابکی الذی عرض علی اصحابك من اخذهم الفداء)) یعنی ''تمہارے ساتھیوں نے جو فدیہ لیا اس پر، جو اللہ کی طرف سے پیش کیا گیا اس پر، رو رہا ہوں۔'' عموماً لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ عتاب اس پر آیا کہ اسیران جنگ کو قتل کیوں نہیں کر ڈالا۔ چنانچہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الکسوة للاساری:٣٠٠٨۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الامداد بالملائکة فی غزوة بدر:٤٥٨٨۔ [3] جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، تفسیر سورة الانفال: ٣٠٨٥۔

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ ﴾ (۸/ الانفال:۶۸)

''کسی نبی کو یہ مناسب نہیں کہ بغیر اچھی طرح خونریزی کرنے کے لوگوں کو قیدی بنائے۔''

لیکن اس آیت کا صرف یہ ماحصل ہے کہ میدان جنگ میں جب تک کافی خونریزی نہ ہو چکے، قیدی بنانا مناسب نہیں، اس سے یہ کیونکر ثابت ہوسکتا ہے کہ اگر خونریزی سے پہلے لوگ گرفتار کر لئے گئے تو لڑائی کے بعد بھی وہ قتل کئے جاسکتے ہیں؟

بہر حال اسیران جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لیا گیا، لیکن جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے، وہ چھوڑ دیے گئے، ان میں سے جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے ان کو حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں [1] تو چھوڑ دیے جائیں گے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اسی طرح پڑھنا لکھنا سیکھا تھا۔ [2]

انصار نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہمارے بھانجے ہیں۔ ہم ان کا فدیہ چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے مساوات کی بنا پر گوارا نہیں فرمایا [3] اور ان کو بھی فدیہ ادا کرنا پڑا۔ فدیہ کی عام مقدار ۴،۴ ہزار درہم تھی، لیکن امراء سے زیادہ لیا گیا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ دولتمند تھے، اس لئے ان سے بھی زیادہ رقم وصول کی گئی، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی، لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ اسلام نے جو مساوات قائم کی، اس میں قریب و بعید، عزیز و بیگانہ، عام و خاص کے تمام تفرقے مٹ چکے تھے، (لیکن ایک طرف تو ادائے فرض کی یہ مساوات تھی، دوسری طرف محبت کا یہ تقاضا تھا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی کراہ سن کر رات کو آپ آرام نہ فرما سکے۔ لوگوں نے ان کی گرہ کھولی تو آپ ﷺ نے آرام فرمایا)۔

آنحضرت ﷺ کے داماد ابو العاص بھی اسیران جنگ میں آئے تھے، ان کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کو (جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں) کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا جب نکاح ہوا تھا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جہیز میں ان کو ایک قیمتی ہار دیا تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے زرفدیہ کے ساتھ وہ ہار بھی گلے سے اتار کر بھیج دیا۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو ۲۵ برس کا محبت انگیز واقعہ یاد آ گیا۔ آپ بے اختیار رو پڑے اور صحابہ سے فرمایا: ''تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو۔'' سب نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں اور وہ ہار واپس کر دیا۔ [4]

(ابو العاص رہا ہو کر مکہ آئے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ بھیج دیا، ابو العاص بہت بڑے تاجر تھے۔ چند سال کے بعد بڑے سروسامان سے شام کی تجارت لے کر نکلے، واپسی میں مسلمان دستوں نے ان کو مع تمام مال و اسباب گرفتار کر لیا، اسباب ایک ایک سپاہی پر تقسیم ہو گیا، یہ چھپ کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے

[1] مسند ابن حنبل، ج۱، ص: ۲۴۷۔ [2] طبقات ابن سعد، جزء مغازی، قسم اول، ص: ۱۴۔

[3] بخاری، کتاب المغازی، باب ... ۴۰۱۸۔

[4] تاریخ طبری، ج۳، ص:۱۳۴۸ وابو داود، کتاب الجهاد، باب فی فداء الاسیر بالمال:۲۶۹۲۔

پاس پہنچے، انہوں نے پناہ دی۔ آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ ''اگر مناسب سمجھو تو ابوالعاص کا اسباب واپس کر دو۔'' پھر تسلیم کی گردنیں جھک گئیں اور سپاہیوں نے ایک ایک دھاگا تک لا لا کر واپس کر دیا اب یہ وار ایسا نہ تھا جو خالی جاتا۔ ابوالعاص مکہ آئے اور تمام شرکا کو حساب سمجھا کر دولت اسلام سے فائز ہوئے اور کہہ دیا کہ میں اس لئے یہاں آ کر اور حساب سمجھا کر جاتا ہوں، تاکہ یہ نہ کہو کہ ابوالعاص ہمارا روپیہ کھا کر تقاضے کے ڈر سے مسلمان ہو گیا)۔ [1]

بدر کی خبر مکہ میں پہنچی تو گھر گھر ماتم تھا لیکن غیرت کی وجہ سے قریش نے منادی کرا دی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے۔ اس لڑائی میں اسود کے تین لڑکے مارے گئے، اس کا دل امنڈ آتا لیکن قومی عزت کے خیال سے رو نہیں سکتا تھا۔ اتفاق یہ کہ ایک دن کسی طرف سے رونے کی آواز آئی، سمجھا کہ قریش نے رونے کی اجازت دے دی ہے، نوکر سے کہا: دیکھنا کون روتا ہے؟ کیا رونے کی اجازت ہو گئی؟ میرے سینہ میں آگ لگ رہی ہے جی کھول کر رو لوں تو تسکین ہو جائے۔ آدمی نے آ کر کہا ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے اس کے لئے رو رہی ہے، اسود کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکلے:

اتبكي ان يضل لها بعير	''اونٹ کے گم ہونے پر روتی ہے
ويمنعها من النوم السهود	اور اسکو نیند نہیں آتی (اونٹ پر)
فلا تبكي على بكر ولكن	مت رو، بدر پر آنسو بہا، جہاں
على بدر تقاصرت الجدود	قسمت نے کمی کی، تجھ کو رونا ہے
فبكي ان بكيت على عقيل	تو عقیل پر رو، اور حارث پر رو جو
وبكي حارثا اسد الاسود	شیروں کا شیر تھا۔''

(عمیر بن وہب قریش میں اسلام کا سخت دشمن تھا۔ وہ اور صفوان بن امیہ حجر میں بیٹھے ہوئے مقتولین بدر کا ماتم کر رہے تھے۔ صفوان نے کہا: ''اللہ کی قسم! اب جینے کا مزہ نہیں۔'' عمیر نے کہا: سچ کہتے ہو، اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمد ﷺ کو قتل کر آتا، میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے۔ صفوان نے کہا: تم قرض کی اور بچوں کی فکر نہ کرو، ان کا میں ذمہ دار ہوں، عمیر نے گھر آ کر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ پہنچا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے تیور دیکھ لئے، گلا دبائے اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''عمر! چھوڑ دو، عمیر قریب آ جاؤ۔'' پوچھا: ''کس ارادہ سے آئے۔'' جواب دیا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔ فرمایا: ''پھر تلوار کیوں حمائل ہے؟'' عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں، فرمایا: ''کیوں نہیں، تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی۔'' عمیر آپ ﷺ کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔ بے اختیار ہو کر بولا: محمد (ﷺ)! بیشک تم پیغمبر ہو، باللہ میرے اور صفوان کے سوا اس

[1] تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۳۵۱۔

معاملہ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ قریش جو آنحضرت ﷺ کے قتل کی خبر سننے کے منتظر تھے انہوں نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سنی۔

حضرت عمیر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو کر بہادرانہ مکہ میں آئے جہاں کا ہر ذرہ اس وقت مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا۔ ان کو اسلام کے دوستوں سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی، اسی شدت سے وہ اب دشمنان اسلام کے دشمن تھے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا اور ایک مجمع کثیر کو اس روشنی سے منور کر دیا)۔ [1]

غزوۂ بدر کا بیان قرآن میں

اس غزوہ کو دیگر غزوات پر جو امتیازات حاصل ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خود اللہ نے اپنے کلام پاک میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور ایک خاص سورۂ (انفال) بدر کے احسانات و نعم کی تفصیل اور بعض مسائل متعلقہ بدر کی توضیح کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ واقعہ کی اصل حقیقت جاننے کے لئے آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح ماخذ موجود نہیں:

(۱) ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۪ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا

[1] یہ تمام واقعات تاریخ طبری میں بحوالہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مذکور ہیں، ج ۳، ص: ۱۳۵۴۔

مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

(۸/ الانفال ۲ تا ۱۹)

’’مومن وہ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں، جو نماز بہ پابندی پڑھتے ہیں اور اللہ نے جو ان کو روزی دی ہے۔ اس سے راہ الٰہی میں بھی کچھ دیتے ہیں، یہ ہیں سچے مومن، ان کے لئے اللہ کے پاس رتبے ہیں، بخشش ہے اور اچھی روزی ہے، جس طرح اے پیغمبر! تیرا اللہ تجھ کو حق پر تیرے گھر سے (بدر تک) نکال لایا، حالانکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے ناخوش تھا۔ وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑتا ہے، گویا کہ وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور وہ موت کو دیکھ رہے ہیں اور جب اللہ تم سے قریش کے قافلہ اور قریش کی فوج میں سے ایک کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمہارے لئے ہے، تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو مل جائے (یعنی قافلہ) اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنے حکم سے ثابت کرے اور باطل کو مٹائے۔ گو گناہگار اس سے رنجیدہ ہوں۔ یاد کرو، جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے، اس نے تمہاری سنی (اور کہا) میں تمہاری لگا تار ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا۔ اللہ نے یہ صرف مسلمانوں کی خوشی اور اطمینان قلب کے لئے کہا اور فتح تو صرف اللہ کے پاس ہے، اللہ غالب و دانا ہے۔ یاد کرو، جب تمہاری تسکین کے لئے اپنی طرف سے اونگھ تم پر طاری کر رہا تھا اور آسمان سے پانی برسا رہا تھا کہ تم کو پاک کرے اور شیطان کی ناپاکی تم سے دور کرے اور تمہارے دل مضبوط کرے اور ثابت قدم رکھے۔ یاد کرو، جب اللہ فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا، میں کافروں کے دل میں رعب ڈال دوں گا۔ کافروں کی گردنیں مارو اور ہر جوڑ پر مارو، یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول سے دشمنی کی ہے اور جو اللہ اور اللہ کے رسول سے دشمنی کرے گا اللہ اس کو سخت عذاب دینے والا ہے، یہ ہے عذاب اس کا مزہ چکھو، کافروں کے لئے عذاب دوزخ ہے۔ مسلمانو! جب میدان جنگ میں کافروں کے مقابل آؤ تو پشت نہ پھیرو اور بجز اس

کے کہ لڑنے کیلئے مڑے یا کسی دستہ کی طرف پھرے جو کوئی پشت پھیرے وہ اللہ کا غضب لائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔ مسلمانو! ان کافروں کو تم نے نہیں مارا لیکن اللہ نے مارا اور اے محمد ﷺ! تم نے نہیں پھینکا جب تم نے پھینکا، لیکن اللہ نے پھینکا، تا کہ اپنی طرف سے اہل ایمان کو اچھا انعام دے، اللہ دانا اور بینا ہے اور کافروں کے داؤ پیچ کو کمزور کرنے والا ہے، اگر فتح چاہتے تھے تو فتح آ چکی، اب اگر رک جاؤ تو بہتر ہے اور اگر تم پھر مخالفت پر آمادہ ہو گے تو ہم پھر مسلمانوں کی مدد کریں گے، یاد رکھو کہ تمہاری جمعیت کچھ مفید نہیں گو وہ کتنی ہی کثیر ہے اور اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔"

(۲) ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۭ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ڏ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ ﴾ (۸/ الانفال: ۴۱ تا ۴۷)

"اور جان لو کہ جو مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے، اہل قرابت کے لئے، یتیموں کے لئے، مسکینوں کے لئے اور مسافروں کے لئے ہے۔ اگر اللہ پر تم ایمان لا چکے ہو اور حق و باطل میں فرق کر دینے والے دن میں (یعنی بدر میں) اللہ نے اپنے بندہ پر جو (فتح) اتاری، اس کو مان چکے، جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا۔ اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے آتے تو وقت میں اختلاف ہو جاتا، لیکن (اللہ نے یہ اس لئے کر دیا) تا کہ جو ہونے والا تھا، اللہ اس کو کر دے،

تاکہ جس کو مرنا ہو وہ بھی دلیل دیکھ کے مرے اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل دیکھ کے زندہ رہے اور بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یاد کرو جب اللہ تم کو جنگ کی حالت میں ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا، اگر زیادہ کر کے دکھاتا تو تم سست پڑ جاتے اور باہم جھگڑ پڑتے، لیکن اللہ نے محفوظ رکھا وہ سینوں کے بھید سے واقف ہے، جب تمہاری نظر میں اللہ ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا اور تم کو ان کی نگاہ میں، تاکہ جو ہونے والا ہے اللہ اس کو پورا کرے اور اسی کی طرف تمام معاملے پھرتے ہیں۔ مسلمانو! جب کسی دستۂ فوج سے مقابلہ آ پڑے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو اکثر یاد کیا کرو، تاکہ کامیاب ہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا نہ کرو، ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ مستقل رہو، اللہ مستقل لوگوں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں (یعنی قریش) کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ، نمائش اور دکھاوے کے ساتھ اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے اور اللہ ان کے تمام کاموں کو گھیرے ہوئے ہے۔“

(۳) ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖؗ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۶۷ تا ۷۱)

”پیغمبر ﷺ کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے پاس قیدی ہوں، تا آنکہ خوب زمین میں لڑ نہ لے، تم دنیا کی دولت چاہتے ہو (قیدی ہوں گے تو فدیہ ہاتھ آئے گا) اور اللہ آخرت چاہتا ہے، اللہ دانا اور توانا ہے۔ اگر اللہ کی تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو قیدیوں سے لے لیا، اس پر تم کو دردناک عذاب پہنچتا، اب جو کچھ تم کو غنیمت میں ملا، کھاؤ، وہ حلال وطیب ہے اور اللہ سے ڈرا کرو، اللہ آمرزگار اور مہربان ہے۔ اے پیغمبر! تمہارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو کہ اللہ اگر تمہارے دلوں میں کچھ نیکی دیکھے گا تو تم سے جو لیا گیا ہے اس کے بدلہ وہ نیکی عطا کرے گا۔ اور تمہیں معاف کرے گا، وہ بخشش اور مہربانی والا ہے اور اگر یہ قیدی تجھ سے خیانت کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، اس لئے تو اللہ نے ان کو تمہارے قابو میں کر دیا، اللہ دانا اور باخبر ہے۔“

اللہ نے اسی احسان کو احد کے موقع پر یاد دلایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۲۳)

''یقیناً اللہ نے تمہاری بدر میں مدد کی جب تم کمزور تھے، تو اللہ سے ڈرو، تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔''

غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور سے اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوۂ بدر کا مقصد جیسا کہ عام مؤرخین نے بیان کیا ہے، کاروانِ تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔

میں اس بات سے خوب واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمۂ عدالت میں فرق ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا انداز بیان مقدمۂ دیوانی یا فوجداری کے فیصلہ لکھنے سے بالکل مختلف ہے۔ میں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ نگاری ہے، فیصلہ نویسی نہیں۔ لیکن موقع ایسا آپڑا ہے کہ ایک تاریخی واقعہ نے مقدمہ عدالت کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس لئے مجھ کو اپنے منصب سے ہٹ کر فصل مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے۔

اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مؤرخین اور ارباب سیر میرے حریف مقابل ہیں۔ نہایت جلد نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے۔ سلسلۂ کلام کے اچھی طرح پیش نظر رکھنے کے لئے سب سے پہلے ہم کو بتا دینا چاہیے کہ (ہماری تحقیقات کی رو سے) واقعہ کی اصلی صورت کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرمی کے قتل نے تمام مکہ کو جوشِ انتقام سے لبریز کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آگئیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے سے پُر حذر رہتے اور جیسا کہ ایسی حالتوں میں عام قاعدہ ہے غلط خبریں خود بخود مشہور ہو کر پھیل جاتی ہیں، اسی اثنا میں ابوسفیان قافلۂ تجارت کے ساتھ شام گیا اور ابھی وہ شام میں تھا کہ یہ خبر وہاں مشہور ہوگئی کہ مسلمان قافلے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ابوسفیان نے وہیں سے مکہ کو آدمی دوڑایا کہ قریش کو خبر ہو جائے قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مدینہ میں یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمعیت عظیم لے کر مدینہ آرہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔

اس بحث کے فیصلہ کے لئے سب سے پہلے ان واقعات کو یک جا لکھ دینا چاہیے جن پر دونوں فریق کا اتفاق ہے، تاکہ وہ انفصال بحث میں اصول موضوعہ کے طور پر کام آئیں، وہ یہ ہیں:

① قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے تو اس کے مقابلہ میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائے گا؟

② کتبِ حدیث میں صحت کے لحاظ سے باہم جو فرق مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں، تو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر ان کا استمزاج کیا۔ مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی، لیکن آنحضرت ﷺ انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے۔ یہ دیکھ کر سعد یا اور کوئی معزز انصاری اٹھے اور کہا: یارسول اللہ! کیا آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا اللہ دونوں جا کر لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اللہ کی قسم! اگر آپ حکم

دیں تو ہم آگ اور سمندر میں کود پڑیں۔ ❶

یہ بھی مسلّم ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں تصریح ہے:

﴿ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۵)

''اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعاً ناخوش تھا۔''

عموماً ارباب سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ میں جب آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تو صرف یہ اقرار کیا تھا کہ ''جب کوئی دشمن خود مدینہ پر حملہ آور ہوگا تو انصار مقابلہ کریں گے''۔ یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے۔ ان واقعات کے بعد اب مرکز بحث یہ ہے کہ ''یہ واقعات کہاں پیش آئے؟'' اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ جب آپ مدینہ سے نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا، دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لئے چلے آتے ہیں۔ اس وقت آپ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں، آگے کے واقعات یہیں پیش آئے، لیکن کتب سیر، تاریخ اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے (قرآن) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے:

﴿ كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال: ۵ تا ۷)

''جس طرح تجھ کو تیرے اللہ نے تیرے گھر سے حق پر نکالا درآنحالیکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا، یہ لوگ حق کے ظاہر ہوئے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور موت کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جبکہ اللہ تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی۔ اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آ جائے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔''

① ترکیبِ نحوی کے رو سے وَاِنَّ میں جو واؤ ہے، حالیہ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے، نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے، کیونکہ واؤ حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور

❶ طبری، ج۳، ص:۱۳۰۲؛ ابن ہشام، ج۱، ص:۳۷۵۔

زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے۔

② آیت مذکورہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے۔ ایک کاروان تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آ رہی تھی۔ ارباب سیر کہتے ہیں کہ آیتِ قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت ﷺ بدر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروانِ تجارت صحیح سلامت بچ کر نکل گیا تھا اس وقت یہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ ''دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے۔'' اس لئے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہوسکتا ہو اور یہ صرف وہ وقت ہوسکتا ہے جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آ گئی تھیں کہ ادھر ابوسفیان کاروانِ تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

③ سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورۂ بالا میں کفار کے دو فریق کا اللہ نے بیان کیا ہے، ایک قافلۂ تجارت اور دوسرا صاحب شوکت یعنی کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے آ رہے تھے۔ آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروان تجارت پر حملہ کیا جائے۔ اللہ نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا:

﴿ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (۸/ الانفال:۷)

''اور تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو ہاتھ آ جائے اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔''

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف اللہ ہے۔ جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

④ اب واقعہ کی نوعیت پر غور کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر و انصار ساتھ ہیں۔ ان میں فاتح خیبر اور حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ سید الشہداء بھی ہیں، جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے۔ باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بہ تصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے کچھ صحابہ کا دل بیٹھا جاتا ہے اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لئے جاتا ہے:

﴿ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ

اِلَى الْمَوْتِ﴾ (۸/ الانفال:۵، ۶)

''اور مسلمانوں کی ایک جماعت کارہ تھی، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑا کرتی تھی، گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں۔''

اگر صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف، یہ اضطراب، یہ پہلوتہی کس بنا پر تھی، اس سے پہلے بارہا (بقول ارباب سیر) قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لئے تھوڑے آدمی بھیج دیے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا تھا۔ اس دفعہ اسی قافلہ کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں۔ یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں خبر آ گئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ پر آ رہے ہیں۔

⑤ قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپ مدینہ ہی میں تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری تفسیر سورۂ نساء میں تصریحاً مذکور ہے۔ آیت یہ ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَي الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ﴾

(٤/ النسآء:٩٥)

''بجز معذوروں کے، وہ لوگ جو بیٹھ رہے اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، درجہ میں فضیلت دی ہے۔''

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے، کہ وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے، دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ [1] صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غیر اولی الضرر کا جملہ نہ تھا، یہ آیت سن کر عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اندھے پن کا عذر کیا۔ اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا ''غیرُ اُولی الضَّرر'' [2] یعنی ''معذوروں کے سوا'' یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔

⑥ کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے بدر میں آئے ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾

(٨/ الانفال:٤٧)

''اور (ان لوگوں کی طرح نہ بنو) جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور اللہ کی راہ سے روکتے

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب لا یستوی القعدون من المؤمنین: ٤٥٩٥۔ [2] ایضا: ٤٥٩٢ تا ٤٥٩٤۔

ہوئے نکلے۔"

اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لئے نکلتے تو اللہ یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہارِ شان اور دکھاوے کے لئے اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ اس میں اظہارشان اور دکھاوے کی کیا بات تھی اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ چونکہ حقیقت میں وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تھے، جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان ونمائش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا۔ اس لئے اللہ نے اس کو غرور ونمائش اور صدعن سبیل اللہ کہا۔

قرآن مجید کے بعد احادیث نبوی کا درجہ ہے۔ احادیث کی متعدد کتابوں میں غزوۂ بدر کا مفصل ومجمل ذکر ہے، لیکن حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ آنحضرت ﷺ بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لوٹنے کے لئے نکلے تھے۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ ہے:

عن عبداللّٰه بن كعب قال كعب لم اتخلف عن رسول اللّٰه ﷺ فى غزوة غزاها الا غزوة تبوك غير انى كنت تخلفت فى غزوة بدر ولم يعاتب احد تخلف عنها ، انما خرج النبى ﷺ يريد عير قريش ، حتى جمع اللّٰه بينه وبينهم على غير ميعاد۔ [1]

"حضرت کعب کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا، بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہ تھا اور جو اس میں شریک نہ ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیونکہ آنحضرت ﷺ قریش کے قافلہ کے لئے نکلے تھے کہ اللہ نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔"

اس کے برخلاف حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ جو صحیح مسلم میں ہے:

(۱) عن انس ان رسول اللّٰه ﷺ شاور حين بلغه اقبال ابى سفيان قال فتكلم ابوبكر فاعرض عنه ، ثُمَّ تكلم عمر فاعرض عنه فقام سعد بن عبادة فقال ايانا تريد يارسول اللّٰه والذى نفسى بيده لو امرتنا ان نخيضها البحر لا خضناها ولو امرتنا ان نضرب اكبادها الى برك الغماد لفعلنا قال فندب رسول اللّٰه ﷺ الناس فانطلقوا حتى نزلوا بدرا۔

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر

[1] بخاری، كتاب المغازى، باب قصة غزوة بدر: ۳۹۵۱۔

معلوم ہوئی تو آپ نے مشورہ طلب کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بولے تو آپ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے آپ نے ان کی طرف بھی توجہ نہ کی، پھر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا روئے خطاب ہم انصار کی طرف ہے، اللہ کی قسم! اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے تو ہم کریں گے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت دی، لوگ چل پڑے اور بدر پر اترے۔''

(۲) وو ردت عليهم روايا قريش وفيهم غلام اسود لبني الحجاج فاخذوه فكان اصحاب رسول الله ﷺ يسألونه عن ابي سفيان واصحابه فيقول مالي علم بابي سفيان ولكن هذا ابوجهل وعتبة وشيبة وامية بن خلف فاذا قال ذلك ضربوه فقال نعم انا اخبركم هذا ابوسفيان فاذا تركوه فقال مالي بابي سفيان من علم ولكن هذا ابوجهل وعتبة وشيبة وامية بن خلف في الناس فاذا قال هذا ايضا ضربوه ورسول الله ﷺ قائم يصلي فلما راى ذلك انصرف قال والذي نفسي بيده لتضربوه اذا صدقكم وتتركوه اذا كذبكم۔ [1]

''اور (پہلے) قریش کا ہراول دستہ آ کر اُترا، اس میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا۔ مسلمانوں نے اس کو گرفتار کر لیا اور اس سے ابوسفیان کا حال پوچھنے لگے، وہ کہتا تھا مجھے ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن یہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف آ رہے ہیں۔ جب وہ یہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے، وہ کہتا اچھا ابوسفیان کا بتاتا ہوں۔ تب اس کو چھوڑ دیتے۔ تو پھر پوچھتے تو وہ کہتا مجھ کو ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف رؤسائے قریش آ رہے ہیں، لیکن جب وہ یہ کہتا تب بھی اس کو مارتے، آنحضرت ﷺ نماز میں مشغول تھے، آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔''

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا، اسی وقت آپ نے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اور یہ مطلقاً ثابت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا۔ اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لئے آپ ﷺ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی، ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتب سیرت میں مذکور ہے تو اس وقت انصار وہاں کہاں ہوتے؟ اور نیز اسی ٹکڑے میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ

[1] صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، غزوة بدر: ٤٦٢١۔

نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی، حالانکہ ارباب سیرت کے مطابق واقع یہ ہونا چاہیے کہ انصار معاہدہ اور معمول سابق کے خلاف شرکت کے لئے نکلے۔ آنحضرت ﷺ نے پھر ان کا عندیہ دریافت فرمایا اور اس کے بعد شرکت کے لئے آمادہ کیا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔

حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بہ وضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقے سے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے۔ گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔ اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنا ہے کہ اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی تو آنحضرت ﷺ اس اصرار اور سروسامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے؟ اس لئے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضا یہ ہے کہ یہ ہو کہ ”جب مشرکین مکہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی۔ چنانچہ اسی واقعہ کو انہیں الفاظ کے ساتھ امام احمد بن حنبل نے مسند میں، [1] ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، [2] ابن جریر نے تاریخ میں [3] اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور اس کو ”صحیح“ کہا ہے اور اس کے راوی معرکۂ بدر کے ہیرو اسد اللہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں:

> عن علی قال لما قدمنا المدينة اصبنا من ثمارها فاجتويناها واصابنا بها وعك وكان النبی ﷺ يتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشركين قد اقبلوا سار رسول الله ﷺ الی بدر وبدر بئر فسبقنا المشركين اليها۔
>
> (اس کے بعد بدر کے تمام واقعات و جزئیات مذکور ہیں)
>
> ”حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے، اس لئے ہم لوگ بیمار ہو گئے، آنحضرت ﷺ بدر کو پوچھا کرتے تھے جب ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آرہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے، بدر ایک کنواں کا نام ہے، جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔“

(اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکین مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ نکلے تھے اور بدر آکر قیام فرمایا تھا۔ اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے)۔ ان قطعی نصوص کے بعد اگرچہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں لیکن لیطمئن قلبی کے طور پر واقعات ذیل پر لحاظ کرنا چاہیے۔

① آنحضرت ﷺ نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے اور جن میں بیس تیس آدمی سے لے کر سو سو، دو دو سو تک کی جمعیت تھی، ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا، ارباب سیر اس خاص امر کو بہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لئے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر

[1] ج ۱، ص: ۱۱۷۔ [2] منتخب كنز العمال، غزوه بدر، ج ٤، ص: ٩٧، برحاشيه مسند احمد بن حنبل۔
[3] ج ۳، ص: ۱۲۸۹۔

حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ ساتھ نہ ہوتے، حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی. یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی، جن میں ۷۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے۔

یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپ ﷺ نکلے یہ خبر آ چکی تھی کہ قریش مدینہ پر آ رہے ہیں، اسی بنا پر آپ ﷺ نے انصار کو مخاطب کیا کیونکہ معاہدۂ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آ چکا تھا۔

② مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لئے شام کو جایا کرتا تھا، مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے عموماً قریش کے زیر اثر تھے، بخلاف اس کے مدینہ سے شام تک کے حدود تک قریش کا اثر نہ تھا اس بنا پر اگر کاروان تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا، یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروان تجارت شام سے آ رہا ہے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہو چکی ہے اور آپ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں، مکہ کی طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف جا کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا اور قریش سے جنگ پیش آ جاتی ہے۔

③ واقعات کی ترتیب یہ ہے:

① قریش نے عبداللہ بن ابی کو خط لکھا کہ ''محمد (ﷺ) اور ان کے رفقا کو مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم مدینہ آ کر تم کو بھی برباد کر دیں گے۔'' (بحوالہ سنن ابی داؤد او پر گزر چکا)

② ابوجہل نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم نے ہمارے مجرموں کو پناہ دی ہے، اگر امیہ کی ضمانت نہ ہوتی تو میں تم کو قتل کر دیتا۔

③ کرز بن جابر نے جمادی الثانی ۲ ھ میں مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت ﷺ کے اونٹ لوٹ لئے۔

④ اس کے بعد ہی رجب ۲ ھ میں آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن جحش کو تجسس کے لئے بھیجا کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔

⑤ عبداللہ بن جحش نے (آنحضرت ﷺ کی مرضی کے خلاف) قریش کا ایک مختصر سا قافلہ لوٹ لیا اور ایک آدمی قتل اور دو اسیر کئے۔

قریش نے مکہ میں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اس کو پیش نظر رکھو پھر یہ خیال کرو کہ ان کا جوشِ انتقام کسی طرح کم نہیں ہوتا اور وہ عبداللہ بن ابی کو لکھتے ہیں کہ ہم مدینہ آ کر تم کو اور محمد (ﷺ) دونوں کو فنا کر دیں گے، کرز فہری مدینہ میں چھاپہ مارتا ہے، اسی اثنا میں قریش کا اشتعال اس سے اور بڑھ جاتا ہے کہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ان کا قافلہ لوٹ لیا اور ان کے دو معزز خاندان کے ممبر اسیر کر لئے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ قریش صبر کرتے ہیں اور کسی قسم کے انتقام کا ارادہ نہیں کرتے، جب آنحضرت ﷺ ان کے قافلہ کو جس

میں مکہ کی کل کائنات تھی لوٹنے کے لئے نکلتے ہیں، تب مجبوراً ان کو مدافعت کیلئے نکلنا پڑتا ہے، اس پر بھی بدر کے قریب پہنچ کر جب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا تو ان کے بڑے بڑے سردار اور خود عتبہ جو سالارِ لشکر تھا، رائے دیتا ہے کہ اب لڑنے کی ضرورت نہیں واپس چلنا چاہئے، کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوشِ عداوت اور رسول اللہ ﷺ کی شانِ نبوت کے موافق ہے؟

④ ارباب سیر عموماً لکھتے ہیں کہ "جب آنحضرت ﷺ نے مدینہ منورہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو کاروان تجارت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو لوگوں نے چنداں مستعدی ظاہر نہیں کی۔ کیونکہ لوگ سمجھے کہ کوئی مہم اور معرکہ و جہاد نہیں ہے بلکہ صرف تحصیل غنیمت ہے، اس لئے جن لوگوں کو مال کی حاجت تھی وہ گئے" لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انصار میں جس قدر اعیان قوم اور سرلشکر تھے، سب کے زر و مال کے محتاج اگر تھے تو مہاجرین تھے، لیکن جانے والوں میں انصار کی تعداد مہاجرین سے دگنی تگنی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے استمزاج کے جواب میں جن لوگوں نے جان نثارانہ فقرے کہے تھے، مہاجرین میں حضرت ابوبکر و عمر و مقداد رضی اللہ عنہم تھے اور انصار میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ [1] تھے۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور مدینہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے اس لئے قطعاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سعد رضی اللہ عنہ نے یہ جواب مدینہ ہی میں دیا تھا اور وہیں قریش کے حملہ کا حال معلوم ہو گیا تھا اور اس لئے یہ قطعی ہے کہ مدینہ ہی میں اس بات کی ضرورت پیش آئی تھی کہ انصار کا استمزاج لیا جائے۔

⑤ عام ارباب سیر، بلکہ احادیث کی کتابوں میں بھی منقول ہے کہ غزوۂ بدر میں جب آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو چلنے کی ترغیب دی تو بہت سے لوگ آمادہ نہ ہوئے اور کسمسائے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ نہیں ہے، صرف قافلہ کا مال لوٹنا ہے، اس لئے یہ اپنی مرضی پر موقوف ہے جس کا جی چاہے جائے، جس کا جی نہ چاہے نہ جائے، طبری میں ہے:

> قالوا لما سمع رسول الله بابى سفيان مقبلا من الشام ندب المسلمين اليهم و قال هذه عير قريش فيها اموالهم فاخرجوا اليها لعل الله ان ينفلكموها فانتدب الناس فخف بعضهم و ثقل بعضهم و ذالك انهم لم يظنوا ان رسول الله يلقى حربا. [2]

"لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے ابوسفیان کا شام سے روانہ ہونا سنا تو مسلمانوں کو بلایا اور فرمایا کہ یہ قریش کا قافلہ آ رہا ہے جس میں ان کا مال ہے چلو شاید اللہ تم کو اس میں سے مال غنیمت دلوا دے، لوگ آمادہ ہوئے لیکن بعضوں نے پہلو تہی کی، کیونکہ وہ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب غزوة بدر: ٤٦٢١ وصحيح بخاری، کتاب المغازی، باب قصة غزوة بدر: ٣٩٥٢۔ [2] طبری، ج ٣، ص: ١٢٩٣۔

سمجھے کہ آنحضرت ﷺ کو کوئی لڑائی تو پیش نہیں آئے گی۔''

لیکن یہ واقعات صریح آیات قرآنی کے خلاف ہیں، قرآن مجید میں بہ تصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے، وہ عدم ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جارہے ہیں:

﴿ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ ﴾ (٨/ الانفال:٥، ٦)

''اور مسلمانوں کا ایک فریق نکلنے سے ناراض تھا وہ تجھ سے حق کے متعلق جھگڑتا تھا بعد اس کے کہ حق ظاہر ہو گیا تھا، وہ گویا موت کی طرف ہنکارے جارہے ہیں۔''

⑥ تمام کتب احادیث اور سیر میں تصریح ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک میل چل کر (مقام بیر ابی عنبہ میں) آپ نے فوج کا جائزہ لیا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ اس بنا پر واپس بھیج دیے گئے کہ ان کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں، یا یہ کہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ اگر صرف قافلہ کا لوٹنا مقصود ہوتا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے تھے لیکن چونکہ واقع میں جہاد مقصود تھا جو ایک فریضۂ الٰہی ہے اور اس کے لئے بلوغ کی قید ہے اس لئے نابالغ لوگ واپس کر دیے گئے کہ ابھی اس کے اہل نہیں۔

⑦ حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب [1] میں روایت کی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو خیثمہ رضی اللہ عنہ نے جو ایک انصاری تھے، اپنے بیٹے سعد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے جانے دو اور تم یہاں مستورات کی خبر گیری کرو۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا ''حضور! اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ضرور میں آپ کو اپنے اوپر ترجیح دیتا، لیکن یہ شہادت کا درجہ ہے میں اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔'' چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور سعد رضی اللہ عنہ کے نام قرعہ نکلا، سعد رضی اللہ عنہ شریک جنگ ہو کر شہید ہوئے۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ قافلہ لوٹنا نہیں بلکہ جہاد پیش نظر تھا اور لوگوں کو دولتِ شہادت کے حاصل ہونے کی آرزو ہے۔

غزوۂ بدر کا اصلی سبب

عرب کا خاصۂ قومی تھا کہ جب کسی قبیلہ کا کوئی آدمی کسی طریقہ سے کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو ایک سخت ہنگامۂ کارزار قائم ہو جاتا تھا۔ دونوں طرف ٹڈی دل امنڈ آتا تھا اور خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں، یہ لڑائیاں مدتوں تک قائم رہتی تھیں، قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے، تاہم یہ سلسلہ بند نہیں ہوتا تھا۔ عرب لکھے پڑھے نہ تھے تاہم مقتول کا نام کاغذ پر درج ہو کر، خاندان میں وراثتاً چلا آتا تھا، بچوں کو یہ نام یاد کرایا جاتا تھا

[1] استیعاب تذکرۃ سعد بن خیثمۃ، ج ٢، ص:٥٦١ مطبوعۃ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن، ١٣١٩ھ؛ اصابہ، ج ٢، ص:٢٥ اور طبقات ذکر خیثمہ، ج ٦، ص:٢٠٠ میں یہ واقعہ بہ اختلاف الفاظ منقول ہے۔

کہ بڑے ہوکر اس خون کا انتقام لینا ہے، واحس اور بسوس کی قیامت خیز لڑائیاں جو چالیس چالیس برس قائم رہیں اور جن میں ہزاروں لاکھوں جانیں برباد ہوگئیں، اسی بنا پر ہوئیں۔ عربی زبان میں اس انتقام کو ثار کہتے ہیں اور یہ عرب کی قومی تاریخ کا سب سے اہم لفظ ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں عمرو بن حضرمی قتل کر دیا گیا تھا۔ حضرمی، عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا جو تمام قریش کا سردار تھا، بدر اور تمام غزوات کا سلسلہ اسی خون کا انتقام تھا، عروہ بن زبیر (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے) نے اس واقعہ کو بہ تصریح بیان کیا ہے:

وكان الذى هاج وقعة بدر وسائر الحروب التى كانت بين رسول الله ﷺ وبين مشركى قريش فيما قال عروة بن الزبير ماكان من قتل واقد بن [1] عبدالله التميمى عمرو بن الحضرمى. [2]

''جس چیز نے غزوۂ بدر اور دیگر وہ تمام لڑائیاں برپا کیں جو آنحضرت ﷺ اور مشرکین عرب کے درمیان واقع ہوئیں، وہ جیسا کہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے عمرو بن حضرمی کا قتل کیا جانا ہے جس کو واقد بن عبداللہ تمیمی نے قتل کر دیا تھا۔''

ایک عام غلطی جس نے واقعۂ بحث طلب میں غلطی پیدا کر دی ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لڑائی کفار سے ہوئی وہ بدر تھی۔ حالانکہ بدر سے پہلے لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں، عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر کے متعلق عبدالملک کو جو خط لکھا تھا، اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

ان اباسفيان بن حرب اقبل من الشام فى قريب من سبعين راكبامن قبائل قريش فذكروا لرسول الله ﷺ واصحابه وقد كانت الحرب بينهم فقتلت قتلى وقتل ابن الحضرمى فى اناس بنخلة واسرت اسارى من قريش. وكانت تلك الوقعة هاجت الحرب بين رسول الله ﷺ وبين قريش واول ما اصاب به بعضهم بعضًا من الحرب وذلك قبل مخرج ابى سفيان واصحابه الى الشام. [3]

''ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سوار کے ساتھ شام سے آ رہا تھا، جو کل کے کل قریشی تھے۔ آنحضرت ﷺ اور صحابہ سے اس کا تذکرہ ہوا اور دونوں فریق میں لڑائی شروع ہو چکی تھی اور ادھر کے چند لوگ جن میں ابن حضرمی بھی تھا، مارے جا چکے تھے اور کچھ قید بھی ہو چکے تھے اور

---

[1] عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ جن کی سرداری میں یہ قتل واقع ہوا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بھانجے اور آنحضرت ﷺ کے ماموں زاد بھائی تھے، قاتل یعنی واقد بن عبداللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے حلیف تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آغازِ خلافت تک زندہ رہے۔ دیکھو طبقات ابن سعد ذکر عبداللہ بن جحش، ج۳، قسم اول، ص:٦٤ و واقد بن عبداللہ، ج۳، قسم اول، ص: ٢٨٤۔

[2] تاریخ طبری، ج۳، ص:١٢٨٤۔ [3] طبری، ج۳، ص:١٢٨٥۔

اسی واقعہ نے آنحضرت ﷺ اور قریش میں جنگ برپا کر دی تھی اور یہی سب سے پہلا واقعہ تھا جس میں دونوں فریق نے ایک دوسرے کو صدمہ پہنچایا اور یہ لڑائی ابوسفیان کی روانگی شام سے پہلے وقوع میں آ چکی تھی۔"

اس میں تصریح ہے کہ ابوسفیان جب شام کو روانہ بھی نہیں ہوا تھا اسی وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ غزوۂ بدر ابوسفیان کی واپسی شام کے بعد واقع ہوا ہے۔ اصل واقعہ کی تحقیق کا سب سے بڑا اصلی ذریعہ یہ ہے کہ خود حریفان جنگ کی شہادت بہم پہنچائی جائے۔ اس قسم کی شہادتیں بہت کم ہاتھ آ سکتی ہیں لیکن خوش قسمتی سے یہاں اس قسم کی شہادت موجود ہے۔ حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے) غزوۂ بدر میں شریک تھے اور اس وقت تک کافر تھے، وہ عمر میں آنحضرت ﷺ سے پانچ برس بڑے تھے۔ گو زمانہ جاہلیت میں آنحضرت ﷺ سے نہایت محبت رکھتے تھے اور نبوت کے بعد بھی یہ محبت قائم رہی تاہم فتح مکہ تک ایمان نہیں لائے۔ وہ رؤسائے قریش میں سے تھے، حرم کا ایک بڑا منصب یعنی رفادہ انہی کے ہاتھ میں تھا، دارالندوہ کے مہتمم اور مالک بھی وہی تھے [1] اور مروان بن حکم کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے۔ ایک دفعہ وہ مروان سے ملنے گئے۔ مروان نے نہایت تعظیم و تکریم کی، صدر مجلس سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور کہا بدر کا واقعہ بیان کیجئے۔ انہوں نے واقعہ کے ابتدائی حالات بیان کر کے کہا کہ جب ہماری فوجیں میدان میں اتریں تو میں عتبہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے یہ کہا:

یا ابا الولید هل لك ان تذهب بشرف هذا اليوم مابقيت ، قال افعل ماذا؟ قلت انكم لاتطلبون من محمد الادم ابن الحضرمی وهو حليفك فتحمل ديته فترجع بالناس۔ [2]

"اے ابوالولید! کیا تم چاہتے ہو کہ تمام عمر کے لئے ساری نیک نامی تم ہی کو ہاتھ آئے؟ عتبہ نے کہا کیونکر؟ میں نے کہا، تم (یعنی قریش) محمد ﷺ سے ابن حضرمی کے خون کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے اور وہ تمہارا حلیف تھا، اس لئے تم اس کا خون بہا ادا کر دو کہ سب لوگ واپس چلے جائیں۔"

عتبہ نے یہ تجویز پسند کی، لیکن ابوجہل نے نہ مانا اور حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا، خون کا بدلا سامنے ہے، کھڑے ہو کر قوم سے دہائی دو، عامر عرب کے دستور کے موافق ننگا ہو گیا اور پکارا، [3]

واعمراہ! واعمراہ! "ہائے عمر (حضرمی) ہائے عمر!"

آغاز جنگ کے وقت سب سے پہلے جو شخص میدان جنگ میں نکلا، وہ یہی عامر حضرمی تھا۔

---

[1] اصابہ تذکرہ حکیم بن حزام، ج ۱، ص: ۳۴۹۔ [2] طبری، ج ۳، ص: ۱۳۱۴ وسیرت ابن هشام بمعناه ذکر غزوہ بدر، ج ۱، ص: ۳۸۰ (س) [3] پوری تفصیل طبری، ج ۳، ص ۱۳۱۴ تا ۱۳۱۶ میں ہے۔

حکیم بن حزام اور عامر حضرمی غزوۂ بدر تک کافر تھے۔ عتبہ وابوجہل جو سرداران قریش تھے کفر پر تادم مرگ قائم رہے۔ اگرچہ اس درجہ کے لوگ غزوۂ بدر کو حضرمی کے خون کا انتقام سمجھتے تھے اور سمجھتے رہے، تو ہم کو کچھ پروانہیں کرنی چاہیے کہ اوروں نے جو اس کے سینکڑوں برس بعد پیدا ہوئے اس کا سبب قافلۂ تجارت کا بچانا سمجھا۔ وشتان بینھما۔

ایک ضروری نکتہ

گو یہ امراب قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ غزوۂ بدر کا سبب کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا تاہم اس گرہ کا کھولنا ضرور ہے کہ ایسے صاف اور صریح واقعہ کے متعلق تمام اربابِ سیر نے متفقاً کیوں غلطی کی؟ اور صحیح بخاری وغیرہ میں یہ تصریحات کیوں پائی جاتی ہیں کہ بدر کی ابتدا قافلہ ہی پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوئی تھی۔

اصل یہ ہے کہ اصول جنگ کے موافق اکثر غزوات میں یہ ظاہر نہیں کیا جاتا تھا کہ کدھر جانا اور کس غرض سے جانا مقصود ہے؟ صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جو مشہور صحابی ہیں، ان کا قول نقل کیا ہے:

> ولم يكن رسول الله ﷺ يريد غزوة الا ورّى بغيرها۔
>
> ''اور آنحضرت ﷺ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی اور موقع کا توریہ فرماتے تھے۔'' [1]

''توریہ'' کے معنی شارحین بخاری [2] نے یہ لکھے ہیں کہ ''آپ ایسے موقع پر مبہم اور متحمل المعنیین الفاظ استعمال فرماتے تھے''۔ گو میرے نزدیک یہ کلیہ اس معنی میں صحیح نہیں، تاہم واقعات کے استقصا سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر واقعہ اس طرح مبہم رکھا جاتا تھا کہ لوگ مختلف قیاس پیدا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر میں حضرت سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ کو پہلے ہی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ قافلہ نہیں بلکہ فوج کا مقابلہ ہے، بخلاف اس کے صحیح بخاری میں انہی کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے کہ بدر میں صرف قافلہ سے تعرض کرنا مقصود تھا۔

دیباچہ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ راوی (جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم بھی داخل ہیں) بہت سے موقعوں پر جو واقعہ بیان کرتا ہے، وہ حقیقت میں واقعہ نہیں بلکہ اس کا استنباط ہوتا ہے، یعنی اس نے اس کو یوں ہی سمجھا، بدر میں بھی یہی صورت پیش آئی اور اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے مختلف قیاس کیے اور جو قیاس مذاقِ عام کے مناسب تھا وہی پھیل گیا۔

بدر کے نتائج

(بدر کے معرکہ نے مذہبی اور ملکی حالت پر گونا گوں اثرات پیدا کیے اور حقیقت میں یہ اسلام کی ترقی کا

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب بن مالك: ٤٤١٨۔ [2] فتح الباری، باب غزوة تبوك، ج٨، ص:٨٧۔

قدم اولین تھا۔قریش کے تمام بڑے بڑے رؤسا جن میں سے ایک ایک اسلام کی ترقی کی راہ میں سدِ آہن تھا فنا ہو گئے۔عتبہ اور ابوجہل کی موت نے قریش کی ریاست عامہ کا تاج ابوسفیان کے سر پر رکھا،جس سے دولتِ اموی کا آغاز ہوا،لیکن قریش کے اصلی زور وطاقت کا معیار گھٹ گیا۔

مدینہ میں اب تک عبداللہ بن ابی بن سلول علانیہ کافر تھا،لیکن اب بظاہر وہ اسلام کے دائرہ میں آ گیا۔ گو تمام عمر منافق رہا۔اور اسی حالت میں جان دی،قبائل عرب جو سلسلہ واقعات کا رخ دیکھتے تھے اگر چہ رام نہیں ہوئے لیکن سہم گئے۔

ان موافق حالات کے ساتھ مخالف اسباب میں بھی انقلاب شروع ہو گیا،یہود سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں یکسو رہیں گے لیکن اس فتح نمایاں نے ان میں حسد کی آگ بھڑکا دی اور وہ اس کو ضبط نہ کر سکے۔چنانچہ اس کی تفصیل یہودیوں کے واقعات میں بالتفصیل آتی ہے۔

قریش کو پہلے صرف حضرمی کا رونا تھا۔بدر کے بعد ہر گھر ماتم کدہ تھا۔اور مقتولین بدر کے انتقام کے لئے مکہ کا بچہ بچہ مضطر تھا۔چنانچہ سویق کا واقعہ اور اُحد کا معرکہ اسی جوش کا مظہر تھا)۔

غزوۂ سویق،ذی الحجہ ۲ھ

ابوسفیان اب قریش کا رئیس تھا اور اس منصب کا سب سے بڑا فرض غزوۂ بدر کا انتقام تھا۔اس نے بدر سے مشرکین کی واپسی پر منت مانی تھی کہ جب تک مقتولان بدر کا انتقام نہ لے گا نہ غسل جنابت کرے گا نہ سر میں تیل ڈالے گا۔چنانچہ دو سو شتر سواروں کے ساتھ مدینہ پر بڑھا،یہود کی نسبت معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مدد دیں گے۔اس لئے پہلے حیی بن اخطب کے پاس گیا،لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا،مایوس ہو کر سلام بن مشکم کے پاس آیا،وہ یہود بنونضیر کا سردار تھا اور تجارتی خزانہ اسی کے زیر اہتمام رہتا تھا۔اس نے بڑے جوش سے استقبال کیا،خوشگوار کھانے کھلائے،شراب پلوائی،مدینہ کے مخفی راز بتائے،صبح کو ابوسفیان عریض پر حملہ آور ہوا،جو مدینہ سے ۳ میل کے فاصلہ پر ہے،ایک انصاری کو جن کا نام سعد بن عمرو رضی اللہ عنہ تھا قتل کیا۔ چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیئے،ان باتوں سے اس کے نزدیک قسم پوری ہوگئی۔آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے تعاقب کیا،ابوسفیان کے پاس رسد کا سامان صرف ستو تھا،گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے،عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں۔اس لئے یہ واقعہ غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہے۔(طبری،ج ۳،ص: ۱۳۶۷)

حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی ذی الحجہ ۲ھ

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو آنحضرت ﷺ کی صاحبزادیوں میں سب سے کمسن تھیں،اب ان کی عمر ۱۸ برس کی ہو چکی تھی اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے۔ابن سعد نے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ جو اللہ کا حکم ہوگا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جرأت کی، ان کو بھی آپ نے کچھ جواب نہیں دیا، بلکہ وہی الفاظ فرمائے [1] لیکن بظاہر یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اصابہ میں ابن سعد رضی اللہ عنہ کی اکثر روایتیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حال میں روایت کی ہیں لیکن اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب درخواست کی تو آپ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مرضی دریافت کی وہ چپ رہیں، یہ ایک طرح کا اظہار رضا تھا آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ "تمہارے پاس مہر میں دینے کے لئے کیا ہے؟" بولے کچھ نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا "اور وہ حطیمہ زرہ کیا ہوئی؟" (جنگ بدر میں ہاتھ آئی تھی) عرض کی وہ تو موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "بس وہ کافی ہے۔"

ناظرین کو خیال ہوگا کہ بڑی قیمتی چیز ہوگی لیکن اگر وہ اس کی مقدار جاننا چاہتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ صرف سوا سو روپے [2] زرہ کے سوا اور جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سرمایہ تھا وہ ایک بھیڑ کی کھال اور ایک بوسیدہ یمنی چادر تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سب سرمایہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی نذر کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اب تک آنحضرت ﷺ ہی کے پاس رہتے تھے، شادی کے بعد ضرورت ہوئی کہ الگ گھر لیں۔ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ بن نعمان انصاری کے متعدد مکانات تھے، جن میں سے وہ کئی آنحضرت ﷺ کو نذر کر چکے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ انہی سے کوئی اور مکان دلوا دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "کہاں تک؟ اب ان سے کہتے شرم آتی ہے۔" حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نے سنا تو دوڑے آئے کہ حضور میں اور میرے پاس جو کچھ ہے، سب آپ کا ہے۔ اللہ کی قسم! میرا جو مکان آپ لے لیتے ہیں مجھ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جائے۔ غرض انہوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس میں اٹھ گئیں۔ [3]

شہنشاہ کونین ﷺ نے سیدۂ عالم کو جو جہیز دیا، وہ بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا جس کے اندر، روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے، ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے تھے۔ [4]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب نئے گھر میں جالیں تو آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ دروازہ پر کھڑے ہو کر اذن مانگا، پھر اندر آئے۔ ایک برتن میں پانی منگوایا، دونوں ہاتھ اس میں ڈالے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سینہ اور بازوؤں پر پانی چھڑکا، پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا، وہ شرم سے لڑکھڑاتی آئیں، ان پر بھی پانی چھڑکا اور فرمایا: "میں نے اپنے خاندان میں سب سے افضل تر شخص سے تمہارا نکاح کیا ہے۔" [5]

---

[1] طبقات ابن سعد، ج۸، ص:۱۱۔ [2] غلطی سے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں سوا روپے چھپ گیا ہے اس کی تصحیح کر لی جائے۔ (س) [3] اصابہ، ج۸، قسم اول، ص:۱۵۸۔ [4] ایضاً، ص:۱۵۹۔ [5] یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد ذکر فاطمۃ، ج۸، ص:۱۵ اور اصابہ ذکر فاطمۃ، ج۸، قسم اول، ص:۱۵۷ سے ماخوذ ہے۔

واقعاتِ متفرقہ ۲ھ

(مؤرخین کے بیان کے مطابق اسی سال رمضانِ مبارک کے روزے فرض ہوئے، ❶ صدقہ عید الفطر کا حکم بھی اسی سال سے جاری ہوا۔ پہلے آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں اس صدقہ کے فضائل بیان فرمائے، پھر صدقہ کا حکم دیا۔ ❷

عید الفطر کی نماز باجماعت عیدگاہ میں بھی اسی سال ادا فرمائی، اس سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی۔ ❸

ارباب سیر کی ترتیب کے مطابق غزوۂ بنی قینقاع کا ذکر بھی اسی سال کے واقعات میں ہونا چاہیے تھا، لیکن اتصال و تسلسل واقعہ کی بنا پر وہ آیندہ مذکور ہوگا۔

❶ تاریخ طبری، ج۳، واقعہ:۲ھ، ص:۱۲۸۱۔ ❷ ایضًا۔ ❸ ایضًا۔

۳ھ

غزوۂ احد [1]

﴿ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ ﴾ [2]

(۳/ آل عمران:۱۳۹)

عرب میں صرف ایک شخص کا قتل لڑائی کا ایک سلسلہ چھیڑ دیتا تھا جو سینکڑوں برس تک ختم نہیں ہوسکتا تھا۔ طرفین میں سے جس کو شکست ہوتی تھی وہ انتقام کو ایسا فرض مؤبد جانتا تھا جس کے ادا کئے بغیر اس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ بدر میں قریش کے ستر آدمی مارے گئے تھے جن میں اکثر وہ تھے جو قریش کے تاج و افسر تھے، اس بنا پر تمام مکہ جوش انتقام سے لبریز تھا۔

قریش کا کاروانِ تجارت جو جنگ بدر کے زمانے میں نفعِ کثیر کے ساتھ شام سے واپس آ رہا تھا، اس کا رأس المال حصہ داروں کو تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن زرِ منافع امانت کے طور پر محفوظ تھا۔

قریش کو کشتگان بدر کے ماتم سے فرصت ملی تو اس فرض کے ادا کا خیال آیا۔ چند سردارانِ قریش جن میں ابو جہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، ان لوگوں کو جن کے عزیز و اقارب جنگ بدر میں قتل ہو چکے تھے، ساتھ لے کر ابوسفیان کے پاس گئے اور کہا کہ محمد (ﷺ) نے ہماری قوم کا خاتمہ کر دیا، اب انتقام کا وقت ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مال تجارت کا جو نفع اب تک جمع ہے، وہ اس کام میں صرف کیا جائے۔ یہ ایک ایسی درخواست تھی جو پیش ہونے سے پہلے قبول کر لی گئی تھی، لیکن قریش کو اب مسلمانوں کی قوت و زور کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جنگ بدر میں جس سامان سے وہ گئے تھے اس سے اب کچھ زیادہ درکار ہے۔ عرب میں جوش پھیلانے اور دلوں کے گرمانے کا سب سے بڑا آلہ شعر تھا۔ قریش میں دو شاعر، شاعری میں مشہور تھے۔ عمرو جمحی اور مسافع۔ عمرو جمحی غزوۂ بدر میں گرفتار ہو گیا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اقتضائے رحم سے اس کو رہا کر دیا تھا۔ قریش کی درخواست پر وہ اور مسافع مکہ سے نکلے اور تمام قبائل قریش میں اپنی آتش بیانی سے آگ لگا آئے۔

لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوشِ جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونانِ حرم تھیں، جس لڑائی میں خاتونیں ساتھ ہوتی تھیں عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوگی تو عورتیں بے حرمت ہوں گی۔ بہت سی عورتیں ایسی تھیں جن کی اولاد جنگ بدر میں قتل ہو چکی تھی اس لئے وہ خود جوش انتقام سے لبریز تھیں اور انہوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گی۔ غرض جب فوجیں تیار ہوئیں تو بڑے بڑے معزز گھرانوں کی عورتیں بھی فوج میں شامل ہوئیں۔ ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں: [3]

---

[1] مدینہ منورہ سے شمالی جانب قریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۂ اُحد (رقم الباب:۱۷) سے پتا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت غزوۂ اُحد میں نازل ہوئی۔ [3] طبری، ج ۳، ص:۱۳۸۶؛ زرقانی، ج ۲، ص: ۳۰ نے ان چھ خواتین کے سوا سلافہ بنت سعد، عمیرہ بنت علقمہ دو اور خاتونوں کا ذکر کیا ہے ان میں خناس و عمیرہ کے سوا باقی خواتین بعد کو مسلمان ہو گئیں۔ خناس اور عمیرہ کے اسلام کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ (زرقانی علی المواهب) (س)

① ہند — عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ماں۔
② اُم حکیم — عکرمہ (فرزند ابوجہل) کی بیوی۔
③ فاطمہ (بنت ولید) — حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی بہن۔
④ برزہ — مسعود ثقفی جو طائف کا رئیس تھا اس کی بیٹی۔
⑤ ریطہ — عمرو بن العاص کی زوجہ۔
⑥ خناس — حضرت مصعب بن عمیر کی ماں رضی اللہ عنہ

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ہند کے باپ عتبہ کو بدر میں قتل کیا تھا جبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ اس بنا پر ہند نے وحشی کو جو جبیر کا غلام اور حربہ اندازی میں کمال رکھتا تھا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل پر آمادہ کیا اور یہ اقرار ہوا کہ اس کارگزاری کے صلہ میں وہ آزاد کر دیا جائے گا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے چچا گو اسلام لا چکے تھے۔ لیکن اب تک مکہ ہی میں مقیم تھے، انہوں نے تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجے اور قاصد کو تاکید کی کہ تین رات دن میں مدینہ پہنچ جائے۔

آنحضرت ﷺ کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے پانچویں شوال ۳ھ کو دو خبر رساں جن کے نام انس اور مونس تھے، خبر لانے کے لئے بھیجے۔ انہوں نے آ کر اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے قریب آ گیا اور مدینہ کی چراگاہ (عریض) کو ان کے گھوڑوں نے صاف کر دیا۔ آپ نے حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ فوج کی تعداد کی خبر لائیں۔ انہوں نے آ کر صحیح تخمینہ سے اطلاع دی، چونکہ شہر پر حملہ کا اندیشہ تھا، ہر طرف پہرے بٹھا دیے گئے۔ حضرت سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما ہتھیار لگا کر تمام رات مسجد نبوی کے دروازہ پر پہرہ دیتے رہے۔

صبح کو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گزین ہو کر مقابلہ کیا جائے، عبداللہ بن ابی سلول جو اب تک کبھی شریک مشورہ [1] نہیں کیا گیا تھا، اس نے بھی یہی رائے دی۔ لیکن ان نوخیز صحابہ رضی اللہ عنہم [2] نے جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو خلاف مرضی نکلنے پر مجبور کیا۔ سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں، ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔

قریش بدھ کے دن مدینہ کے قریب پہنچے اور کوہ احد پر پڑاؤ ڈالا۔ آنحضرت ﷺ جمعہ کے دن نمازِ جمعہ پڑھ کر ایک ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ شہر سے نکلے، عبداللہ بن ابی، تین سو کی جمعیت لے کر آیا تھا، لیکن یہ

[1] طبری، ج ۳، ص: ۱۳۸۹ مطبوعہ یورپ (س)
[2] زرقانی، ج ۲، ص: ۲۵ (س)

کہہ کر واپس چلا گیا کہ "محمد (ﷺ) نے میری رائے نہ مانی۔" آنحضرت ﷺ کے ساتھ اب صرف سات سو صحابہ رضی اللہ عنہم رہ گئے، ان میں ایک سو زرہ پوش تھے، مدینہ سے نکل کر فوج کا جائزہ لیا گیا اور جو لوگ کمسن تھے، واپس کر دیئے گئے، ان میں حضرت زید بن ثابت، حضرت براء بن عازب، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عرابہ اوسی رضی اللہ عنہم بھی تھے، لیکن جاں نثاری کا یہ ذوق تھا کہ نوجوانوں میں سے جب رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو واپس جاؤ۔ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے، چنانچہ ان کی یہ ترکیب چل گئی اور وہ لے لئے گئے۔ ❶ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ ایک نوجوان، جو ان کے ہم سن تھے، انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافع کو لڑائی میں پچھاڑ لیتا ہوں اس لئے اگر ان کو اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہیے۔ دونوں کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرہ رضی اللہ عنہ نے رافع رضی اللہ عنہ کو زمین پر دے مارا، اس بنا پر ان کو اجازت مل گئی۔

آنحضرت ﷺ نے احد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو علم عنایت کیا، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ رسالے کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اس حصۂ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ ❷ پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں، اس لئے پچاس تیراندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے، تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں۔ ❸ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ ان تیراندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی۔ میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا۔ تیراندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، دو سو گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے خاتونان قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں، جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے، ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں، اشعار یہ تھے:

نحن بنات طارق	"ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں۔
نمشی علی النمارق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں۔
ان تقبلوا نعانق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی۔

❶ طبری، جلد ۳، ص: ۱۳۹۱ (یہ طبری کی روایت ہے لیکن بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافع رضی اللہ عنہ کو اجازت مل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس نوجوانی ہی میں تیراندازی میں کمال رکھتے تھے۔ حضور ﷺ کو جب ان کا حال معلوم ہوا تو ان کو شرکت کی اجازت دے دی۔ ابن ھشام ذکر غزوہ اُحد، ج ۲، ص: ٦٨ و زرقانی ج ۲، ص: ۲۹ والبدایۃ والنھایۃ ابن کثیر، ج ٤، ص: ١٥) (س) ❷ طبری، ج ۳، ص: ١٣٩٤۔ ❸ ابن ھشام، ج ۲، ص: ٦٨۔

او تدبروا نفارق اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گی۔'' ❶

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبول عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا، اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا۔ چونکہ اس کو خیال تھا کہ انصار جب اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیں گے، میدان میں آ کر پکارا ''مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابو عامر ہوں'' انصار نے کہا ''ہاں او بدکار! ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، اللہ تیری آرزو برنہ لائے۔'' ❷

قریش کا علمبردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا ''کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے؟ کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے، ❸ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے صف سے نکل کر کہا: ''میں ہوں'' ❹ یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی، طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں، علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا:

انَّ علی اھل اللواء حقا ان تخضب الصعدۃ او تندقا

''علم بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون میں رنگ دے یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے۔''

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی، ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا کہ ''میں ساقی حجاج کا بیٹا ہوں۔'' ❺

اب عام جنگ شروع ہوگئی، حضرت حمزہ، حضرت علی، حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہم فوجوں کے دل میں گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ حضرت ابو دجانہ عرب کے مشہور پہلوان تھے، آنحضرت ﷺ نے دست مبارک میں تلوار لے کر فرمایا: ''کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟'' اس سعادت کے لئے دفعتہً بہت سے ہاتھ بڑھے، لیکن یہ فخر حضرت ابو دجانہ کے نصیب میں تھا، اس غیر متوقع عزت نے ان کو بادشاہت سے مست کر دیا، سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''یہ چال اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ لیکن اس وقت پسند ہے۔'' ❻ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ فوجوں کو چیرتے لاشوں پر لاشے گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہند سامنے آ گئی، اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھا لی کہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس طرف بڑھتے تھے صفیں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں۔ اسی حالت میں سباع غبشانی سامنے آ گیا، پکارے کہ ''او ختانۃ النساء کے بچے، کہاں جاتا ہے'' ❼ یہ

---

❶ ایضاً، ص:٦٩۔ ❷ طبری، ج٣، ص:١٣٩٩؛ وابن ھشام، ج٢، ص:٦٩۔
❸ یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے ہیں۔ ❹ ابن ھشام، ج٢، ص:٧٣۔ ❺ ابن ھشام، ج٢، ص:٧٤۔
❻ ابن ھشام، ج٢، ص:٦٩۔ ❼ ابن ھشام، ج٢، ص:٧٠۔

کہہ کر تلوار ماری وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی تاک میں تھا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے، پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ [1] حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس پر حملہ کرنا چاہا، لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کر گئی۔

کفار کے علمبردار لڑ لڑ کر قتل ہو جاتے تھے، تاہم علم گرنے نہیں پاتا تھا، ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا جانباز بڑھ کر علم کو ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ ایک شخص نے جس کا نام صواب تھا جب علم ہاتھ میں لیا تو کسی نے بڑھ کر اس زور سے تلوار ماری کہ دونوں ہاتھ ساتھ کٹ کر گر پڑے، لیکن وہ قومی علم کو اپنی آنکھوں سے خاک پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ علم کے گرنے کے ساتھ سینہ کے بل زمین پر گرا اور علم کو سینہ سے دبا لیا۔ اسی حالت میں یہ کہتا ہوا مارا گیا کہ ''میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔'' [2] علم دیر تک خاک پر پڑا رہا آخر ایک بہادر خاتون (عمرہ بنت علقمہ) دلیرانہ بڑھی اور علم کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا۔ یہ دیکھ کر ہر طرف سے قریش سمٹ آئے اور اکھڑے ہوئے پاؤں پھر جم گئے۔

ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا، لیکن اس کے صاحبزادے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اسلام لا چکے تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی۔ لیکن رحمت عالم نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے کفار کے سپہ سالار (ابوسفیان) پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ ان کی تلوار ابوسفیان کا فیصلہ کر دے، دفعۃً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر ان کے وار کو روکا اور ان کو شہید کر دیا۔ تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف تھا۔ علمبرداروں کے قتل اور حضرت علی اور حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہما کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں، بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر مقرر کئے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بہت روکا لیکن وہ رک [3] نہ سکے۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا، عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ چند جانبازوں کے ساتھ جم کر لڑے لیکن سب کے سب شہید ہوئے۔ اب راستہ صاف تھا۔ خالد نے سواروں کے دستہ کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں، بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جو آنحضرت ﷺ سے صورت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل حمزۃ رضی اللہ عنہ: ٤٠٧٢۔ [2] ابن ہشام، ج٢، ص: ٧٥، ٧٦ وطبری، ج ٣، ص: ١٤٠١۔(س) [3] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ احد: ٤٠٤٣۔

میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آنحضرت ﷺ نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی۔ بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے، بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں لیکن کون سنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہو گئے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایثار کے لہجہ میں کہا: "مسلمانو! اللہ تم کو بخش دے۔" [1] رسول اللہ ﷺ نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جان نثار پہلو میں ہیں جن میں جناب علی مرتضی، حضرت ابوبکر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت زبیر بن العوام، حضرت ابو دجانہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کا نام بہ تخصیص معلوم ہے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف حضرت طلحہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہما رہ گئے تھے۔ اس ہلچل اور اضطراب میں اکثروں نے تو بالکل ہمت ہار دی لیکن جانبازوں کا بھی زور نہیں چلتا تھا، جو جہاں تھا وہیں گھر کر رہ گیا تھا آنحضرت ﷺ کی کسی کو خبر نہ تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں الٹتے جاتے تھے۔ لیکن کعبۂ مقصود (رسول اللہ ﷺ) کا پتہ نہ تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت ابن نضر لڑتے بھڑتے موقع سے آگے نکل گئے، دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مایوس ہو کر ہتھیار پھینک دیا ہے [2] پوچھا یہاں کیا کرتے ہو؟ بولے: "اب لڑ کر کیا کریں! رسول اللہ ﷺ نے تو شہادت پائی۔" حضرت ابن نضر نے کہا: "ان کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔" یہ کہہ کر فوج میں گھس گئے اور لڑ کر شہادت پائی۔ لڑائی کے بعد جب ان کی لاش دیکھی گئی تو اسی (۸۰) سے زیادہ تیر، تلوار اور نیزے کے زخم تھے، کوئی شخص پہچان تک نہ سکا، ان کی بہن نے انگوٹھی دیکھ کر پہچانا۔ [3]

جان نثاران خاص برابر لڑتے جاتے تھے لیکن نگاہیں سرور عالم ﷺ کو ڈھونڈھتی تھیں۔ سب سے پہلے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی نظر پڑی، چہرۂ مبارک پر مغفر تھا، لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے پہچان کر پکارا: "مسلمانو! رسول اللہ ﷺ یہ ہیں۔" یہ سن کر ہر طرف سے جان نثار ٹوٹ پڑے۔ کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رخ پر زور دیا، دل کا دل ہجوم کر کے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "کون مجھ پر جان دیتا ہے؟" حضرت زیاد بن سکن رضی اللہ عنہ پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں۔ [4] حضرت زیاد رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ، لوگ اٹھا کر لائے، کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب اذ همت طائفتان منكم ان تفشلا... : ٤٠٦٥۔ [2] یہ عام ارباب سیر کی روایت ہے۔ صحیح بخاری میں یہ واقعہ مذکور ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام نہیں۔ [3] صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوة احد: ٤٠٤٨ وصحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ثبوت الجنة للشهيد: ٤٩١٨(س)۔ [4] صحیح مسلم، کتاب المغازی، غزوة احد: ٤٦٤١ میں ہے کہ سات انصاری تھے اور ساتوں نے باری باری اپنی جانیں فدا کیں۔

رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دی۔

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیازمندے کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

(ایک بہادر مسلمان اس عالم میں بھی بے پروائی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا اس نے بڑھ کر پوچھا کہ "یارسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا" آپ ﷺ نے فرمایا: "جنت میں۔" اس بشارت سے بے خود ہو کر وہ اس طرح کفار پر ٹوٹ پڑا کہ مارا گیا)۔ ❶

عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت ﷺ کے قریب آ گیا اور چہرۂ مبارک پر تلوار ماری۔ اس کے صدمہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔ چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے، یہ دیکھ کر جان نثاروں نے آپ کو دائرہ میں لے لیا، حضرت ابودجانہ جھک کر سپر بن گئے، اب جو تیر آتے تھے ان کی پیٹھ پر آتے تھے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا، ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا، بے درد رحمت عالم پر تیر برسا رہے تھے اور آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

((رب اغفر لقومي فانهم لايعلمون)) ❷

"اے اللہ! میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں۔"

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے علاتی باپ تھے، مشہور تیر انداز تھے۔ انہوں نے اس قدر تیر برسائے کہ دو تین کمانیں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ ٹوٹ کر رہ گئیں۔ انہوں نے سپر سے آنحضرت ﷺ کے چہرہ پر اوٹ کر لیا تھا کہ آپ پر کوئی وار نہ آنے پائے، آپ کبھی گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو عرض کرتے کہ آپ گردن نہ اٹھائیں ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے۔ یہ میرا سینہ سامنے ہے۔ ❸ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی مشہور تیر انداز تھے اور اس وقت آپ کے رکاب میں حاضر تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنا ترکش اُن کے آگے ڈال دیا اور فرمایا: "تم پر میرے ماں باپ قربان! تیر مارتے جاؤ۔" ❹

اسی حالت میں آپ کی زبان سے عبرت کے لہجہ میں یہ لفظ نکلا: "وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے۔" بارگاہ خداوندی میں یہ الفاظ پسند نہ آئے اور یہ آیت اتری۔

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۲۸)

"تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں۔"

چنانچہ صحیح بخاری غزوۂ احد میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ ❺

رسول اللہ ﷺ ثابت قدموں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کہ دشمن ادھر نہیں آ سکتے تھے۔ ابوسفیان نے دیکھ لیا، فوج لے کر پہاڑی پر چڑھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے پتھر برسائے

❶ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة احد:٤٠٤٦ـ(س)۔ ❷ صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب غزوة احد:٤٦٤٦۔ ❸ صحيح بخاری، کتاب المغازی، باب اذ همت طائفتان:٤٠٦٤۔
❹ ایضاً:٤٠٥٦ تا ٤٠٦٠۔ ❺ ایضاً:٤٠٦٩۔

جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ❶

آپ کی وفات کی خبر مدینہ میں پہنچی تو اخلاص شعار نہایت بے تابی کے ساتھ دوڑے۔ جناب فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے آ کر دیکھا تو ابھی تک چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سپر میں بھر کر پانی لائے۔ جناب سیدہ دھوتی تھیں لیکن خون نہیں تھمتا تھا، بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور زخم پر رکھ دیا خون فوراً تھم گیا۔ ❷

ابوسفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ "یہاں محمد (ﷺ) ہیں؟" آپ نے حکم دیا کوئی جواب نہ دے، ابوسفیان نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نام لے کر پکارا اور جب کچھ آواز نہ آئی تو پکار کر بولا سب مارے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بول اٹھے "او اللہ کے دشمن! ہم سب زندہ ہیں۔"

ابوسفیان نے کہا:

اعل ھبل ❸ "اے ہبل تو اونچا رہ"۔ صحابہ نے آنحضرت ﷺ کے حکم سے کہا

اللہ اعلی واجل "اللہ اونچا اور بڑا ہے۔"

ابوسفیان نے کہا: لَنَا العُزّی ولا عزّی لکم "ہمارے پاس عزیٰ ❹ ہے، تمہارے پاس نہیں۔"

صحابہ نے کہا: اَللّٰهُ مولانا ولا مولی لَکُم "اللہ ہمارا آقا ہے اور تمہارا کوئی آقا نہیں۔"

ابوسفیان نے کہا: "آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے۔ فوج کے لوگوں نے مردوں کے ناک کان کاٹ لئے ہیں، میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا، لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو کچھ رنج بھی نہیں۔ ❺

آنحضرت ﷺ نے مستورات اور بچوں کو حضرت یمان اور حضرت ثابت رضی اللہ عنہما کی حفاظت میں مدینہ کے پاس کے قلعوں میں بھیج دیا تھا، ان لوگوں کو شکست کی خبر معلوم ہوئی تو سب کو چھوڑ کر اُحد کی طرف بڑھے۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ مشرکوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت یمان رضی اللہ عنہ کو مسلمان ہجوم عام میں پہچان نہ سکے، ان پر تلواریں برس پڑیں۔ ان کے صاحبزادے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ہر چند "ہاں ہاں" کہا اور بتایا کہ "میرے باپ ہیں۔" لیکن ہنگامہ میں کون سنتا تھا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ یہ کہہ کر رہ گئے کہ "مسلمانو! اللہ تمہارے اس گناہ کو بخش دے۔" ❻ آنحضرت ﷺ نے حضرت یمان رضی اللہ عنہ کا خون بہا مسلمانوں کی طرف سے ادا کرنا چاہا۔ لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے معاف کر دیا، ابن ہشام میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے۔ صحیح بخاری میں بھی ہے، لیکن مختصر ہے۔

خاتونان قریش نے انتقام بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا، ان کے ناک، کان کاٹ لئے۔ ہند (امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ

---

❶ طبری، ج ۳، ص: ۱۴۱۰ و ۱۴۱۱۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب ما اصاب النبی ﷺ من الجراح ....: ۴۰۷۵۔ ❸ بت کا نام۔ ❹ بت کا نام ہے لفظی معنی عزت کے ہیں۔
❺ یہ تمام تفصیل بخاری غزوۂ احد کے ذکر میں ہے ۴۰۴۳ و مابعد۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب اذ همت طائفتان ....: ۴۰۶۵؛ مسلم، ابن هشام، ج ۲، ص: ۸۱۔

کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی۔ لیکن گلے سے اتر نہ سکا، اس لئے اگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہند کا لقب جو جگر خوار لکھا جاتا ہے اسی بنا پر لکھا جاتا ہے، ہند فتح مکہ میں ایمان لائی لیکن جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

اس غزوہ میں اکثر خاتونانِ اسلام نے بھی شرکت کی۔ حضرت عائشہ اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہما جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ماں تھیں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت عائشہ اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ پائنچے چڑھائے ہوئے مشک بھر بھر کر لاتیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ مشک خالی ہو جاتی تھی تو پھر جا کر بھر لاتی تھیں۔ [1] ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ام سلیط رضی اللہ عنہا نے بھی جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ماں تھیں یہی خدمت انجام دی۔ [2]

عین اس وقت جبکہ کافروں نے عام حملہ کر دیا تھا اور آپ کے ساتھ صرف چند جان نثار رہ گئے تھے۔ ام عمارہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچیں اور اپنا سینہ سپر کر دیا، کفار جب آپ پر بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔ ابن قمیہ جب دراتا ہوا آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچ گیا تو حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا نے بڑھ کر روکا چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا انہوں نے بھی تلوار ماری، لیکن وہ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھا اس لئے کارگر نہ ہوئی۔ [3]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن) شکست کی خبر سن کر مدینہ سے نکلیں آنحضرت ﷺ نے ان کے صاحبزادے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بلا کر ارشاد کیا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش نہ دیکھنے پائیں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کا پیغام سنایا، بولیں کہ میں اپنے بھائی کا ماجرا سن چکی ہوں لیکن اللہ کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اجازت دی، لاش پر گئیں، خون کا جوش تھا اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن انا للہ و انا الیہ راجعون کہہ کر چپ ہو رہیں اور مغفرت کی دعا مانگی۔ [4]

انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں مارے گئے۔ باری باری تین سخت حادثوں کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی لیکن وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا بخیر ہیں، اس نے پاس آ کر چہرۂ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھی۔ [5]

كل مصيبة بعدك جلل ''تیرے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔''

میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا　　اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

(مسلمانوں کی طرف سے ستر آدمی مارے گئے۔ جن میں زیادہ تر انصار تھے لیکن مسلمانوں کے افلاس کا یہ حال تھا کہ اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ شہدا کی پردہ پوشی ہو سکتی۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے کہ ان کا

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب اذ همت طائفتان: ٤٠٦٤۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، ذکرام سلیط: ٤٠٧١۔ [3] ابن ہشام، ج ۲، ص: ۸٤، ۷۸ مطبع محمد علی مصر۔
[4] طبری، ج ۳، ص: ١٤٢١۔ [5] طبری، ج ۳، ص: ١٤٢٥۔

پاؤں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا اور سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے۔ آخر پاؤں اذخر کی گھاس سے چھپا دیے گئے۔ یہ وہ حیرت انگیز منظر تھا کہ بعد کو بھی یہ واقعہ مسلمانوں کو یاد آ جاتا تو آنکھیں تر ہو جاتیں۔ شہدا بے غسل اسی طرح خون میں لتھڑے ہوئے دو دو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کیے گئے۔ جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا اس کو مقدم کیا جاتا۔ ان شہدا پر نماز جنازہ بھی اس وقت نہیں پڑھی گئی۔ ❶ آٹھ برس کے بعد وفات سے ایک دو برس پہلے جب آپ ادھر سے گزرے تو بے اختیار آپ پر رقت طاری ہوئی اور اس طرح آپ ﷺ نے پر درد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہو اور اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا کہ ''مسلمانو! تم سے یہ خوف نہیں کہ پھر مشرک بن جاؤ گے، لیکن یہ ڈر ہے کہ دنیا میں نہ پھنس جاؤ۔'') ❷

دونوں فوجیں جب میدان سے الگ ہوئیں تو مسلمان زخم سے چور تھے تاہم یہ خیال کر کے کہ ابوسفیان مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کی طرف روئے خطاب کر کے فرمایا کہ ''کون ان کا تعاقب کرے گا'' فوراً ستر آدمیوں کی ایک جماعت اس مہم کے لئے تیار ہو گئی جن میں حضرت ابوبکر و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ ❸ ابوسفیان، اُحد سے روانہ ہو کر جب مقامِ روحاء پہنچا۔ یہاں خیال آیا کہ کام ناتمام رہ گیا۔ آنحضرت ﷺ کو پہلے ہی سے گمان تھا۔ دوسرے ہی دن آپ ﷺ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی واپس نہ جائے۔ چنانچہ حمراء الاسد تک جو مدینہ سے ۸ میل ہے تشریف لے گئے، قبیلہ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا لیکن درپردہ اسلام کا طرفدار تھا اس کا رئیس معبد خزاعی شکست کی خبر سن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واپس جا کر ابوسفیان سے ملا۔ ابوسفیان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا معبد نے کہا: ''میں دیکھتا آتا ہوں محمد ﷺ اس سروسامان سے آ رہے ہیں کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہے''۔ غرض ابوسفیان واپس گیا ❹

یہی واقعہ ہے جس کو مؤرخین نے تکثیر غزوات کے شوق میں ایک نیا غزوہ بنا لیا ہے اور حمراء الاسد کا ایک نیا عنوان قائم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو تمام مدینہ ماتم کدہ تھا۔ آپ جس طرف سے گزرتے گھروں سے ماتم کی آوازیں آتی تھیں۔ آپ کو عبرت ہوئی کہ سب کے عزیز و اقارب ماتم داری کا فرض ادا کر

❶ یہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب من قتل من المسلمین یوم احد: ۴۰۷۹ کی روایت ہے لیکن دوسری کتابوں میں بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر تو خصوصیت کے ساتھ اور دوسرے شہدا پر بھی نماز جنازہ پڑھی۔ یہ شہدا ایک ایک کر کے اور بعض میں ہے کہ دس دس کر کے لائے جاتے تھے اور آپ ﷺ ان پر نماز جنازہ پڑھتے تھے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش مبارک ہر ہر جماعت کے ساتھ گویا ستر دفعہ یا سات دفعہ نماز ادا کی گئی۔ (شرح معانی الآثار طحاوی، باب الصلوۃ علی الشهداء، ج ۱، ص: ۲۹۰ ونصب الرایه زیلعی، باب احادیث الصلوۃ علی الشهید، ص: ۱۵۰ ومغازی واقدی، ص: ۳۰۰ مطبوعہ کلکتہ۔ (س)) ❷ یہ تمام واقعات صحیح بخاری، غزوۃ احد: ۴۰۴۲ کے متفرق ابواب میں ہیں۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب (الذین استجابوا للّٰہ والرسول): ۴۰۷۷۔ (س) ❹ طبری، ج ۳، ص: ۱۴۲۸، ۱۴۲۹۔

رہے ہیں لیکن حضرت حمزہ کا کوئی نوحہ خواں نہیں ہے، رقت کے جوش میں آپ کی زبان سے بے اختیار نکلا:

اما حمزة فلا بواكي له [1] ''لیکن حضرت حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں۔''

انصار نے یہ الفاظ سنے تو تڑپ اٹھے، سب نے جا کر اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا ماتم کرو۔ آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو دروازہ پر پردہ نشینان انصار کی بھیڑ تھی اور حمزہ کا ماتم بلند تھا، ان کے حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا: ''میں تمہاری ہمدردی کا شکر گزار ہوں، لیکن مردوں پر نوحہ کرنا جائز نہیں۔'' (عرب میں دستور تھا کہ مردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بین کرتی تھیں، کپڑے پھاڑ لیتی تھیں، گال نوچتی، گالوں پر تھپڑ مارتی تھیں اور چیختی چلاتی تھیں۔ یہ رسم بد اسی دن سے بند کر دی گئی اور فرمایا گیا کہ آج سے کسی مردہ پر نوحہ [2] نہ کیا جائے یہ بھی بعد کو ارشاد ہوا کہ ''اس طرح ماتم کرنا مسلمان کی شان نہیں۔'') [3] (قرآن مجید میں سورۂ آل عمران میں غزوۂ احد کا مفصل ذکر موجود ہے)۔

واقعات متفرقہ ۳ھ

اس سال یعنی ۳ھ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ رمضان کی پندرھویں تاریخ تھی۔ اسی سال آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں اور غزوۂ بدر کے زمانہ میں بیوہ ہوگئی تھیں نکاح کیا۔ اسی سال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے شادی کی۔ وراثت کا قانون بھی اسی سال نازل ہوا۔ اب تک وراثت میں ذوی الارحام (وہ حصہ دار جو ماں، بیٹی، بہن یا لڑکیوں کی طرف سے منسوب ہو) کا کوئی حصہ نہ تھا، ان کے حقوق کی بھی تفصیل کی گئی، مشرکہ کا نکاح مسلمان سے اب تک جائز تھا، اس سال اس کی بھی تحریم نازل ہوئی۔

[1] مسند احمد، ج ۲، ص: ۸٤، (س) [2] ابن هشام، غزوة احد، ج ۲، ص: ۸۸؛ مسند احمد، جلد ۲، ص: ۸٤۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ماینهی عن النوح والبكاء: ۱۳۰۵-۱۳۰٦۔ (س)

سنہ ۴ھ

سلسلہ [1] غزوات وسرایا

تمام قبائل عرب بجز ایک دو کے، اسلام کے دشمن تھے۔ دشمنی زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ ہر قبیلہ بت پرستی کو اپنا دین وآئین سمجھتا تھا جبکہ اسلام اسی کو مٹاتا تھا۔ اس کے ساتھ قریش کا اثر تمام عرب پر تھا۔ حج کے زمانہ میں تمام قبائل مکہ میں جمع ہوتے تھے اور قریش ان کو اسلام کی دشمنی پر ابھارتے۔ ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ تمام قبائل کی وجۂ معاش لوٹ اور غارت گری تھا۔ جبکہ اسلام اس سے نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی روکتا تھا۔ اس لئے وہ جانتے تھے کہ اگر اسلام قائم ہو گیا تو ہمارے ذرائع معاش بند ہو جائیں گے۔ تاہم بدر کی فتح نے ایک عام رعب بٹھا دیا تھا جس کی وجہ سے تمام قبیلے اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے۔ لیکن احد کی شکست نے حالت بدل دی اور دوبارہ تمام قبائل دفعتاً اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیرت نبوی میں سرایا (چھوٹی چھوٹی لڑائیاں) کا جو ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے، اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ عام مؤرخوں نے اگرچہ اپنی عادت کے موافق ان لڑائیوں کے ذکر میں ان کے اسباب سے بحث نہیں کی۔ لیکن ابن سعد نے طبقات میں اور ائمۂ فن نے قریباً ہر واقعہ کا سبب لکھ دیا ہے یعنی کسی خاص قبیلہ نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے مدافعت کے لئے فوجیں بھیجیں۔

سریہ ابی سلمہ رضی اللہ عنہ

سب سے پہلے (یکم) محرم ۴ھ میں طلحہ اور خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو فید کے کوہستانی علاقہ قطن میں رہتا تھا، مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کو ایک سو پچاس مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ یہ خبر سن کر ان کی جماعت منتشر ہو گئی۔ [2]

سریہ ابن انیس

اس کے بعد محرم ۴ھ میں سفیان بن خالد جو قبیلہ لحیان کا تھا اور جو کوہستان عُرنہ کا رئیس تھا، مدینہ پر حملہ کا قصد کیا۔ اس کے مقابلہ کے لئے آپ ﷺ نے عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو بھیجا جنہوں نے لطائف الحیل سے موقع حاصل کیا اور سفیان کو قتل کر دیا۔ [3]

---

[1] غزوہ اور سریہ میں جو فرق ہے اس کی نسبت علمائے سیرت مختلف الرائے ہیں۔ زیادہ مقبول یہ رائے ہے کہ جس واقعہ میں آنحضرت ﷺ خود شریک ہوئے وہ غزوہ کے نام سے موسوم ہے اور جس میں صحابہ افسر مقرر کر کے بھیج دیے جاتے تھے وہ سریہ کہلاتا تھا۔

[2] ابن سعد، ص: ۳۵ (جلد ۲ قسم اول)، اصل عبارت یہ ہے: بلغ رسول اللّٰه ان طليحة ومسلمة ابنى خويلد قد سارا فى قومهما ومن اطاعهما يدعونهم الى حرب رسول اللّٰه ﷺ۔ [3] طبقات ابن سعد، قسم اول، ج ۲، ص: ۳۶ اصل عبارت یہ ہے: وذالك انه بلغ رسول اللّٰه ﷺ ان سفيان بن خالد الهذلى قد جمع الجموع لرسول اللّٰه ﷺ۔

صفر ۴ھ میں ابو براء کلابی [1] جو قبیلہ کلاب کا رئیس تھا، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ چند لوگوں کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں، آپ نے فرمایا: ''مجھ کو نجد کی طرف سے ڈر ہے۔'' [2] ابو براء نے کہا: ''ان کا میں ضامن ہوں۔'' آپ ﷺ نے منظور فرمایا اور ستر انصار ساتھ کر دیے، یہ لوگ نہایت مقدس اور درویش تھے اور اکثر اصحابِ صفہ میں سے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن بھر لکڑیاں چنتے شام کو فروخت کر کے کچھ اصحاب صفہ کی نذر کرتے، کچھ اپنے لئے رکھتے۔

سریہ بیر معونہ

ان لوگوں نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا اور حرام بن ملحان کو آنحضرت ﷺ کا خط دے کر عامر بن طفیل بن مالک (بن جعفر کلابی عامری) کے پاس بھیجا جو قبیلہ کا رئیس تھا۔ عامر نے حرام کو قتل کر دیا اور آس پاس کے جو قبائل تھے یعنی عصیہ، رعل، ذکوان، سب کے پاس آدمی دوڑا دیے کہ تیار ہو کر آئیں۔ ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا اور عامر کی سرداری میں آگے بڑھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم حرام کی واپسی کے منتظر تھے۔ جب دیر لگی تو خود روانہ ہوئے۔ راستہ میں عامر کی فوج کا سامنا ہوا۔ کفار نے ان کو گھیر لیا اور سب کو قتل کر دیا [3] صرف عمرو بن امیہ [4] کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ ''میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ان کی چوٹی کاٹی اور چھوڑ دیا۔ آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا۔ مہینہ بھر نماز فجر میں ان ظالموں کے حق میں بددعا کی۔ حضرت عمرو بن امیہ نے (واپسی میں راستہ میں بنی عامر کے) دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا جن کو رسول اللہ ﷺ امان دے چکے تھے، مگر حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ تھا۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ ہم نے بنی عامر سے ان کی اس بے وفائی کا بدلہ لے لیا جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ کیا ہے [5] (جب آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو) آپ ﷺ نے اس پر ناراضی ظاہر فرمائی اور دونوں کا خون بہا ادا کر دینے کا اعلان فرمایا۔

واقعہ رجیع

انہی دنوں عضل اور قارہ جو دو مشہور قبیلے ہیں، ان کے چند آدمی آنحضرت ﷺ کے پاس آئے کہ

---

[1] ابو براء بعد کو اسلام لائے یا نہیں؟ اس میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ ذہبی کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اسلام نہیں لائے۔ اصابہ میں ہے کہ ان کے قبول اسلام کی کوئی روایت نہیں ہے تاہم بعض روایات کی بنا پر ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسلام لائے تھے۔ زرقانی، ج ۳ ص: ۸۶۔

[2] اور یہ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ عامر بن طفیل جوان اطراف کا رئیس تھا اس نے آنحضرت ﷺ سے کہا تھا کہ ''میرے تمہارے درمیان تین باتیں ہیں، بادیہ کے مالک تم بنو اور شہروں کا میں بنوں یا اپنے بعد مجھ کو اپنا جانشین بناؤ، ورنہ غطفان کو لے کر میں چڑھ آؤں گا۔ آنحضرت ﷺ نے منظور نہیں فرمایا تھا، اس لیے اس کی طرف سے ڈر تھا۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۃ الرجیع ورعل وذکوان: ۴۰۹۱۔

[3] صحابہ کی اس جماعت میں حضرت کعب بن زید رضی اللہ عنہ بھی تھے، کفار نے یہ سمجھا کہ یہ بھی شہید ہو گئے ہیں، لیکن ان میں جان باقی تھی اور بعد کو زندہ بچ رہے۔ غزوۂ خندق میں شہید ہوئے۔ زرقانی، ج ۲ ص: ۸۸۔ (س)

[4] حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ اور حضرت منذر بن محمد عقبہ انصاری رضی اللہ عنہ پیچھے تھے۔ جب یہ مقام حادثہ پر پہنچے تو حضرت منذر رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا اور حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو قید کر لیا گیا اور بعد کو وہ چھوڑ دیے گئے، زرقانی ج ۲ ص ۸۹۔ (س)

[5] البدایہ والنہایہ ابن کثیر، ج ۴، ص: ۷۳ زرقانی، ج ۲، ص: ۹۲۔

ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کرلیا ہے، چند لوگوں کو ہمارے ہاں بھیجئے کہ اسلام کے احکام اور عقائد سکھائیں۔ آپ نے دس اشخاص ساتھ کر دیے جن کے سردار عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے، یہ لوگ جب مقام رجیع پر پہنچے جو عُسفان اور مکہ کے وسط میں ہے۔ تو ان غداروں نے بدعہدی کی اور قبیلہ بنولحیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دیں۔ بنولحیان دو سو آدمی لے کر جن میں ایک سو تیر انداز تھے، ان لوگوں کے تعاقب میں چلے اور ان کے قریب آ گئے۔ ان لوگوں نے بڑھ کر ایک ٹیکرے پر پناہ لی۔ تیراندازوں نے ان سے کہا کہ ''اتر آؤ ہم تم کو امان دیتے ہیں۔'' حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں کافر کی پناہ میں نہیں آتا۔'' یہ کہہ کر اللہ سے خطاب کیا کہ ''اپنے پیغمبر کو خبر پہنچا دے۔'' غرض وہ مع سات آدمیوں کے لڑ کر تیر اندازوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ (قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کہ عاصم کے بدن سے گوشت کا ایک لوتھڑا کاٹ لائیں کہ ان کی شناخت ہو، قدرت خداوندی نے شہید مسلم کی یہ تحقیر گوارا نہ کی، شہد کی مکھیوں نے لاش پر پہرہ ڈال دیا، قریش ناکام لوٹ گئے) لیکن تین شخصوں [1] نے جن میں سے دو کے نام حضرت خبیب اور حضرت زید (بن الدثنہ) تھے کافروں کے وعدہ پر اعتماد کیا اور ٹیکرے سے اتر آئے کافروں نے بدعہدی کر کے ان کی مشکیں کس لیں اور مکہ میں لے جا کر بیچ ڈالا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے جنگ احد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا اس لئے ان کو حارث کے لڑکوں نے خریدا کہ باپ کے بدلہ میں قتل کریں گے [2] چند روز انہی کے گھر میں رہے، ایک دن حارث کی نواسی کو کھلا رہے تھے، اتفاق سے ہاتھ میں چھری تھی۔ [3] بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آ گئی۔ دیکھا کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے، کانپ اٹھی۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تو یہ سمجھی کہ میں اس کو قتل کر دوں گا؟ ہمارا یہ کام نہیں۔'' خاندان حارث ان کو حرم کے حدود سے باہر لے گیا اور قتل کرنا چاہا۔ انہوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ قاتلوں نے اجازت دی، انہوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا: ''دیر تک نماز پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن تم کو خیال ہوگا کہ موت سے ڈرتا ہوں۔'' پھر یہ اشعار پڑھے۔

و ما ان ابالی حین اقتل مسلما	جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں
علی ای شق کان للہ مصرعی	تو مجھ کو اس کی پروا نہیں کہ کس پہلو پر قتل کیا جاؤں گا
و ذلك فی ذات الالہ وان یشاء	یہ جو کچھ ہے خالصتاً اللہ کے لئے ہے، اگر وہ چاہے گا تو
یبارك علی اوصال شلو ممزع	جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کرے گا

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ الرجیع ورعل......: ٤٠٨٦ نے اس موقع پر جن تیسرے بزرگ کا ذکر کیا ہے ان کا نام نہیں لکھا ہے۔ ابن اسحاق نے ان کا نام حضرت عبداللہ بن طارق بتلایا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ اسی موقع پر شہید کر دیے گئے لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ یہاں سے آگے چل کر مکہ کے راستے میں بمقام ظہران ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، زرقانی، جلد ۲ ص: ۷۸۔ [2] حارث کے بیٹے ابوسروعہ جنہوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، بعد کو مسلمان ہوئے اور شرف صحابیت سے سرفراز ہوئے زرقانی، جلد ۲ ص: ۷۸۔ (س)

[3] صحیح بخاری، (کتاب المغازی: ٤٠٨٦) میں اُسترا لکھا ہے۔ (س)

اسی زمانہ سے دستور ہے کہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول پہلے دو رکعت نماز ادا کر لیتا ہے [1] (اور یہ مستحب سمجھا جاتا ہے) [2] دوسرے صاحب حضرت زید رضی اللہ عنہ تھے، ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادہ سے خریدا تھا ان کے قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشا دیکھنے آئے، جن میں ابوسفیان بھی تھا جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے کہا: ''سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد ﷺ قتل کیے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتے؟'' بولے: ''اللہ کی قسم! میں تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ ﷺ کے تلووں میں کانٹا چبھ جائے۔'' صفوان کے غلام نسطاس [3] نے ان کی گردن مار دی۔

ان لڑائیوں کا سلسلہ یہود کی لڑائیوں سے مل جاتا ہے اور چونکہ یہود کے واقعات اور ان کی سرگزشت تاریخ اسلام سے گوناگوں تعلقات رکھتی ہے، اس لئے ہم ان کے واقعات مستقل حیثیت سے لکھتے ہیں اور اس غرض کے لئے کسی قدر ہم کو پچھلے زمانہ کی طرف واپس آنا پڑے گا۔

واقعات متفرقہ ۴ھ

اسی سال شعبان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ اسی سال ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت خزیمہ نے انتقال فرمایا، جن سے اسی سال نکاح بھی ہوا تھا۔

اسی سال آنحضرت ﷺ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لیں اور فرمایا کہ مجھ کو یہود پر اطمینان نہیں۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے صرف پندرہ دن میں عبرانی زبان سیکھ لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں عبری زبان سے لوگ بہت کچھ آشنا تھے۔ اسی سال شوال میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا۔

اسی سال یہودیوں نے آپ ﷺ کے سامنے ایک یہودی کا مقدمہ پیش کیا اور آپ نے تورات کے مطابق رجم کا حکم دیا (تفصیل ان واقعات کی دوسرے حصوں میں آئے گی)۔ بعض مؤرخین کے نزدیک شراب کی حرمت کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا، لیکن اس میں روایتیں نہایت مختلف ہیں۔ پوری تحقیق احکام شرعیہ کے ذکر میں آئے گی۔

---

[1] طبری، ج۳، ص: ۱٤۳٥ وطبقات ابن سعد، قسم اول، جزء ثانی، ص: ٤٠ اشعار اور اکثر جزئیات واقعہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوة الرجیع: ٤٠٨٦ سے لئے گئے ہیں، نیز صحیح بخاری، کتاب الجهاد، هل يستاسر الرجل ومن لم يستاسر وصلى ركعتين عند القتل: ۳۰٤٥۔ [2] اس نماز کے استحباب کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے اس فعل کی اطلاع ملی تو آپ نے اس کو پسند فرمایا (شرح سیر کبیر سرخسی، اول ص: ۱۵) آنحضرت ﷺ کے اس استحسان نے اس نماز کو استحباب کا درجہ عطا فرمایا (الروض الانف، ج ۲، ص: ۱۷۱) محدثین کی اصطلاح میں اس صورت حال کو تقریر رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں یعنی حضور ﷺ کے سامنے کوئی فعل کیا گیا ہو یا حضور ﷺ کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہو اور حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ملی ہو، مگر آپ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو تو اس سے بھی اس فعل کا مسنون و مستحب یا جائز ہونا سمجھا جائے گا۔ (س) [3] نسطاس نے بعد کو اسلام قبول کیا۔ زرقانی، ج ۲، ص: ۸۰، (س)

یہودیوں کے ساتھ معاہدہ اور جنگ

۲ھ، ۳ھ، ۴ھ

اوپر گزر چکا ہے کہ یہود مدت دراز سے مدینہ پر فرماں روا تھے۔ انصار نے آ کر ان کے ساتھ تعلقات پیدا کئے اور رفتہ رفتہ حریفانہ اقتدار حاصل کیا لیکن جنگ بعاث نے ان کی قومی طاقت توڑ دی اور اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ یہود سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتے۔

یہود کے تین قبیلے تھے، قینقاع، نضیر، قریظہ، یہ سب مدینہ کے اطراف اور حوالی میں آباد تھے اور عموماً زمیندار، دولت مند، تجارت پیشہ اور صناع تھے۔ قینقاع زرگری کا پیشہ کرتے تھے چونکہ سب میں زیادہ بہادر اور شجاع تھے اس لئے ہمیشہ ان کے پاس اسلحہ جنگ کے ذخیرے تیار رہتے تھے۔ انصار عموماً ان کے مقروض اور زیر بار تھے۔ ملکی اور تجارتی افسری کے ساتھ ان لوگوں کا مذہبی اور علمی اثر بھی تھا، انصار عموماً بت پرست اور جاہل تھے۔ اس بنا پر وہ یہود کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کو اپنے سے زیادہ مہذب اور شائستہ سمجھتے، جن لوگوں کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے۔ وہ منت مانتے کہ ہمارا بیٹا زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنا دیں گے۔ چنانچہ مدینہ میں اسی قسم کے بہت سے جدید الیہودیہ [1] موجود تھے۔

یہود میں امتدادِ زمانہ سے نہایت اخلاق ذمیمہ پیدا ہو گئے تھے۔ ان کے امتیازی خصائص زندگی یہ تھے کہ ہر طرف لین دین کا کاروبار پھیلا رکھا تھا اور تمام آبادی ان کے قرضوں میں زیر بار تھی۔ چونکہ تنہا وہی صاحب دولت تھے اس لئے نہایت بے رحمی سے سود کی بڑی شرحیں مقرر کرتے اور قرضہ کی کفالت میں لوگوں کے بال بچے۔ یہاں تک کہ مستورات کو رہن رکھواتے تھے۔ کعب بن اشرف نے خود اپنے انصاری دوستوں سے یہی درخواست کی تھی [2] اور مختلف طریقوں سے لوگوں کے مال اور جائیداد پر تصرف کرتے تھے۔

طمّاعی اور حرص کی شدت سے یہ حالت تھی کہ معصوم بچوں کو دو چار روپے کے زیور کے لئے پتھر سے مار ڈالتے تھے۔ [3] دولت کی بہتات سے زنا اور بدکاری کا عام رواج تھا اور چونکہ زیادہ تر امرا اس کے مرتکب ہوتے تھے اس لئے ان کو سزا نہیں دے سکتے تھے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک یہودی سے دریافت فرمایا کہ ''کیا تمہاری شریعت میں زنا کی سزا صرف درّہ مارنا ہے؟'' اس نے کہا نہیں بلکہ سنگسار کرنا ہے، لیکن ہمارے شرفا میں زنا کی کثرت ہو گئی اور جب کوئی شریف اس جرم میں پکڑا جاتا تو ہم اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ البتہ عام آدمیوں کو یہ سزا دیتے تھے۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ سنگسار کرنے کی سزا درّہ سے بدل دی جائے، تاکہ شریف اور رذیل سب کو یکساں سزا دی جا سکے۔ [4]

---

[1] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الاسير يكره على الاسلام:٢٦٨٢۔ [2] صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب قتل كعب بن الاشرف:٤٠٣٧ ومسلم، كتاب الجهاد، باب قتل كعب بن اشرف: ٤٦٦٤۔
[3] صحيح بخاري، كتاب الديات، باب اذا قتل بحجر أو بعصًا:٦٨٧٧۔(س) [4] اسباب النزول، واحدی ص: ١٤٥ مصر۔ (وصحيح مسلم، كتاب الحدود، باب ذكر رجم اليهود:٤٤٤٠) (س)

اسلام مدینہ میں آیا تو یہود کو نظر آیا کہ اب ان کا جابرانہ اور خود غرضانہ اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلام جس قدر روز بروز مدینہ میں پھیلتا جاتا تھا اسی قدر یہودیوں کا مذہبی وقار جو ان کو مدتوں سے حاصل تھا، زوال پذیر ہوتا جاتا تھا۔ مدینہ کے مشرکین میں یہودیت جو تدریجاً پھیل رہی تھی دفعتہً رک گئی۔ نئی نئی فتوحات کی بدولت انصار جس قدر دولت مند ہوتے جاتے تھے، یہودیوں کے قرض کے شکنجوں سے آزاد ہوتے جاتے تھے۔ یہودیوں میں جو اخلاقِ بد عموماً پھیلے ہوئے تھے اور جن پر دولتمندی اور مذہبی پیشوائی نے پردہ ڈال رکھا تھا، اب ان کا راز فاش ہونے لگا۔

آنحضرت ﷺ نے اگرچہ ان سے معاہدہ کیا تھا کہ ان کے جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا اور ان کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی، لیکن منصب نبوت کی حیثیت سے ذمائم اخلاق پر وعظ اور تذکیر آپ کا فرض نبوت تھا۔ قرآن مجید میں ان کے اخلاق کی پردہ دری پر صاف صاف آیتیں نازل ہوتی تھیں:

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٤٢)

''وہ جھوٹ باتوں کے سننے والے اور مال حرام کے بڑے کھانے والے ہیں۔''

﴿ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٦٢)

''اور تو ان میں سے اکثروں کو دیکھے گا کہ گناہ اور تعدی کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں۔''

﴿ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ﴾ (٤/ النسآء:١٦١)

''اور چونکہ یہ سود خوری کرتے ہیں حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا اور چونکہ یہ لوگوں کا مال خورد برد کر جاتے ہیں۔''

ان اسباب نے تمام یہود میں اسلام کی طرف سے سخت ناراضی پھیلا دی اور اب انہوں نے طرح طرح سے آنحضرت ﷺ کو اذیتیں دینی اور اسلام کے خلاف کوششیں کرنی شروع کیں لیکن آنحضرت ﷺ کو حکم تھا کہ ان کی ہر طرح کی ایذا رسانیوں کو برداشت کریں:

﴿ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (٣/ آل عمران:١٨٦)

''اور اہل کتاب اور مشرکوں سے تم بہت سی ایذا (کی باتیں) سنو گے اور اگر صبر کیے رہو اور پرہیز گاری پر قائم رہو تو یہ ہمت کے کام ہیں۔''

یہودیوں نے معمول کر لیا تھا کہ آنحضرت ﷺ سے سلام علیکم کرتے تو بجائے السلام علیک کے السام علیک کہتے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ''تجھ کو موت آئے۔'' ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی موجود تھیں۔ انہوں نے سنا تو ان کو سخت غصہ آیا اور بے اختیار ہو کر بول اٹھیں کہ ''کم بختو! تم کو موت آئے۔'' آنحضرت ﷺ

نے فرمایا کہ ''نرمی سے کام لو۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''آپ نے کچھ سنا بھی کہ ان لوگوں نے کیا کہا؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ہاں، لیکن یہ کافی ہے کہ میں نے علیك کہہ دیا۔'' [1]

آنحضرت ﷺ صرف مجاملت اور درگزر ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ اکثر معاشرت کی باتوں میں یہود کے ساتھ اتفاق فرماتے اور ان کی مذہبی توقیر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اہلِ عرب کی عادت تھی کہ بالوں میں مانگ نکالتے تھے بخلاف اس کے یہودی بالوں کو یوں ہی چھوڑ دیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی یہودیوں ہی کی موافقت کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے:

وكان يحب موافقة اهل الكتاب فيما لم يؤمر بشيء۔ [2]

''اور آنحضرت ﷺ ان چیزوں میں جن میں کوئی خاص حکم الٰہی نہیں ہوتا تھا اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے۔''

آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہیں، آپ نے بھی حکم دیا کہ لوگ عاشورہ کا روزہ رکھیں۔ [3] کسی یہودی کا جنازہ گزرتا تو آپ تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔ [4]

ایک دفعہ ایک یہودی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت اس طرح بیان کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ سے بھی افضل ہیں۔ اس پر ایک انصاری کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے اس کو تھپڑ مارا۔ یہودی نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ کو اور پیغمبروں پر (ایسی) فضیلت نہ دو، (جس سے ان کا نقص لازم آئے)۔ قیامت کے دن لوگ بیہوش ہو جائیں گے اور سب سے پہلے مجھ کو ہوش آئے گا، اس وقت میں دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں۔'' [5]

احکام الٰہی جو قرآن مجید میں نازل ہو رہے تھے، سرتاپا اہل کتاب کے ساتھ مدارات اور معاشرت کی ترغیب میں تھے:

﴿ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۵)

''اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔''

عموماً ان کی قدر و منزلت کا خیال دلایا جاتا تھا:

﴿ يَٰبَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَٰلَمِينَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۲)

---

1. یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب (۲۹۳۵، ۶۰۲۴، ۶۰۳۰، ۶۲۵۶، ۶۳۹۵، ۶۴۰۱، ۶۹۲۷) میں مذکور ہے۔
2. بخاری، کتاب اللباس، باب الفرق: ۵۹۱۷۔
3. بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اتیان الیهود النبی ﷺ حین قدم المدینة: ۳۹۴۲۔(س)
4. بخاری، کتاب الجنائز، باب من قام الجنازة یهودی: ۱۳۱۱۔۱۳۱۲۔(س)
5. بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول الله تعالیٰ: وان یونس لمن المرسلین...... : ۳۴۱۴۔

''اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کا خیال کرو جو میں نے تم کو دیں اور یہ کہ میں نے تم کو تمام عالم پر فضیلت دی ہے۔''

تبلیغ اسلام کی حیثیت سے جو کچھ اس وقت ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا صرف اس قدر تھا:

﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:٦٤)

''کہہ دو کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جس کو ہم تم دونوں یکساں مانتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کو چھوڑ کر کسی کو اپنا رب نہ بنائے تو اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ اچھا تم گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔''

ان باتوں میں سے ایک بھی ان کے معتقدات اور مزعومات کے خلاف نہ تھی۔ لیکن ان تمام مہربانیوں اور اظہار لطف و مدارات کا جو صلہ تھا یہ تھا کہ انہوں نے ہر طرح سے اسلام کی خانہ براندازی کا عزم کر لیا۔ اسلام کی عظمت اور وقار کم کرنے کے لیے مشرکوں سے کہتے تھے کہ مذہب میں مسلمانوں سے تو تم ہی اچھے ہو:

﴿ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٥١)

''اور کافروں کی نسبت کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے یہ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔''

مذہب اسلام کی بے اعتباری پھیلانے کے لئے یہاں تک آمادہ ہوئے کہ مسلمان ہو کر پھر مرتد ہو جائیں، تاکہ لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا۔

﴿ وَقَالَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّھُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۷۲)

''اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو اترا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ، شاید کہ وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں۔''

ان باتوں کے علاوہ اسلام کی بربادی کی ملکی تدبیریں اختیار کیں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو جو قوت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ انصار کے دو قبیلے ''اوس'' اور ''خزرج'' جو باہم لڑتے بھڑتے رہتے تھے، اسلام نے ان کو باہم متحد کر دیا ہے۔ ان دونوں کو اگر پھر لڑا دیا جائے تو اسلام خود بخود فنا ہو جائے گا۔ عرب میں پچھلی کینہ آوریوں کو تازہ کر دینا نہایت آسان کام تھا۔ ایک دفعہ دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی جلسہ میں بیٹھ کر بات چیت کر رہے تھے۔ چند یہودیوں نے اس صحبت میں جا کر جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑا۔ یہ وہ لڑائی تھی جس میں انصار کے یہ دونوں قبیلے آپس میں لڑے تھے اور اسی لڑائی نے ان کی تمام قوت برباد کر دی تھی۔ اس لڑائی

کے تذکرہ نے دونوں کو پرانے واقعے یاد دلائے اور دفعتاً عداوت کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ لعن وطعن سے گزر کر تلواریں کھنچ گئیں، حسن اتفاق سے آنحضرت ﷺ کو خبر ہوگئی۔ آپ نے فوراً موقع پر پہنچ کر وعظ و پند سے دونوں فریق کو ٹھنڈا کیا۔ اس پر یہ آیت اتری: ❶

﴿ يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَٰبَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَٰنِكُمْ كَٰفِرِينَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۰۰)

''مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے بعض لوگوں کا کہا مانو گے تو وہ تم کو ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنادیں گے۔''

منافقین کا ایک گروہ پہلے سے موجود تھا جو اگرچہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا لیکن درحقیقت اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اس گروہ کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ یہودیوں نے اس کو نہایت آسانی سے درپردہ ملا لیا اور ان کے ساتھ مل کر سازش شروع کی۔ اتفاق یہ کہ عبداللہ بن ابی پہلے سے بھی بنی نضیر کا حلیف اور ہم پیمان تھا۔

قریش نے بدر سے پہلے عبداللہ بن ابی کو لکھا تھا کہ ''مسلمانوں کو نکال دو ورنہ ہم آ کر تمہارا استیصال کر دیں گے۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے تو بدر کے بعد انہوں نے یہود کو خط لکھا:

انکم اهل الحلقة والحصون وانكم تقاتلن صاحبنا او لنفعلن كذا وكذا ولا يحول بيننا وبين خدم نسائكم شيء۔ ❷

''تم لوگوں کے پاس اسلحۂ جنگ اور قلعہ جات ہیں، تم ہمارے حریف (محمد ﷺ) سے لڑو ورنہ ہم تمہارے ساتھ یہ یہ کریں گے اور کوئی چیز ہم کو تمہاری عورتوں کے کڑوں تک پہنچنے سے روک نہ سکے گی۔''

ابوداؤد نے چونکہ بنونضیر کے ذکر میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے صرف بنونضیر کا نام لیا ہے، ورنہ قریش کا خط عام یہود کے نام تھا اور نتیجہ بھی عام تھا، اسی بنا پر محدث حاکم نے بنونضیر اور قینقاع دونوں کے واقعہ کو ایک ہی واقعہ خیال کیا ہے۔ غرض اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ آنحضرت ﷺ راتوں کو گھر سے نکلتے تو یہودیوں کی وجہ سے جان کا خطرہ رہتا تھا۔ طلحہ بن براء ایک صحابی تھے، (انہوں نے انتقال کے وقت) وصیت کی کہ اگر میں رات کے وقت مروں تو آنحضرت ﷺ کو خبر نہ کرنا اس لئے کہ یہود کی طرف سے ڈر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ پر حادثہ گزر جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اصابہ میں ابوداؤد وغیرہ کی سند سے پورا واقعہ نقل کیا ہے۔ ❸

❶ اصابه في تمييز الصحابة للحافظ ابن حجر العسقلاني، مطبوعه مصر، ج۱، ص:۸۸۔ ❷ سنن ابی داود، كتاب الخراج باب في خبر النضير: ۳۰۰۴۔ (س) ❸ دیکھو اصابه ترجمة طلحة بن براء قسم اول، ج۳، ص:۲۸۸۔

شوال ۲ھ غزوۂ بنی قینقاع

بدر کی فتح نے یہود کو زیادہ اندیشہ ناک کر دیا، ان کو علانیہ نظر آیا کہ اسلام اب ایک طاقت بنا جاتا ہے اور چونکہ قبائل یہود میں سب سے زیادہ جری اور بہادر بنوقینقاع تھے، [1] اس لئے سب سے پہلے انہی نے اعلان جنگ کی جرأت کی۔ آنحضرت ﷺ سے جو معاہدہ کیا تھا سب سے پہلے انہی نے اس کی عہد شکنی کی۔ ابن ہشام وطبری نے ابن اسحاق کی روایت سے عاصم بن قتادہ انصاری کی روایت نقل کی ہے:

ان بنی قینقاع کانوا اول یہود نقضوا مابینهم وبین رسول الله وحاربوا فیما بین بدر واحد۔ [2]

''بنوقینقاع پہلے یہود تھے جنہوں نے اس معاہدہ کو جوان میں اور آنحضرت ﷺ میں تھا توڑ ڈالا اور بدر اور احد کے درمیانی زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی۔''

ابن سعد نے غزوۂ بنوقینقاع کے ذکر میں لکھا ہے:

فلما كانت وقعة بدر اظهروا البغی والحسدو نبذوا العهد والمرة۔

''واقعہ بدر میں یہودیوں نے شورش اور حسد ظاہر کیا اور عہد کو توڑ ڈالا۔'' [3]

ایک اتفاقیہ سبب پیش آ گیا جس نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایک انصاری (کی بیوی) مدینہ کے بازار میں ایک یہودی کی دکان میں نقاب پوش آئی۔ یہودیوں نے اس کی بے حرمتی کی۔ ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بیتاب ہو گیا اور اس نے یہودی کو مار ڈالا اور یہودیوں نے مسلمان کو قتل کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ''اللہ سے ڈرو، ایسا نہ ہو تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب آئے۔'' بولے کہ ''ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے۔'' چونکہ ان کی طرف سے نقضِ عہد اور اعلان جنگ ہو گیا تھا مجبور ہو کر آنحضرت ﷺ نے لڑائی کی، وہ قلعہ بند ہوئے پندرہ دن تک محاصرہ رہا بالآخر اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ کریں گے، ان کو منظور ہوگا۔ عبداللہ بن ابی ان کا حلیف تھا اس نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ وہ جلاوطن کر دیے جائیں، [4] غرض وہ اذرعات میں جو شام کے علاقہ میں ہے، جلاوطن کر دیے گئے، یہ سات سو شخص تھے جن میں تین سو زرہ پوش تھے، یہ شوال ۲ھ کا واقعہ ہے۔

قتل کعب بن اشرف ربیع الاول ۳ھ

یہودیوں میں کعب بن اشرف ایک مشہور شاعر تھا، اس کا باپ اشرف جو قبیلہ طے سے تھا۔ مدینہ میں

---

[1] طبقات ابن سعد، ج۲، قسم اول، ص:۱۹، (س) [2] ابن ہشام، ج۲، ص:۵۶۔
[3] زرقانی، ج۲، ص:۵۲۹۔ [4] عام ارباب سیر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ عبداللہ بن ابی کے اصرار سے مجبور ہو گئے، لیکن سنن ابی داود، کتاب الخراج، باب فی خبر النضیر: ۳۰۰۴ میں جس طرح یہ واقعہ مذکور ہے، اس سے اس قیاس کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔

بنونضیر کا حلیف ہو کر اس نے اس قدر عزت اور اعتبار پیدا کیا کہ ابورافع بن ابی الحقیق جو یہود کا مقتدا اور تاجر الحجاز جس کا خطاب تھا [1] اس کی لڑکی سے شادی کی۔ کعب [2] اس کے بطن سے پیدا ہوا، اس دو طرفہ رشتہ داری کی بنا پر کعب یہود اور عرب سے برابر کا تعلق رکھتا تھا اور شاعری کی وجہ سے قوم پر اس کا عام اثر تھا۔ رفتہ رفتہ دولت مندی کی وجہ سے تمام یہودیان عرب کا رئیس بن گیا، یہودی علما اور پیشوایان مذہب کی تنخواہیں مقرر کیں، آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے اور علمائے یہود اس سے ماہواریں لینے آئے تو اس نے ان لوگوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق رائے دریافت کی اور جب اپنا ہم خیال بنا لیا، تب ان کے مقررہ روزینے جاری کیے۔ [3]

اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی۔ بدر کی لڑائی میں سرداران قریش مارے گئے تو اس کو نہایت صدمہ ہوا۔ تعزیت کے لئے مکہ گیا۔ کشتگانِ بدر کے پردرد مرثیے جن میں انتقام کی ترغیب تھی لوگوں کو جمع کر کے نہایت درد سے پڑھتا اور روتا اور رلاتا تھا۔ ابن ہشام نے ان واقعات کے ساتھ اشعار بھی نقل کیے ہیں اگرچہ اس قسم کے اشعار اکثر مصنوعی ہیں تاہم جہاں تک اس زمانہ کی زبان معلوم ہوتی ہے ہم ایک دو شعر نقل کرتے ہیں۔

طحنت رحی بدر لمهلك اهله	جنگ بدر کی چکی نے اہل بدر کو پیس ڈالا
و لمثل بدر تستهل وتد مع ،	بدر جیسے واقعات کے لئے رونا پیٹنا چاہیے
کم قد اصیب به من ابیض ماجد	کتنے شریف سپید و بارونق چہرے جن کے
ذی بهجة تأوی الیه الضُیَّع ،	یہاں اہل حاجت پناہ لیتے تھے مارے گئے

مدینہ میں واپس آیا تو آنحضرت ﷺ کی ہجو میں اشعار کہنا اور لوگوں کو آنحضرت ﷺ کے برخلاف برانگیختہ کرنا شروع کیا۔ [4] عرب میں شاعری کا وہ اثر تھا جو آج یورپ میں بڑے بڑے ملکی مدبروں کی پرجوش تقریروں اور نامور اخبارات کی تحریروں کا ہوتا ہے۔ تنہا ایک شاعر قبیلہ کے قبیلہ میں شعر کے اثر سے آگ لگا دیتا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں چالیس آدمی لے کر گیا، وہاں ابوسفیان سے ملا اور اس کو بدر کے انتقام پر برانگیختہ کیا اور ابوسفیان سب کو لے کر حرم میں آیا۔ سب نے حرم کا پردہ تھام کر معاہدہ کیا کہ بدر کا انتقام لیں گے۔ [5]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب قتل المشرك النائم: ٣٠٢٢۔ [2] الخمیس، ص: ٤٦٤۔

[3] زرقانی، (جلد ۲، ص: ۹) بحوالہ ابن اسحاق وغیرہ۔ [4] ابوداؤد میں ہے وکان کعب بن الاشرف یهجو النبی ﷺ ویحرض علیه کفار قریش (ابوداود، کتاب الخراج، باب کیف کان اخراج الیهود: ٣٠٠٠) (س) ابن سعد میں ہے: کان رجلا شاعرا یهجوا النبی ﷺ واصحابه ویحرض علیه۔ (تفسیر ابن جریر طبری، ج ٥، ص: ٧٩ میں ہے) ان کعب بن الاشرف انطلق الی المشرکین من کفار قریش فاستجا شهم علی النبی ﷺ وامرهم ان یغزوه (س)

[5] خمیس ص: ۵۱۷ غالباً یہ وہی پہلا واقعہ ہے، ابن خمیس نے اس کے متعلق مزید تفصیل بیان کی ہے۔

اس پر اکتفا نہ کر کے قصد کیا کہ چپکے سے آنحضرت ﷺ کو قتل کرا دے۔ علامہ یعقوبی اپنی تاریخ میں بنونضیر کے واقعہ میں لکھتے ہیں: كعب بن الاشرف اليهودي الذي اراد ان يمكر رسول الله ﷺ۔
''کعب بن اشرف یہودی جس نے آنحضرت ﷺ کو دھوکے سے قتل کر دینا چاہا۔''

اس روایت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حافظ ابن حجر نے فتح الباری ❶ میں (ذکر کعب بن اشرف) میں عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ کعب نے آنحضرت ﷺ کو دعوت میں بلایا اور لوگوں کو متعین کر دیا کہ جب آپ ﷺ تشریف لائیں تو دھوکے سے آپ کو ہلاک کر دیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے گو لکھا ہے کہ اس روایت کی سند میں ضعف ہے لیکن جب قرائن اور دیگر شواہد موجود ہیں تو یہ ضعف رفع ہو جاتا ہے۔

فتنہ انگیزی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو آپ نے بعض صحابہ سے شکایت کی اور آپ کی مرضی سے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بمشورۂ رؤسائے اوس ❷ جا کر اس کو ربیع الاول ۳ ھ میں قتل کر دیا۔ ارباب روایت نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ''ہم کو کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔'' ارباب سیر نے اس کے معنی یہ لگائے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ باتیں کہنے کی اجازت مانگی اور آنحضرت ﷺ نے اجازت دے دی کیونکہ ''الحرب خدعة'' یعنی لڑائی میں دھوکا دینا جائز ہے۔ لیکن بخاری کی روایت میں صرف یہ لفظ ہے:

فاذن لي ان اقول ''ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم گفتگو کریں۔''

اس سے غلط گوئی کی اجازت کہاں نکلتی ہے؟ (لیکن جو گفتگو ہوئی اس سے کعب اور عموماً یہود کے اخلاق اور دلی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہم نے محمد ﷺ کو پناہ دے کر تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا اور ہم سے بار بار صدقہ مانگا جاتا ہے اب تمہیں سے کچھ رکھ کر قرض لینا ہے۔'' کعب نے کہا: ''تم خود محمد ﷺ سے اکتا جاؤ گے، اچھا قرض کے لئے اپنی بیویوں کو رہن رکھو۔'' حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تمہارے اس حسن و جمال کے سبب سے ہم کو اپنی بیویوں پر وفاداری کا یقین نہیں۔'' اس نے کہا: ''اچھا اپنے بچوں کو گروی رکھو۔'' انہوں نے کہا: ''اس سے تو تمام عرب میں ہماری بدنامی ہوگی ہم اپنے ہتھیار گروی رکھیں گے اور تم جانتے ہو آج کل ان کی جیسی ضرورت ہے۔'' ❸

صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں قتل کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ ان لوگوں نے دوستانہ طریقہ سے اس کو گھر سے باہر بلایا پھر بال سونگھنے کے بہانہ سے اس کی چوٹی پکڑ لی اور قتل کر ڈالا۔ ❹ لیکن روایت میں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان باتوں کی اجازت دی تھی۔ اس وقت تک عرب میں ان طریقوں سے قتل کرنا معیوب بات نہ تھی، آگے چل کر نہایت مفصل طور سے ایک مستقل عنوان میں یہ بحث آئے گی کہ

---

❶ ج۷، ص: ۲۵۹، (س) ❷ ابن سعد، مغازی، ص: ۲۱۔
❸ زرقانی، ج۲، ص: ۱۳ وصحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل کعب بن الاشرف: ۴۰۳۷ (س)
❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل کعب بن الاشرف: ۴۰۳۷۔ (س)

آنحضرت ﷺ نے کس طرح تدریج کے ساتھ عرب کے ان طریقوں کی اصلاح کی۔

غزوۂ بنونضیر ربیع الاول ۴ھ

حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے قبیلہ عامر کے (جو) دو آدمی قتل کر دیے تھے اور ان کا خون بہا اب تک واجب الادا تھا اور جس کا ایک حصہ معاہدہ کی رو سے یہود بنی نضیر پر واجب الادا تھا۔ اس کے مطالبہ [1] کے لئے آنحضرت ﷺ بنونضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ انہوں نے قبول کیا۔ لیکن در پردہ یہ سازش کی کہ ایک شخص چپکے سے بالا خانہ پر چڑھ کر آنحضرت ﷺ پر پتھر گرا دے۔ اتفاق سے اس وقت آپ ﷺ بالا خانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے تھے۔

عمرو بن حجاش ایک یہودی اس ارادہ سے کوٹھے پر چڑھا۔ آپ ﷺ کو اس کے ارادہ کا حال معلوم ہو گیا اور آپ فوراً مدینہ واپس چلے آئے۔ [2]

اوپر گزر چکا ہے کہ قریش نے بنونضیر کو کہلا بھیجا تھا کہ محمد ﷺ کو قتل کر دو ورنہ ہم خود آ کر تمہارا بھی استیصال کر دیں گے۔ بنونضیر پہلے سے اسلام کے دشمن تھے۔ قریش کے پیغام نے ان کو اور زیادہ آمادہ کیا۔ بنو نضیر نے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ تیس آدمیوں کو لے کر آئیں، ہم بھی اپنے احبار کو لے کر آئیں گے۔ آپ کا کلام سن کر اگر ہمارے احبار آپ کی تصدیق کریں گے تو ہم کو بھی کچھ عذر نہ ہو گا۔ چونکہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے، آپ ﷺ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک معاہدہ نہ لکھ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ آپ یہود بنی قریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی، انہوں نے تعمیل کی۔ بنونضیر کے لئے یہ نظیر موجود تھی کہ ان کے برادرانِ دینی نے معاہدہ لکھ دیا ہے۔ لیکن وہ کسی طرح معاہدہ کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ [3] بالآخر انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر آئیں، ہم بھی تین عالم ساتھ لے کر آتے ہیں یہ علما اگر آپ پر ایمان لائیں گے تو ہم بھی لائیں گے۔ آپ نے منظور فرمایا لیکن راہ میں آپ کو ایک صحیح ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہود تلواریں باندھ کر تیار ہیں کہ جب آپ تشریف لائیں تو آپ کو قتل کر دیں۔ [4]

---

[1] بنونضیر سے آنحضرت ﷺ نے دیت کے متعلق جو گفتگو کی اس کی دو تشریحیں کی گئی ہیں۔ ایک تشریح تو وہ ہے جس کو مصنف نے اختیار فرمایا ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ حضور ﷺ نے بنونضیر سے جو گفتگو فرمائی تھی اس کا ماحصل یہ ہے کہ قبیلہ عامر کو دیت کس طرح ادا کی جائے اور ان کے یہاں دیت کا دستور کیا ہے؟ بنونضیر اور قبیلۂ عامر کے باہم تعلقات اچھے تھے اس لئے ان سے اس مسئلہ میں گفتگو قرینِ قیاس بھی ہے۔ (سیرت حلبیہ، جلد ۲، ص: ۲۷۷) (س) [2] یہ روایت ابن ہشام، (ج ۲ ص: ۱۴۶) وغیرہ میں مذکور ہے، زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے جو صحیح ترین مغازی ہے، یہ عبارت نقل کی ہے، وكانوا قد دسّوا الى قريش في قتاله ﷺ فحضوهم على القتال ودلوهم على العورة (زرقانی، ج ۲، ص: ۹۳) ''یعنی ان لوگوں نے قریش سے در پردہ سازش کر کے ان کو آمادۂ جنگ کیا اور ان کو مخفی مواقع بتائے۔''

[3] یہ تمام تفصیل سنن ابی داؤد، (كتاب الخراج والامارة، باب في خبر النضير: ۳۰۰۴۔(س)) میں ہے، تعجب ہے کہ ارباب سیرت ابوداؤد کی اس روایت سے بالکل بے خبر ہیں۔ (ابوداؤد میں تیس آدمیوں کا ذکر ہے۔)

[4] فتح الباري واقعه غزوة بنو نضير، ج ۷، ص: ۲۵۵۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بنونضیر کی سرکشی کے مختلف اسباب تھے۔ وہ نہایت مضبوط قلعوں میں پناہ گزین تھے۔ جن کا فتح کرنا آسان نہ تھا، اس کے ساتھ عبداللہ بن ابی نے کہلا بھیجا تھا کہ ''تم اطاعت نہ کرنا بنوقریظہ تمہارا ساتھ دیں گے اور میں دو ہزار آدمی لے کر تمہاری اعانت کروں گا۔'' قرآن مجید میں ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ ﴾

(۵۹/ الحشر:۱۱)

''تم نے دیکھا! منافق اپنے کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ تم نکلو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمہارے باب میں کسی کا کہنا نہ مانیں گے اور اگر تم سے کوئی لڑا تو ہم بھی تمہاری مدد کو آئیں گے۔''

لیکن بنونضیر کے تمام خیالات غلط نکلے، بنوقریظہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور منافق علانیہ اسلام کے مقابلہ میں نہیں آ سکتے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیا، قلعہ کے گرد جوان کے نخلستان تھے ان کے چند درخت کٹوا دیے، سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ سب نخلستان نہیں کاٹا گیا بلکہ صرف ''لیـــنة'' جو ایک خاص قسم کی کھجور ہے اور عرب کی عام خوراک نہیں ہے اس کے درخت کٹوا دیے گئے تھے، قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے:

﴿ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓي اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾

(۵۹/ الحشر:۵)

''تم نے لینۃ کے جو درخت کٹوائے اور جس قدر قائم رہنے دیئے سب اللہ کے حکم سے تھا۔ تاکہ اللہ فاسقوں کو رسوا کرے۔''

ممکن ہے کہ درختوں کے جھنڈ سے کمین گاہ کا کام لیا جاتا ہو، اس لئے وہ صاف کرا دیے گئے کہ محاصرہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ [1]

(گزشتہ سے پیوستہ) فتح الباری میں یہ روایت ابن مردویہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ صحیح بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنونضیر نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قسم کی عیاری کا ارادہ کیا تھا بخاری، کتاب المغازی میں ترجمۃ الباب یہ ہے (بـاب حـديـث بني النضير ومخرج رسول الله ﷺ اليهم في دية الرجلين وما ارادوا من الغدر برسول الله ﷺ، ج ۲، ص: ۵۷۴۔

[1] مصنف کے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک درخت وغیرہ میدان جنگ میں اسی وقت کاٹے جاتے ہیں، جب کہ کاٹے بغیر چارہ کار نہ ہو۔ محدثین نے امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول اسی واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے۔ نیز اس موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ اسحاق کا قول ہے اگر دشمن درختوں کی آڑ میں ہو تو ان میں آگ لگا دینا سنت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان ائمہ کے نزدیک اس موقع پر درخت کا کاٹنا جنگی ضرورت کا اقتضا تھا۔ عمدۃ القاری، جلد ۸، ص: ۱۹۱۔ (س)

بالآخر بنونضیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ جس قدر مال واسباب اونٹوں پر لے جاسکیں لے جائیں اور مدینہ سے باہر نکل جائیں۔ چنانچہ سب گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے، ان میں سے معزز رؤسا، مثلاً: سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن الربیع، حیی بن اخطب خیبر چلے گئے، وہاں لوگوں نے ان کا اس قدر احترام کیا کہ خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا [1] اس واقعہ کو اس غرض سے یاد رکھنا چاہیے کہ یہ غزوۂ خیبر کی داستان کا دیباچہ ہے۔ بنونضیر اگر چہ وطن چھوڑ کر نکلے لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں۔ عروہ بن الورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا۔ وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سروسامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں گزری تھی [2] ہتھیاروں کا ذخیرہ جوان لوگوں نے چھوڑا، اس میں پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں۔

ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا اور یہودی ان کو اتحادِ مذہب کی وجہ سے ساتھ لئے جاتے تھے، انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری:

﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۶)

''یعنی مذہب میں زبردستی نہیں ہے۔''

ابوداؤد نے کتاب الجہاد ''باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام'' کے عنوان کے نیچے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کیا ہے۔ [3]

---

[1] طبری، ج۳، ص: ۱۴۵۲۔ [2] یہ تفصیل طبری میں ہے۔ ج۳، ص:۱۴۵۲ (س)

[3] ابو داود: ۲٦٨٢۔

۵ھ

غزوۂ مریسیع، واقعۂ افک وغزوۂ احزاب

قریش اور یہود کی متفقہ سازش نے اب مکہ سے لے کر مدینہ تک آگ لگا دی، جس قدر قبائل تھے سب نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے انمار اور ثعلبہ نے یہ ارادہ کیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کو خبر ہوگئی۔ ۱۰ محرم ۵ ھ کو آپ مدینہ سے چار سو صحابہ کو لے کر نکلے اور ذات الرقاع تک تشریف لے گئے۔ لیکن آپ کی آمد سن کر وہ پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ [1] ربیع الاول ۵ ھ میں یہ خبر آئی کہ دومتہ الجندل میں کفار کی ایک عظیم الشان فوج جمع ہو رہی ہے۔ آنحضرت ﷺ ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ سے نکلے، ان کو خبر ہوئی تو وہ بھاگ گئے۔

غزوۂ مریسیع [2] یا بنی مصطلق شعبان ۵ ھ

خزاعہ ایک قبیلہ تھا جو قریش کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ قریش کو ایک زمانہ میں یہ خیال آیا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں، اس لئے ہم کو اوروں سے ہر باب میں ممتاز ہونا چاہیے۔ حج کا ایک بڑا رکن عرفات کے میدان میں قیام کرنا ہے لیکن چونکہ یہ میدان حرم کی حدود سے باہر ہے۔ سو قریش نے یہ قاعدہ قرار دیا کہ لوگ عرفات جائیں، لیکن ہم کو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں ٹھہرنا چاہیے جو حدود حرم کے اندر ہے۔ اسی قسم کی اور امتیازی باتیں قائم کیں، ان خصائص کی بنا پر اپنا لقب احمس رکھا، لیکن اس قدر فیاضی کی کہ جو لوگ ان پابندیوں کو قبول کر لیتے تھے، ان کو بھی یہ لقب دے دیتے اور ان سے رشتہ ناتہ کرتے تھے۔ قبیلہ خزاعہ [3] کو بھی یہ شرف عطا کیا تھا۔

خزاعہ کا ایک خاندان بنو المصطلق کہلاتا تھا، وہ مقام مریسیع میں جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل ہے آباد تھا۔ اس خاندان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا، اس نے قریش کے اشارہ سے یا خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو مزید تحقیقات کے لئے زید بن خصیب کو بھیجا۔ انہوں نے واپس آ کر خبر کی تصدیق کی۔ آپ نے صحابہ کو تیاری کا حکم دیا۔ ۲ شعبان کو فوجیں مدینہ سے روانہ ہوئیں۔ مریسیع میں خبر پہنچی تو حارث کی جمعیت منتشر ہوگئی اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا۔ لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے۔ انہوں نے صف آرائی کی اور دیر تک جم کر تیر برساتے رہے۔ مسلمانوں نے دفعتاً ایک ساتھ حملہ کیا تو ان کے

---

[1] ابن سعد، غزوۃ ذات الرقاع، ص: ٤٣ (صحیح بخاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع خندق کے بعد واقع ہوا، صلوٰۃ الخوف سب سے پہلے اسی غزوہ میں ادا کی گئی) دیکھیں صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ ذات الرقاع: ۴۱۲۵، ۴۱۲۷۔

[2] ابن اسحاق نے جس کی پیروی طبری اور ابن ہشام نے کی ہے اس غزوہ کو ٦ ھ میں ذکر کیا ہے، موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ ۵ ھ میں واقع ہوا۔ امام بخاری نے بھی صحیح میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے، لیکن غلطی سے ۵ ھ کے بجائے ابن عقبہ کی طرف ۴ ھ کی نسبت کی ہے۔ علامہ ابن حجر نے فتح الباری، (ج ۷، ص: ۳۳۲) میں بیہقی، حاکم، موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر کی روایتوں سے ۵ ھ کو ترجیح دی ہے، ابن سعد نے بھی ۵ ھ ہی لکھا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو فتح الباری۔ [3] یہ واقعات ابن ہشام نے تفصیل سے لکھے ہیں۔ (ج ۱، ص: ٦٧)

پاؤں اکھڑ گئے۔ (۱۰ آدمی مارے گئے اور باقی گرفتار ہو گئے جن کی تعداد تقریباً ۶۰۰ تھی، غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور چار پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں)۔

یہ ابن سعد کی روایت ہے، صحیح بخاری [1] اور صحیح مسلم [2] میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنو المصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ ابن سعد [3] نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے لیکن لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اس پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا کہ صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحیحین کی روایت بھی اصولِ حدیث کی رو سے قابل حجت نہیں ہے کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف، نافع نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا بھی نہ تھا۔ اس لئے یہ روایت اصطلاحِ محدثین میں منقطع ہے۔ [4]

یہ لڑائی ایک معمولی لڑائی تھی لیکن اتفاق سے بعض شہرت پذیر واقعات ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے اس لڑائی کا خاص عنوان قائم کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی فوج میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ بد باطن ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے۔ ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ انصاری نے عرب کے قدیم طریقہ پر ''یاللانصار'' کا نعرہ مارا (انصار کی جے)۔ مہاجر نے بھی ''یا معاشر المہاجرین'' کے نعرہ سے جواب دیا، نعرے سن کر قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے۔ لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا۔ اس کو موقع ہاتھ آیا۔ انصار سے مخاطب ہو کر کہا: ''تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بلا کر اتنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وقت اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے۔''

یہ واقعہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے آ کر کہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور عرض کی کہ کسی کو ارشاد ہو اس منافق کی گردن اڑا دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ کیا تم یہ چرچا پسند کرتے ہو کہ محمد ﷺ اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں۔'' [5]

---

[1] كتاب العتق، باب من ملك من العرب: ۲۵٤۱۔ [2] كتاب الجهاد والسير، باب جواز الاغارة على الكفار: ٤٥۱۹۔ [3] طبقات ابن سعد، ج ۲، مغازی ص: ٤٥ و ٤٦۔ [4] معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف آغاز سند کو ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے ورنہ متن حدیث کے بعد تصریح ہے کہ حدثنی هذا الحديث عبدالله بن عمر وكان في ذالك الجيش یعنی نافع نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے (مسلم، كتاب الجهاد: ٤٥۱۹ وبخاری، كتاب العتق: ۲۵٤۱) اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع نہیں باقی رہتی ہے۔ (س)۔ [5] دیکھو صحیح بخاری، کتاب التفسير، تفسير سورة منافقين، باب قوله: سواء عليهم استغفرت لهم : ٤۹۰۵۔

یہ عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن اُبی جس درجہ کا منافق اور دشمنِ اسلام تھا، اس کے صاحبزادے کہ ان کا نام بھی عبداللہ تھا، اسی قدر اسلام کے جان نثار تھے۔ آنحضرت ﷺ کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپ عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں۔ یہ سن کر وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گزار ہوں لیکن اگر یہ مرضی ہے تو مجھ ہی کو حکم ہو میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی اور کو حکم دیں اور میں غیرت ومحبت کے جوش میں آ کر قاتل کو قتل کر دوں۔'' آپ ﷺ نے اطمینان دلایا کہ قتل کی بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا۔ [1] یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ جب وہ مرا تو کفن کے لئے آپ نے خود پیراہن مبارک عنایت فرما کر، جنازہ کی نماز پڑھائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دامن تھام لیا کہ منافق کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں لیکن دریائے کرم کا بہاؤ کون روک سکتا تھا۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ

لڑائی میں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، جو حارث بن ابی ضرار کی صاحبزادی تھیں۔ ابن اسحاق کی روایت ہے جو بعض حدیث کی کتابوں میں بھی ہے کہ تمام اسیرانِ جنگ لونڈی غلام بنا کر تقسیم کر دیے گئے۔ حضرت جویریہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئیں انہوں نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ ''مکاتبت کرلو، یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑ دو۔'' حضرت ثابت نے منظور کیا، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے پاس روپیہ نہ تھا چاہا کہ لوگوں سے چندہ مانگ کر یہ رقم ادا کر دیں۔ آنحضرت ﷺ کے پاس بھی آئیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں موجود تھیں۔

ابن اسحاق نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی روایت کی ہے جو یقیناً ان کی ذاتی رائے ہے کہ چونکہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نہایت شیریں ادا تھیں۔ میں نے ان کو آنحضرت ﷺ کے پاس جاتے دیکھا تو سمجھی کہ آنحضرت ﷺ پر بھی ان کے حسن وجمال کا وہی اثر ہوگا جو مجھ پر ہوا۔ غرض وہ آنحضرت ﷺ کے پاس گئیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر اس سے بہتر برتاؤ تمہارے ساتھ کیا جائے تو قبول کرو گی۔'' انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری طرف سے میں روپیہ ادا کر دوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لوں۔'' جویریہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''میں نے منظور کیا۔'' [2] آپ ﷺ نے تنہا وہ تمام رقم ادا کر دی اور ان سے شادی کر لی۔

یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو ابن ہشام اور ابوداؤد دونوں میں موجود ہے۔ لیکن دوسرے طریق روایت میں اس سے زیادہ واضح بیان مذکور ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا باپ (حارث) رئیس عرب تھا۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا جب گرفتار ہوئیں تو حارث آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی، میری شان

---

[1] یہ تمام واقعات نہایت تفصیل سے ابن سعد (ج ۲ ص: ۴۵ و مابعد اور طبری (ج ۳ ص: ۱۵۱۵) نے لکھے ہیں اور صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں بھی مذکور ہیں۔ [2] ابو داود، کتاب العتق، باب فی بیع المکاتب الخ: ۳۹۳۱۔

اس سے بالاتر ہے، آپ اس کو آزاد کر دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خود حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔'' حارث نے جا کر حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ محمد ﷺ نے تیری مرضی پر رکھا، دیکھنا مجھ کو رسوا نہ کرنا۔ انہوں نے کہا: ''میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں''۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے شادی کر لی۔

یہ روایت حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اصابہ میں ابن مندہ [1] سے نقل کر کے لکھا ہے کہ ''اس کی سند صحیح ہے'' ابن سعد میں بھی یہ روایت مذکور ہے ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت بھی کی ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد نے ان کا زرفدیہ ادا کیا اور جب وہ آزاد ہو گئیں تو آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔

اس نکاح کا اثر

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ ﷺ نے نکاح کیا تو تمام اسیران جنگ جو اہل فوج کے حصہ میں آ گئے تھے، دفعتاً رہا کر دیے گئے۔ فوج نے کہا کہ جس خاندان میں رسول اللہ ﷺ نے شادی کر لی وہ غلام نہیں ہو سکتا۔ [2]

واقعۂ افک

واقعہ افک یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی وہ اسی لڑائی سے واپسی میں پیش آیا تھا۔ احادیث اور سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا ہے۔ لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سننے کے ساتھ لوگوں نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ''بالکل افترا ہے'' اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ اس واقعہ سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ محض جھوٹ اور بیہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی۔ لیکن بعض مسلمان بھی دھوکے میں آ گئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی۔ جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

آج کل کے عیسائی مؤرخوں نے بھی قدیم منافقوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوش مسرت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آ گئی ہے۔ لیکن ہم ان سے توقع بھی یہی کر سکتے تھے۔ یہ تمام لڑائیاں اس عام جنگ کا پیش خیمہ تھیں جو تمام عرب اور یہود متفقہ قوت سے کرنا چاہتے تھے۔ اور جس کو جنگ احزاب کہتے ہیں۔

غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق یعنی تمام عرب کی متحدہ جنگ ذوالقعدہ ۵ ھ

بنونضیر [3] مدینہ سے نکل کر خیبر پہنچے تو انہوں نے ایک نہایت عظیم الشان سازش شروع کی۔ ان کے

---

[1] یہ ابوقلابہ کی مرسل روایت ہے ابن مندہ کی روایت دوسرے مفہوم کی اس سے قبل متصلاً مذکور ہے غالباً۔ مصنف کو اشتباہ اسی لیے ہوا۔

[2] سنن ابی داود، کتاب العتق (باب فی بیع المکاتب اذا فسخت المکاتبۃ: ۳۹۳۱) (س) [3] طبری میں ہے، کان الذی جر غزوۃ رسول اللہ الخندق فیما قیل ماکان من اجلاء رسول اللہ بنی النضیر عن دیارھم (ج ۳، ص: ۱۴۶۳) مغازی کی سب سے زیادہ معتبر کتاب مغازی موسیٰ بن عقبہ ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری (ج ۷، ص: ۳۰۱) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رؤسا میں سے سلام بن ابی الحقیق، حُیی بن اخطب، کنانہ بن الربیع وغیرہ مکہ معظمہ گئے اور قریش سے مل کر کہا ''اگر ہمارا ساتھ دو تو اسلام کا استیصال کیا جا سکتا ہے'' قریش اس کے لئے ہمیشہ تیار تھے، قریش کو آمادہ کر کے یہ لوگ قبیلہ غطفان کے پاس گئے اور ان کو لالچ دیا کہ خیبر کا نصف محاصل ان کو ہمیشہ دیا کریں گے۔ (اور یہ پہلے سے بھی تیار تھے، قصہ غزوہ معونہ میں یاد ہوگا کہ عامر رئیس قبیلہ نے اسی غطفان کے حملہ کی دھمکی دی تھی، [1] اس لئے یہ فوراً تیار ہو گئے)۔ بنو اسد غطفان کے حلیف تھے، غطفان نے ان کو لکھ بھیجا کہ تم بھی فوجیں لے کر آؤ۔ قبیلہ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی، اس تعلق سے انہوں نے بھی ساتھ دیا۔ بنو سعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا، اس بنا پر یہود نے ان کو بھی آمادہ کیا۔ غرض تمام قبائلِ عرب سے لشکر گراں تیار ہو کر مدینہ کی طرف بڑھا۔ فتح الباری میں تصریح ہے کہ ان کی تعداد (دس ہزار) تھی۔ [2]

یہ لشکر تین مستقل فوجوں [3] میں تقسیم کیا گیا۔ غطفان کی فوجیں [4] عیینہ بن حصن فزاری کی کمان میں تھیں جو عرب کا مشہور سردار تھا۔ بنو اسد طُلیحہ کی افسری میں تھے اور ابوسفیان بن حرب سپہ سالارِ کل تھا۔ [5]

آنحضرت ﷺ نے یہ خبریں سنیں تو صحابہ سے مشورہ کیا، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایرانی ہونے کی وجہ سے خندق کے طریقہ سے واقف تھے۔ انہوں نے رائے دی کہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا مصلحت نہیں۔ ایک محفوظ مقام میں لشکر جمع کیا جائے اور گرد خندق کھود لی جائے۔ خندق دراصل فارسی لفظ کندہ کا معرب ہے جس کے معنی کھودے گئے کے ہیں، کاف، ''خ'' سے اور ہائے ہوز قاف سے بدل گئی ہے جس طرح پیادہ سے بیدق ہو گیا ہے۔

تمام لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کئے گئے۔

مدینہ میں تین جانب مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا، جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا، صرف شامی رخ کھلا ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے تین ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اسی مقام میں خندق کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ ذوقعدہ ۵ھ کی ۸ تاریخ تھی۔

(گزشتہ سے پیوستہ) غزوۂ احزاب کے ذکر میں اس کی یہ عبارت نقل کی ہے: خرج حيى بن اخطب بعد قتل بنى النضير الى مكة يحرض قريشا على حرب رسول الله ﷺ وخرج كنانة بن الربيع بن ابى الحقيق يسعى فى بنى غطفان ويحضهم على قتال رسول الله ﷺ على ان لهم نصف تمر خيبر فاجابه عيينة بن حصن بن حذيفة بن بدر الفزارى الى ذلك وكتبوا الى حلفائهم من بنى اسد فا قبل اليهم طلحة بن خويلد فيمن اطاعه۔ الخ

[1] صحيح بخارى، كتاب المغازى، غزوة الرجيع: ۴۰۹۱۔ [2] طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۴۷، و فتح البارى، ج۷، ص: ۳۰۱ (س) [3] طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۴۷۔ (س) [4] افسروں کی یہ تفصیل پورے لشکر کی نہیں ہے بلکہ مصنف نے صرف مشہور قبائل کے فوجی افسروں کا تذکرہ کر دیا ہے اس سلسلہ میں مؤرخین نے دوسرے قبائل کے فوجی افسروں کے نام بھی بتائے ہیں چنانچہ بنو سلیم سفیان بن عبد شمس کی افسری میں تھے، قبیلہ اشجع کا سردار مسعود بن رخیلہ تھا بنو مرہ حارث بن عوف کے ماتحت تھے، حارث اور طلیحہ بعد کو مسلمان ہو گئے تھے، زرقانی، ج ۲، ص: ۱۲۱؛ طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۴۷ وفتح البارى، ج۷، ص: ۳۰۱ (س) [5] طبقات ابن سعد، ج۲، قسم اول، ص: ۴۷۔ (س)

آنحضرت ﷺ نے حدود خود قائم کیے۔ داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کی، خندق کا عمق پانچ گز رکھا گیا، بیس دن میں ۳ ہزار متبرک ہاتھوں سے انجام پائی۔

یاد ہوگا کہ جب مسجد نبوی بن رہی تھی تو سرورِ دو جہاں ﷺ مزدوروں کی صورت میں تھے، آج بھی وہی عبرت انگیز منظر ہے۔ جاڑے کی راتیں ہیں، تین تین دن کا فاقہ ہے، مہاجرین اور انصار اپنی پیٹھوں پر مٹی لادلاد کر پھینکتے ہیں اور جوش محبت میں ہم آواز ہو کر کہتے ہیں:

نحن الذی بایعوا محمدا علی الجهاد ما بقینا ابدا

سرور عالم بھی مٹی پھینک رہے ہیں، شکم مبارک پر گرد اٹ گئی ہے، اسی حالت میں زبان پر ہے:

والله لولا الله ما اهتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

فانزلن سکینة علینا و ثبت الاقدام ان لاقینا

ان الاُلی قد بغوا علینا اذا ارادوا فتنة ابینا

ابینا کا لفظ جب آتا تھا تو آواز زیادہ بلند ہو جاتی تھی اور مکرر کہتے [1] اس کے ساتھ انصار کے حق میں دعا بھی دیتے جاتے تھے اور یہ موزوں الفاظ زبان پر آتے تھے:

اللهم انه لاخیرا لا خیرا لاخرة فبارك فی الانصار والمهاجرة

پتھر کھودتے کھودتے اتفاقاً ایک سخت چٹان آ گئی، کسی کی ضرب کام نہیں دیتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، تین دن کا فاقہ تھا اور پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے دست مبارک سے پھاوڑا مارا تو چٹان ایک تودۂ خاک تھی۔ [2]

سلع کی پہاڑی کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی گئی، مستورات شہر کے محفوظ قلعوں میں بھیج دی گئیں، چونکہ بنوقریظہ کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے حضرت سلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہ ۲۰۰ آدمیوں کے ساتھ متعین کئے گئے کہ ادھر سے حملہ نہ ہونے پائے۔

بنوقریظہ کے یہود اب تک الگ تھے لیکن بنونضیر نے ان کے ملا لینے کی کوشش کی۔ حیی بن اخطب (حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا باپ) خود قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا، اس نے ملنے سے انکار کیا، حیی نے کہا: "میں فوجوں کا دریائے بیکراں لایا ہوں، قریش اور تمام عرب امنڈ آیا ہے اور ہر ایک محمد ﷺ کے خون کا پیاسا ہے۔ یہ موقع ہاتھ سے دیے جانے کے قابل نہیں، اب اسلام کا خاتمہ ہے" کعب اب بھی راضی نہ تھا، اس نے کہا: میں نے محمد ﷺ کو ہمیشہ صادق الوعد پایا، ان سے عہد شکنی کرنا خلاف مروت ہے لیکن حیی کا جادو رائیگاں نہیں جا سکتا تھا۔

آنحضرت ﷺ کو یہ حال معلوم ہوا تو تحقیق اور اتمام حجت کے لئے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق وهی الاحزاب: ٤١٠٤، ٤١٠٦۔
[2] ایضا: ٤١٠٠، ٤١٠١۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور فرما دیا کہ اگر درحقیقت بنوقریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہو، تو وہاں سے آ کر اس خبر کو مبہم لفظوں میں بیان کرنا کہ لوگوں میں بے دلی نہ پھیلنے پائے، دونوں صاحبوں نے بنوقریظہ کو معاہدہ یاد دلایا، تو انہوں نے کہا: ''ہم نہیں جانتے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں اور معاہدہ کیا چیز ہے۔''

غرض بنوقریظہ نے اس بے شمار فوج میں اور اضافہ کر دیا۔ قریش، یہود اور قبائل عرب کی ۲۴ ہزار فوجیں تین حصوں میں تقسیم ہو کر مدینہ کے تین طرف اس زور وشور سے حملہ آور ہوئیں کہ مدینہ کی زمین دہل گئی۔

اس معرکہ کی تصویر خود اللہ تعالیٰ نے کھینچی ہے:

﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۱۰۔۱۱)

''جب دشمن اوپر کی طرف اور نشیب کی طرف سے آ پڑے اور جب آنکھیں ڈگنے لگیں اور کلیجے منہ میں آ گئے اور تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے تب مسلمانوں کی جانچ کا وقت آیا اور وہ بڑے زور کے زلزلے میں ڈال دیئے گئے۔''

فوج اسلام میں منافقوں کی تعداد بھی شامل تھی، جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے، لیکن موسم کی سختی، رسد کی قلت، متواتر فاقے، راتوں کی بے خوابی، بیشمار فوجوں کا ہجوم، ایسے واقعات تھے جنہوں نے ان کا پردہ فاش کر دیا۔ آ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگنی شروع کی کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں، ہم کو شہر میں واپس چلے جانے کی اجازت دی جائے:

﴿ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا۔ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۱۳)

''کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں بلکہ ان کو بھاگنا مقصود ہے۔''

لیکن جان نثاران اسلام کا طلائے اخلاص اسی کسوٹی پر آزمانے کے قابل تھا:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۔ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۲)

''جب مسلمانوں نے قبائل کی فوجیں دیکھیں تو بول اٹھے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ اللہ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور اللہ اور اس کا رسول دونوں سچے تھے اور اس بات نے ان کے یقین اور اطاعت کو اور بھی بڑھا دیا۔''

تقریباً ایک مہینہ تک اس سختی سے محاصرہ قائم رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر تین تین فاقے گزر گئے۔ ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم نے بے تاب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر

بندھے ہیں۔لیکن جب آپ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے۔ [1] محاصرہ اس قدر شدید اور پرخطر ہو گیا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا: ''کہ کوئی ہے، جو باہر نکل کر محاصرین کی خبر لائے۔'' تین دفعہ آپ نے یہ الفاظ فرمائے، لیکن حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی، آنحضرت ﷺ نے اسی موقع پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ''حواری'' کا لقب دیا۔ [2]

محاصرین نے ادھر تو خندق کا محاصرہ کر رکھا تھا، ادھر دوسری سمت اس غرض سے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے اہل وعیال یہیں قلعوں میں پناہ گزین تھے۔

محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے اس لئے دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے۔آنحضرت ﷺ نے خندق کے مختلف حصوں پر فوجیں تقسیم کر دی تھیں جو محاصرین کے حملوں کا مقابلہ کرتیں اور ایک حصہ خود آپ کے اہتمام میں تھا۔

محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپ کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو انصار ہمت ہار جائیں اس لئے آپ نے غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ان کو دے دیا جائے۔سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کو جو رؤسائے انصار تھے بلا کر مشورہ کیا۔دونوں نے عرض کی کہ اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرات نہ کر سکا اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔یہ استقلال دیکھ کر آپ کو اطمینان ہوا۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے معاہدہ کا کاغذ ہاتھ میں لے کر تمام عبارت مٹادی [3] اور کہا ان لوگوں سے جو بن آئے کر دکھائیں۔

اب مشرکوں کی طرف سے حملہ کا یہ انتظام کیا گیا کہ قریش کے مشہور جنرل یعنی ابوسفیان، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، ضرار بن الخطاب اور جبیرہ کا ایک ایک دن مقرر ہوا۔ہر جنرل اپنی باری کے دن پوری فوج کو لے کر لڑتا تھا۔خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، لیکن خندق کا عرض چونکہ زیادہ نہ تھا اس لئے باہر سے پتھر اور تیر برساتے تھے۔چونکہ اس طریقہ میں کامیابی نہیں ہوئی اس لئے قرار پایا کہ اب عام حملہ کیا جائے۔تمام فوجیں یکجا ہوئیں، قبائل کے تمام سردار آگے آگے تھے۔خندق ایک جگہ سے اتفاقاً کم عریض تھی، یہ موقع حملہ کے لئے انتخاب کیا گیا۔عرب کے مشہور بہادروں یعنی ضرار، جبیرہ، نوفل اور عمرو بن عبدِ ود نے خندق کے اس

---

[1] سنن ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی ﷺ: ۲۳۷۱، عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھتے تھے جس سے کمر نہیں جھکنے پاتی تھی۔ترمذی: ۲۳۷۲۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق: ۴۱۱۳ وصحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل طلحۃ والزبیر: ۶۲۴۳۔ لیکن ابن ہشام میں اس موقع پر حضرت حذیفہ بن یمان کا نام ہے، اس لئے محدثین میں ان دونوں ناموں کے واقعوں کی تطبیق میں اختلاف ہے۔حافظ ابن حجر اور زرقانی نے بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ محاصرین میں سے قریش کی تحقیق حال کے لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور بنوقریظہ کی تحقیقِ خبر کے لئے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ گئے تھے۔یہ تفصیل واقدی اور نسائی نے اپنی روایتوں میں کی ہے، فتح الباری، ج ۷، ص: ۳۱۲؛ زرقانی، ج ۲، ص: ۱۳۸، (س) [3] طبری، ج ۳، ص: ۱۴۷۴۔

کنارے سے گھوڑوں کو مہمیز کیا تو اس پار تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو بن عبدود تھا، وہ ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ جنگ بدر میں زخمی ہو کر واپس چلا گیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لوں گا بالوں میں تیل نہ ڈالوں گا۔ اس وقت اس کی عمر ۹۰ برس کی تھی، تاہم سب سے پہلے وہی آگے بڑھا اور عرب کے دستور کے موافق پکارا کہ مقابلہ کو کون آتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر کہا: ”میں۔“ لیکن آنحضرت ﷺ نے روکا کہ یہ عمرو بن عبدود ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے۔ لیکن عمرو کی آواز کا اور کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا، عمرو نے دوبارہ پکارا اور پھر وہی صرف ایک صدا جواب میں تھی۔ تیسری دفعہ جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”کہ یہ عمرو ہے۔“ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے۔ غرض آپ نے اجازت دی خود دست مبارک سے تلوار عنایت کی، سر پر عمامہ باندھا۔

عمرو کا قول تھا کہ کوئی شخص دنیا میں اگر مجھ سے تین باتوں کی درخواست کرے تو ایک ضرور قبول کروں گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ تیرا قول ہے۔ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ	میں درخواست کرتا ہوں کہ تو اسلام لا۔
عمرو	یہ نہیں ہو سکتا۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ	لڑائی سے واپس چلا جا۔
عمرو	میں خاتونانِ قریش کا طعنہ نہیں سن سکتا۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ	مجھ سے معرکہ آرا ہو۔

عمرو ہنسا اور کہا: مجھ کو امید نہ تھی کہ آسمان کے نیچے یہ درخواست بھی میرے سامنے پیش کی جائے گی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیادہ تھے۔ عمرو کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ گھوڑے سے اتر آیا اور پہلی تلوار گھوڑے کے پاؤں پر ماری کہ کونچیں کٹ گئیں۔ پھر پوچھا کہ تم کون ہو؟ آپ نے نام بتایا، اس نے کہا: میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ آپ نے فرمایا: ”ہاں، لیکن میں چاہتا ہوں۔“ عمرو اب غصہ سے بیتاب تھا۔ پرتلے سے تلوار نکالی اور آگے بڑھ کر وار کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سپر پر روکا لیکن تلوار سپر میں ڈوب کر نکل آئی اور پیشانی پر لگی، گو زخم کاری نہ تھا۔ تاہم یہ طغرا آپ کی پیشانی پر یادگار رہ گیا۔ قاموس میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ذو القرنین بھی کہتے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی پیشانی پر دو زخموں کے نشان تھے، ایک عمرو کے ہاتھ کا اور ایک ابن ملجم کا۔ دشمن کا وار ہو چکا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وار کیا، ان کی تلوار شانہ کاٹ کر نیچے اتر آئی، ساتھ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا۔ عمرو کے بعد ضرار اور جبیرہ نے حملہ کیا لیکن جب ذوالفقار کا ہاتھ بڑھا تو پیچھے ہٹنا پڑا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ضرار کا تعاقب کیا، ضرار نے مڑ کر برچھے کا وار کرنا چاہا لیکن روک لیا اور کہا ”عمر! اس احسان کو یاد رکھنا۔“

نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گرا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے تیر مارنے شروع کئے۔اس نے کہا: ''مسلمانو! میں شریفانہ موت چاہتا ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی درخواست منظور کی اور خندق میں اتر کر مارا کہ شریفوں کے شایان تھا۔'' ❶

حملہ کا یہ دن بہت سخت تھا تمام دن لڑائی رہی کفار ہر طرف سے تیر اور پتھروں کا مینہ برسا رہے تھے اور ایک دم کے لئے یہ بارش تھمنے نہ پاتی تھی۔یہی دن ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی متصل ❷ چار نمازیں قضا ہوئیں، متصل تیراندازی اور سنگ باری سے جگہ سے ہٹنا ناممکن تھا۔

مستورات جس قلعہ میں تھیں بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھا۔یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے قلعہ پر حملہ کیا۔ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (آنحضرت ﷺ کی پھوپھی) نے دیکھ لیا۔مستورات کی حفاظت کے لئے حضرت حسان رضی اللہ عنہ (شاعر) متعین کر دیے گئے تھے، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ اتر کر اس کو قتل کر دو، ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا۔حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا جس نے ان میں اس قدر جبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔اس بنا پر اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا کہ میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا؟ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی اور اتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ سر پھٹ گیا۔حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا چلی آئیں اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ۔حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا جانے بھی دیجئے مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے کہا اچھا جاؤ اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو کہ یہودی مرعوب ہو جائیں۔لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہی کو انجام دینا پڑی۔یہودیوں کو یقین ہوا کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعین ہے اس خیال سے پھر انہوں نے حملہ کی جرأت نہ کی۔ ❸

محاصرہ جس قدر طویل ہوتا جاتا تھا محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے جاتے تھے۔دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا، پھر کہ باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آ گیا، خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ گئیں، کھانے کے دیگچے چولہوں پر الٹ الٹ جاتے تھے۔اس واقعہ نے فوجوں سے بڑھ کر کام دیا۔اسی بنا پر قرآن مجید نے اس بادصرصر کو عسکر الٰہی سے تعبیر کیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا

❶ یہ حالات اگرچہ اجمالاً تمام کتابوں میں ہیں لیکن ہم نے جو تفصیل لکھی ہے ابن سعد، قسم اول، ج ۲، ص: ۴۹ وما بعد اور خمیس غزوۂ خندق مبارزۂ علی، ج ۱، ص: ۴۸۷ سے ماخوذ ہے۔ ❷ اس امر میں محدثین میں سخت اختلاف ہے کہ چار نمازیں قضا ہوئیں یا ایک اور چار قضا ہوئیں تو ایک ہی دن یا کئی دن، یا کئی دن کی ملا کر، زرقانی میں یہ بحث مفصل ہے۔

❸ زرقانی بحواله طبرانی وبزار ابویعلیٰ بسند (حسن) دیکھو ص: ۱۲۹ ج ۲ وابن ہشام، ج ۲، ص: ۱۶٤۔

﴿وَجُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا﴾ (۳۳/ الاحزاب:۹)

''مسلمانو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب کہ تم پر فوجیں آ پڑیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں۔''

نعیم بن مسعود اشجعی رضی اللہ عنہ ایک غطفانی رئیس تھے۔ قریش اور یہود دونوں ان کو مانتے تھے۔ وہ اسلام لا چکے تھے لیکن کفار کو ابھی اس کا علم نہ تھا۔ انہوں نے قریش اور یہود سے الگ الگ جا کر اس قسم کی باتیں کیں جس سے دونوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ نعیم رضی اللہ عنہ نے اس تفرقہ اندازی میں دونوں سے ایسی باتیں کہیں جن سے دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو جائیں اور اس بنا پر کہیں کہ خود آنحضرت ﷺ نے ''الحرب خدعة'' کی تعلیم کی تھی۔ لیکن ابن اسحاق نے روایت کی سند نہیں نقل کی اور اگر کرتے بھی تو ابن اسحاق کا یہ پایہ نہیں کہ ایسا واقعہ محض ان کی سند سے قبول کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ واقعات اس قسم کے جمع تھے کہ دونوں فریقوں کا اتحاد بغیر اس کے توڑ دیا جا سکتا تھا کہ کوئی غلط بات بیان کی جائے۔ ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس قدر مذکور ہے کہ نعیم نے یہود سے کہا کہ قریش تو چار دن کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔ تمہارا اور مسلمانوں کا ہم وطنی کا ساتھ ہے۔ اس لئے تم کیوں بیچ میں پڑ کر ہمیشہ کے لئے لڑائی مول لیتے ہو اور اگر اس پر آمادہ ہی ہو تو قریش سے کہو کہ وہ کچھ معزز آدمی ضمانت کے طور پر تمہارے ہاں بھجوا دیں کہ اگر قریش لڑائی کا فیصلہ کئے بغیر جانا چاہیں تو تم ان لوگوں کو روک لینا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہود بنو قریظہ اول اول نقض عہد پر راضی نہ تھے اور کہتے تھے کہ ہم محمد ﷺ سے معاہدہ کیوں توڑیں لیکن حیی بن اخطب نے اسی شرط پر ان کو راضی کیا تھا کہ ''قریش چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں گا۔'' قریش اس قسم کی ضمانت نہیں منظور کر سکتے تھے اس لئے جب انہوں نے انکار کیا ہوگا تو دونوں میں خود پھوٹ پڑ گئی ہوگی۔ اس کے لئے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو دروغ بیانی کی کیا ضرورت تھی؟ [1]

بہر حال موسم کی سختی، محاصرہ کا امتداد، آندھی کا زور، رسد کی قلت اور یہود کی علیحدگی، یہ تمام اسباب

---

[1] مصنف کے اس قیاس کی تائید مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے ہوتی ہے (کتاب المغازی، ص:۳۶۲) جس کو مختصراً مصنف ابن ابی شیبہ میں اور تفصیل کے ساتھ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ اس روایت کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں شرکت اسی شرط کے ساتھ کی تھی کہ قریش ضمانت کے طور پر اپنے کچھ معزز آدمی بنو قریظہ کے سپرد کریں گے لیکن انہوں نے اپنی یہ شرط پوری نہیں کی اور اس لئے ان کے دل میں قریش کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہوئی اور انہوں نے خفیہ رسول اللہ ﷺ کو اس شرط کے ساتھ مصالحت کا پیغام بھیجا کہ بنو نضیر کو جو خیبر کو جلا وطن کر دیے گئے تھے پھر مدینہ آنے کی اجازت دے دی جائے۔ نعیم بن مسعود ثقفی جو اسی موقع پر مسلمان ہونے آئے تھے ایک ایسے آدمی تھے جو پیٹ کے ہلکے تھے۔ حضور انور ﷺ نے ان سے دانستہ راز کے طور پر بنو قریظہ کے اس مخفی پیغام کا ذکر فرما دیا انہوں نے جا کر یہ قریش تک پہنچایا۔ اس سے قریش کو بنو قریظہ سے بدگمانی پیدا ہوگئی اور اس طرح قریش اور بنو قریظہ کے اتفاق کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق: ۳۷۹٦۵، والبدایه والنهایه ابن کثیر، ج ٤، ص: ۱۱۳، مصر۔(س)۔

ایسے جمع ہو گئے تھے کہ قریش کے پائے ثبات اب ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ ابوسفیان نے فوج سے کہا، رسد ختم ہو چکی، موسم کا یہ حال ہے، یہود نے ساتھ چھوڑ دیا، اب محاصرہ بے کار ہے، یہ کہہ کر طبل رحیل بجنے کا حکم دیا۔ غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے، بنوقریظہ محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا افق ۲۰۔۲۲ دن تک غبار آلود رہ کر صاف ہو گیا۔

﴿ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۲۵)

''اور اللہ نے کافروں کو غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کو کچھ ہاتھ نہ آیا اور مسلمانوں کو لڑنے کی نوبت نہ آنے دی۔''

اس معرکہ میں فوج اسلام کا جانی نقصان کم ہوا، لیکن انصار کا سب سے بڑا بازو ٹوٹ گیا، یعنی حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ اوس کے سردار تھے زخمی ہوئے اور پھر جان بر نہ ہو سکے ان کے زخم کھانے کا واقعہ مؤثر اور عبرت انگیز ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جس قلعہ میں پناہ گزین تھیں، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی ماں بھی وہیں ان کے ساتھ تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں قلعہ سے نکل کر باہر پھر رہی تھی، عقب سے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی، مڑ کر دیکھا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہاتھ میں حربہ لئے جوش کی حالت میں بڑی تیزی سے بڑھے جا رہے ہیں اور یہ شعر زبان پر ہے:

لبث قليلا يشهد الهيجا جمل [1] لا بأس بالموت اذا لموت نزل

''ذرا ٹھہر جانا کہ لڑائی میں ایک اور شخص پہنچ جائے وقت جب آ گیا تو موت سے کیا ڈر ہے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی ماں نے سنا تو پکاریں بیٹا دوڑ کر جا تو نے دیر لگا دی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی زرہ اس قدر چھوٹی تھی کہ ان کے دونوں ہاتھ باہر تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سعد رضی اللہ عنہ کی ماں سے کہا: کاش سعد رضی اللہ عنہ کی زرہ لمبی ہوتی، اتفاق یہ کہ ابن العرقہ نے تاک کر کھلے ہوئے ہاتھ پر تیر مارا جس سے اکحل کی رگ کٹ گئی خندق کا معرکہ ہو چکا تو آنحضرت ﷺ نے ان کے لئے مسجد کے صحن میں ایک خیمہ کھڑا کرایا اور ان کی تیمارداری شروع کی۔ [2] اس لڑائی میں رفیدہ ایک خاتون شریک تھیں جو اپنے پاس دوائیں رکھتی تھیں

---

[1] ابن ہشام، ج ۲، ص: ۱۶۳ وطبری، ج ۳، ص: ۱۴۷۷ وخمیس، ج ۱، ص: ۴۸۸۔ مگر تینوں کتابوں میں دوسرا مصرعہ اس طرح ہے، ع…… لا بأس بالموت اذا حان الاجل۔ ''ک، س''۔

[2] یہ خمیس کا بیان ہے، ج ۱، ص: ۴۹۹ حافظ ابن حجر نے اصابہ (ذکر رفیدہ) میں امام بخاری کی ادب المفرد (باب کیف اصبحت: ۱۱۲۹) سے نقل کیا ہے کہ رفیدہ ایک خاتون تھیں جو زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ انہیں کے پاس علاج کے لئے رکھے گئے تھے۔ ابن سعد نے رفیدہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کا ایک خیمہ مسجد نبوی کے پاس تھا، اسی میں وہ بیماروں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔ صحیح بخاری میں بھی رفیدہ کے خیمہ اور ان کے جراح خانہ کا ذکر ہے، ج ۸، ص: ۸۱۔

اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ یہ خیمہ انہی کا تھا اور وہ علاج کی نگران تھیں آنحضرت ﷺ نے خود دست مبارک میں مشقص [1] لے کر داغا، لیکن پھر ورم کر آیا۔ دوبارہ داغا لیکن پھر فائدہ نہ ہوا۔ کئی دن کے بعد یعنی بنو قریظہ کی ہلاکت کے بعد زخم کھل گیا اور انہوں نے وفات پائی۔

بنو قریظہ کا خاتمہ

اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آغاز قیام میں یہود کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور ان کو جان و مال و مذہب ہر چیز میں امن و آزادی بخشی۔ لیکن جب قریش نے ان کو تحریض و تہدید کا خط لکھا تو وہ آمادۂ بغاوت ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں سے تجدید معاہدہ کرنی چاہی تو بنو نضیر نے انکار کیا اور وہ جلا وطن کر دیے گئے، لیکن بنو قریظہ نے نئے سرے سے معاہدہ کر لیا۔ [2] چنانچہ ان کو امن دے دیا گیا۔ صحیح مسلم میں ان واقعات کو اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

عن ابن عمر ان یهود بنی النضیر وقریظة حاربوا رسول الله ﷺ فاجلی رسول الله ﷺ بنی النضیر واقرّ قریظة ومنّ علیهم۔ [3]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بنو نضیر اور قریظہ کے یہود نے آنحضرت ﷺ سے لڑائی کی تو آپ نے بنو نضیر کو جلا وطن کر دیا اور قریظہ کو رہنے دیا اور ان پر احسان کیا۔''

بنو نضیر جب جلا وطن ہوئے تو ان کے رئیس الاعظم حیی بن اخطب، ابو رافع سلام، ابن ابی الحقیق خیبر میں جا کر آباد ہوئے اور وہاں ریاست عام حاصل کر لی۔ جنگ احزاب ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ قبائل عرب میں دورہ کر کے تمام ملک میں آگ لگا دی اور قریش کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، اس وقت تک قریظہ معاہدہ پر قائم تھے، لیکن حیی بن اخطب نے ان کو بہکا کر توڑ لیا اور ان سے وعدہ کیا کہ خدانخواستہ اگر قریش حملہ سے دست بردار ہو کر چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر یہیں آ رہوں گا۔ چنانچہ اس نے یہ عہد وفا کیا۔

قریظہ نے احزاب میں علانیہ شرکت کی [4] اور شکست کھا کر ہٹ آئے تو اسلام کے سب سے بڑے دشمن حیی بن اخطب کو ساتھ لائے۔ [5]

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے احزاب سے

---

[1] مسلم، کتاب السلام، باب لکل داء دواء: ٥٧٤٨۔ [2] واقدی نے حیی بن اخطب کی زبانی بنو قریظہ کے اس معاہدہ سے ٹھہر جانے کے واقعہ کو ان کی سازشی چال ظاہر کیا ہے حیی بن اخطب نے کہا کہ وہ اس لیے ٹھہر گئے ہیں، تا کہ موقع پا کر کفار سے مل کر مسلمانوں پر حملہ کر سکیں۔ مغازی واقدی، ص: ٣٦٢ کلکتہ (س) [3] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب اجلاء الیهود من الحجاز: ٤٥٩٢۔ [4] سر ولیم میور صاحب ارباب سیر کی یہ روایت تسلیم نہیں کرتے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں کوئی عملی حصہ لیا تھا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید میں جہاں احزاب کا ذکر ہے وہاں اس کا ذکر ضرور ہوتا لیکن قرآن میں صاف یہ الفاظ ہیں: ﴿وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ﴾ مظاہرۃ (امداد) سے بڑھ کر اور کون سا لفظ درکار ہے۔

[5] طبری، (ج ٣، ص: ١٤٨٧ س) وابن هشام، ص: ١٤٦، ج ٢۔

فارغ ہو کر حکم دیا کہ ابھی لوگ ہتھیار نہ کھولیں اور قریظہ کی طرف بڑھیں۔ قریظہ اگر صلح و آشتی سے پیش آتے تو قابلِ اطمینان تصفیہ کے بعد ان کو امن دیا جاتا، لیکن وہ مقابلہ کا فیصلہ کر چکے تھے۔ فوج سے آگے بڑھ کر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے قلعوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے علانیہ آنحضرت ﷺ کو (نعوذ باللہ) گالیاں دیں۔ [1] غرض ان کا محاصرہ کیا گیا اور تقریباً ایک مہینے محاصرہ رہا۔ بالآخر انہوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور ان کا قبیلہ (اوس) قریظہ کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ عرب میں یہ تعلق ہم نسبی سے بڑھ کر تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی درخواست منظور کی۔

قرآن مجید میں جب تک کوئی خاص حکم نہیں آتا تھا۔ آنحضرت ﷺ تورات کے احکام کی پابندی فرماتے تھے۔ چنانچہ اکثر مسائل مثلاً: قبلۂ نماز، رجم، قصاص بالمثل وغیرہ وغیرہ میں جب تک خاص وحی نہیں آئی، آنحضرت ﷺ نے تورات ہی کی پابندی فرمائی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جو فیصلہ کیا یعنی یہ کہ لڑنے والے قتل کئے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے [2]۔ تورات کے مطابق تھا۔ تورات کتاب تثنیہ، اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے۔

> ''جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے، اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا اللہ تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں، سب تیرے لئے مالِ غنیمت ہوں گی۔''

احادیث میں مذکور ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب یہ فیصلہ کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کہ تم نے یہ آسمانی فیصلہ کیا۔ یہ اسی تورات کے حکم کی طرف اشارہ تھا۔ یہودیوں کو جب یہ حکم سنایا گیا تو جو فقرے ان کی زبان سے نکلے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اسی فیصلہ کو حکمِ الٰہی کے موافق سمجھتے تھے۔

حیی بن اخطب جو ان تمام فتن کا بانی تھا، مقتل میں لایا گیا تو آنحضرت ﷺ کی طرف اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور یہ فقرے کہے:

---

[1] طبری، ج ۳، ص: ۱٤۸٥، (س) میں ہے: حتی اذادنامن الحصون سمع منها مقالة قبيحة لرسول الله ﷺ منهم۔

[2] صحیح مسلم، باب جواز قتال من نقض العهد......الخ: ٤٥٩٩۔ (س) نیز بخاری، کتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب: ٤١١٧ تا ٤١٢٢۔ (س) میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے۔ مسٹر مارگولیتھ صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو اس جنگ میں ایک قریظی نے تیر سے زخمی کیا تھا جس سے وہ بالآخر ہلاک ہو گئے اس لیے انہوں نے بنو قریظہ کی نسبت ایسا بے رحمانہ فیصلہ کیا لیکن وہ تیر انداز ابن العرقہ قریشی تھا قریظی نہ تھا۔ صحیح بخاری و مسلم میں صاف تصریح ہے۔

اما واللہ ما لُمت نفسی فی عداوتك ولکنه من یخذل اللہ یخذل۔

''ہاں اللہ کی قسم! مجھ کو اس کا افسوس نہیں کہ میں نے کیوں تیری عداوت کی لیکن بات یہ ہے کہ جو شخص اللہ کو چھوڑ دیتا ہے، اللہ بھی اس کو چھوڑ دیتا ہے۔''

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

ایھا النـاس انه لا باس بامر اللہ کتاب وقدر وملحمة کتبھا اللہ علی بنی اسرائیل۔ [1]

''لوگو! اللہ کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں، یہ ایک حکم الٰہی تھا، یہ لکھا ہوا تھا، ایک سزا تھی، جو اللہ نے بنو اسرائیل پر لکھی تھی۔''

حیی بن اخطب کی نسبت یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جب وہ جلاوطن ہو کر خیبر جا رہا تھا تو اس نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی مخالفت پر کسی کو مدد نہ دے گا۔ [2] اس معاہدہ پر اس نے اللہ کو ضامن کیا تھا لیکن احزاب میں اس نے اس معاہدہ کی جس طرح تعمیل کی اس کا حال ابھی گزر چکا۔

بنوقریظہ کے متعلق مخالفین اسلام نے بڑے زور کے ساتھ ظلم و بے رحمی کا اعتراض کیا ہے لیکن واقعات حسب ذیل ہیں:

① آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں آ کر ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا جس میں ان کے مذہب کو پوری آزادی دی گئی اور جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا۔

② بنوقریظہ رتبہ میں بنونضیر سے کم تھے، یعنی بنونضیر کا کوئی آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تو اس کو صرف آدھا خون بہا دینا پڑتا بخلاف اس کے بنوقریظہ پورا خون بہا ادا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے قریظہ پر یہ احسان کیا کہ ان کا درجہ بنونضیر کے برابر کر دیا۔ [3]

③ آنحضرت ﷺ نے بنونضیر کی جلاوطنی کے وقت بنوقریظہ سے دوبارہ تجدید معاہدہ کی۔

④ باوجود ان باتوں کے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب میں شریک ہوئے۔

⑤ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن قلعہ میں حفاظت کے لئے بھیج دی گئی تھیں، ان پر حملہ کرنا چاہا۔

⑥ حیی بن اخطب جو بغاوت کے جرم میں جلاوطن کر دیا گیا تھا جس نے تمام عرب کو برانگیختہ کر کے جنگ احزاب قائم کر دی تھی، اس کو اپنے ساتھ لائے جو آتشِ جنگ کے اشتعال کا دیباچہ تھا۔

---

[1] یہ دونوں عبارتیں ابن ہشام (غزوہ بنی قریظہ، ج ۲، ص: ۱۷۱) میں ہیں، طبری، ج ۳، ص: ۱۴۹۴ میں بھی قریباً یہی الفاظ ہیں۔

[2] بلاذری مطبوعہ یورپ ص: ۲۲ (یہ روایت مصنف ابن ابی شیبه، کتاب المغازی، باب بنی قریظة میں بھی مذکور ہے، ج ۱۴، ص: ۴۲۵ دار السلفیہ بھنڈی بازار (س)

[3] ابو داود، کتاب الدیات، باب النفس بالنفس: ٤٤٩٤۔ (س)

ان حالات کے ساتھ بنوقریظہ کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جا سکتا تھا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عرب میں محالفت کا معاہدہ اخوت حقیقی کے برابر تھا۔ بنوقریظہ انصار کے حلیف تھے اور اسی بنا پر تمام انصار (اوس) نے ان کی نہایت الحاح کے ساتھ سفارش کی۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اوس کے سردار تھے اور دراصل معاہدہ کے وہی ذمہ دار تھے۔ وہ سخت کشمکش میں تھے۔ ان کے حلیفوں کی موت و حیات کا مسئلہ تھا جن کی حمایت پر کل انصار (اوس) مصر تھے۔ لیکن حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اس فیصلہ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟

مقتولین کی تعداد دیگر ارباب سیر نے ۶۰۰ سے زائد بیان کی ہے لیکن صحاح میں ۴۰۰ ہے۔ ان میں صرف ایک عورت تھی اور وہ اس قصاص میں ماری گئی تھی کہ اس نے قلعہ پر سے ایک پتھر گرا کر ایک مسلمان [1] (خلاد) کو قتل کر دیا تھا۔ اس عورت نے جس جرأت اور دلیری سے جان دی سنن ابی داؤد میں حسب ذیل [2] حیرت انگیز طریقہ سے مذکور ہے:

اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولین کی فہرست میں اس کا نام بھی ہے۔ قتل گاہ میں مجرم آتے اور عدم کو روانہ ہوتے جاتے تھے۔ ایک ایک کا نام پکارا جا رہا تھا اور یہ ہوش ربا صدا بار بار اس کے کانوں میں آتی تھی لیکن وہ بے تکلف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے باتیں کرتی جاتی اور بات بات پر ہنستی جاتی تھی۔ دفعتاً قاتل نے اس کا نام پکارا۔ وہ بے تکلف اٹھ کھڑی ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: کہاں؟ بولی: میں نے ایک جرم کیا تھا اس کی سزا اٹھانے جاتی ہوں، خوشی خوشی قتل گاہ میں آئی اور تلوار کے نیچے سر رکھ دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب اس واقعہ کو بیان کرتی تھیں تو نہایت حیرت کے لہجہ میں بیان کرتی تھیں۔

ریحانہ کا غلط واقعہ

متعدد ارباب سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قریظہ کے قیدیوں میں سے ایک یہودی عورت جس کا نام ریحانہ تھا، اس کی نسبت حکم دیا کہ الگ کر لی جائے اور پھر چند روز کے بعد اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ چنانچہ جن مؤرخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ لونڈیوں سے بھی متمتع ہوتے تھے۔ انہوں نے دو مثالیں پیش کی ہیں، ایک یہی ریحانہ اور دوسری ماریہ قبطیہ۔ عیسائی مؤرخوں نے اس واقعہ کو صحیح قرار دے کر نہایت ناگوار صورت میں دکھایا ہے۔ ایک مؤرخ نہایت طعن آمیز الفاظ میں لکھتا ہے کہ "بانی اسلام جب سات سو مقتولین کی لاشوں کے تڑپنے کا تماشا دیکھ چکا تو گھر پر آ کر تفریح خاطر کے لئے...... لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی غلط ہے۔

ریحانہ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں سب واقدی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں۔ لیکن واقدی نے بتصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا تھا، ابن سعد نے واقدی

---

[1] ابن هشام، غزوة بني قريظة، ج ۲، ص: ۱۷۲۔ [2] ابوداود، كتاب الجهاد، باب في قتل النساء: ۲۶۷۱۔ (س)۔

کی جو روایت نقل کی ہے، اس میں خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فاعتقنی وتزوج بی. ”پھر آنحضرت ﷺ نے مجھ کو آزاد کر دیا اور مجھ سے نکاح کر لیا۔“

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں محمد بن الحسن کی تاریخ مدینہ سے جو روایت نقل کی ہے، اس کے یہ الفاظ ہیں:

وکانت ریحانة القرظیة زوج النبی ﷺ تسکنه۔

”اور ریحانہ قرظیہ جو آنحضرت ﷺ کی زوجہ (محترم) تھیں اس مکان میں رہتی تھیں۔“

حافظ ابن مندہ کی کتاب (طبقات الصحابہ) تمام محدثین مابعد کا ماخذ ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں: [1]

واستسرٰی ریحانة من بنی قریظة ثم اعتقها فلحقت باهلها واحتجبت وهی عند اهلها۔

”ریحانہ کو گرفتار کیا اور پھر آزاد کر دیا تو وہ اپنے خاندان میں چلی گئیں اور وہیں پردہ نشین ہو کر رہیں۔“

حافظ ابن حجر اس عبارت کو نقل کر کے لکھتے ہیں: وهذه فائدة جليلة اغفلها ابن الاثير۔

حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان میں جا کر بیویوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں۔

ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے اور اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ حرم نبوی میں آئیں، تب بھی قطعاً وہ منکوحات میں تھیں، کنیز نہ تھیں۔ [2]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح ۵ ھ

اس سال آنحضرت ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ نکاح ایک معمولی بات ہے اور اس کی تفصیل کا موقع ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا عنوان ہے لیکن اس واقعہ میں ایسے حالات جمع ہو گئے جنہوں نے مخالفین کے نزدیک اس کو ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا دیا۔ عیسائی مؤرخوں نے اس واقعہ کو نہایت آب ورنگ سے لکھا ہے اور آنحضرت ﷺ کی تنقیص ونکتہ چینی (العیاذ باللہ) کے لئے ان کے نزدیک اور کوئی واقعہ بکار

---

[1] دیکھو اصابہ فی تمییز الصحابہ ذکر ریحانة، ج ۸، ص:۸۸۔(س) [2] حضرت ریحانہ کے متعلق کتب سیر میں تین قسم کی روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر پردہ نشین ہو کر رہیں۔ یہ روایت ابن مندہ کی ہے۔ مگر اس کی تائید میں کوئی دوسری روایت نہیں۔ دوسری قسم کی روایت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر کے مثل دیگر امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے رکھنا چاہا مگر انہوں نے اس کی غیر معمولی ذمہ داری محسوس کر کے باندی بن کر حضور انور کی خدمت میں رہنا قبول کیا، یہ روایت ابن اسحاق کی ہے۔ تیسری قسم کی روایت یہ ہے کہ حضور انور ﷺ نے ان کو مختار بنا دیا تو انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ یہ روایت واقدی کی ہے۔ ابن سعد نے واقدی سے مختلف سلسلوں سے اسی روایت کو ذکر کیا ہے اور واقدی نے اسی کو اثبت کہا ہے۔ دیکھئے کتاب البدایہ ابن کثیر، ج ۵، ص:۳۰۵ اور امام زہری نے بھی زوجیت ہی کی تائید کی ہے، بحوالہ سابق۔ تفصیل کے لئے دیکھئے اصابہ ذکر ریحانة، ج ۸، ص:۸۸۔ (س)۔

آمد نہیں ہو سکتا۔ ہم اس واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں جس سے اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات پر نکتہ چینی کا موقع جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے اس کا اصلی مخرج کیا ہے؟

آنحضرت ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کو جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے متبنیٰ بنا لیا تھا۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو آپ نے ان کی شادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے کرنی چاہی جو آنحضرت ﷺ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں، (ان کی ماں امیمہ۔ عبدالمطلب کی بیٹی تھیں) لیکن چونکہ وہ غلام رہ چکے تھے اس لئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو یہ نسبت گوارا نہ تھی:

وکان رسول اللہ ﷺ اراد ان یزوجھا زید بن حارثۃ مولاہ فکرھت ذلك۔ [1]

''آنحضرت ﷺ نے ان کا نکاح اپنے غلام زید سے کر دینا چاہا تو انہوں نے ناپسند کیا۔''

لیکن بالآخر آنحضرت ﷺ کی تعمیل ارشاد کے لحاظ سے راضی ہو گئیں، قریباً ایک سال تک حضرت زید رضی اللہ عنہ کے نکاح میں رہیں لیکن دونوں میں ہمیشہ شکررنجی (معمولی رنجش) رہتی تھی یہاں تک کہ زید نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر شکایت کی اور ان کو طلاق دینی چاہی۔

جاء زید بن حارثۃ فقال یارسول اللہ ان زینب اشتد علی لسانھا، وانا ارید ان اطلقھا۔ [2]

''زید آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ زینب رضی اللہ عنہا مجھ سے زبان درازی کرتی ہیں اور میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔''

لیکن آنحضرت ﷺ بار بار ان کو سمجھاتے تھے کہ طلاق نہ دیں، قرآن مجید میں ہے:

﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ﴾.

(۳۳/ الاحزاب:۳۷)

''اور جبکہ تم اس شخص سے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو نکاح میں لئے رہو اور اللہ سے خوف کرو۔''

لیکن کسی طرح صحبت برآ نہ ہو سکے اور آخر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ان کو طلاق دے دی، حضرت زینب رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی (پھوپھی زاد) بہن تھیں اور آپ ہی کی تربیت میں پلی تھیں۔ آپ کے فرمانے سے انہوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا جو ان کے نزدیک ان کے خلاف شان تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ جو مساواتِ اسلامی قائم کرنا چاہتے تھے اس میں آزاد و غلام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہرحال جب وہ مطلقہ ہو گئیں تو آپ نے ان کی دلجوئی کے لئے خود ان سے نکاح کر لینا چاہا۔ لیکن عرب میں اس وقت تک متبنیٰ اصلی بیٹے کے

---

[1] فتح الباری، تفسیر سورۃ احزاب، بحوالہ ابن ابی حاتم، ج۸، ص:۴۰۳۔

[2] فتح الباری، تفسیر سورۃ احزاب، بحوالہ روایت عبدالرزاق از معمر از قتادۃ، ج۸، ص:۴۰۳۔

برابر سمجھا جاتا تھا۔اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپ تامل فرماتے تھے۔ چونکہ یہ محض جاہلیت کی رسم تھی اوراس کا مٹانا مقصود تھا،اس لئے یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۷)

''اورتم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہوجس کو اللہ ظاہر کر دینے والا ہے اورتم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ ڈرنا اللہ سے چاہیے۔''

غرض آپ ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلیا اور جاہلیت کی ایک قدیم رسم کہ متبنّیٰ اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے مٹ گئی۔اس پر منافقوں اور بدگویوں نے بہت طعنے دیئے،لیکن امر حق کے اجرا میں مطاعن کا آماج گاہ بننا لازمی ہے۔

واقعہ کی اصلی اور سادہ حقیقت یہ تھی،مخالفوں نے اس واقعہ کوجس طرح بیان کیا ہے گوسرتاپا کذب وافترا ہے لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے رنگ آرائی کے لئے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے۔

تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ زید رضی اللہ عنہ سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے۔ زید رضی اللہ عنہ نہ تھے،زینب رضی اللہ عنہا کپڑے پہن رہی تھیں،اسی حالت میں آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھ لیا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے:

سبحان اللہ العظیم سبحان اللہ مصرف القلوب۔ [1]

''پاک ہے اللہ برتر،پاک ہے وہ اللہ جو دلوں کو پھیر دیتا ہے۔''

حضرت زید کو یہ حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ زینب رضی اللہ عنہا اگر آپ کو پسند آگئی ہوں تو میں ان کو طلاق دے دوں۔

میں نے یہ بیہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کر کے نقل کی ہے۔''نقلِ کفر کفر نہ باشد'' یہی روایت ہے جو عیسائی مؤرخوں کا مایۂ استناد ہے۔لیکن ان غریبوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصولِ فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے۔مؤرخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے جو مشہور کذاب اور دروغ گو ہے اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے۔

طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اس قسم کی بیہودہ روایتیں نقل کی ہیں۔لیکن محدثین نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے تعرض کیا جائے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سخت روایت پرست ہیں،تاہم فتح الباری (ج۸،ص:۴۰۳)(سورۂ احزاب کی تفسیر)میں جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے لکھتے ہیں:

ووردت آثار اُخری اخرجها ابن ابی حاتم والطبری ونقلها کثیرا من

[1] تاریخ طبری، آغاز واقعات ۵ھ ج۳،ص:۱۴۶۱۔

المفسرين لا ينبغي التشاغل بها۔

''اور بہت سی روایتیں آئی ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور اکثر مفسرین نے ان کو نقل کر دیا ہے، ان روایتوں میں مشغول نہ ہونا چاہیے۔''

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں، اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ذكر ابن ابی حاتم وابن جرير ههنا آثارًا عن بعض السلف احببنا ان نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها وقدروى الامام احمدههنا ايضًا من رواية حماد بن زيد عن ثابت عن انس فيه غرابة تركنا سياقه ايضًا۔ [1]

''ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض اسلاف سے چند روایتیں نقل کی ہیں جن کو ہم اس لئے نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ غلط ہیں اور امام احمد نے بھی اس واقعہ کے متعلق انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جو غریب ہے، ہم نے اس کا ذکر بھی چھوڑ دیا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت منافقوں کا بہت زور تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لوگوں نے جو تہمت لگائی، وہ بھی اسی سال کا واقعہ ہے۔ منافقین ان خبروں کو اس طرح پھیلاتے تھے کہ بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتی تھیں، یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت میں خود چند مسلمان بھی آلودہ ہو گئے جن کو شریعت کے موافق قذف کی سزا دی گئی۔ یہی روایتیں ہیں جو بچی کھچی غیر محتاط کتابوں میں باقی رہ گئیں۔ لیکن وہ محدثین جن کا معیارِ تحقیق بلند ہے اور عدالتِ روایت کے حاکمانِ مجاز ہیں، مثلاً: امام بخاری، امام مسلم وغیرہ، ان کے ہاں ان روایتوں کا ذکر تک نہیں آتا۔

واقعات متفرقہ ۵ھ

(اس سال کی تاریخ مذہبی میں سب سے اہم واقعات عورتوں کے متعلق متعدد احکام اصلاحی کا نزول ہے۔ اب تک مسلمان عورتیں عام جاہلانہ طریق سے چلتی پھرتی تھیں اور اسی قسم کے لباس و زیور پہنتی تھیں۔ اب حکم ہوا کہ شریف عورتیں گھر سے نکلیں تو ایک بڑی چادر اوڑھ کر گھونگھٹ نکال لیا کریں جس سے منہ بھی چھپ جائے، آنچل سینہ پر ڈال کر چلیں، پاؤں جھنک جھنک کر نہ چلیں، پردہ کی اوٹ سے بولیں۔ تصنع اور بناؤ کی بولی نہ بولیں، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لئے غیر مردوں کے سامنے آنا قطعاً ممنوع ہوا۔

منہ بولے لڑکے کی بیوی سے جاہلیت میں بیاہ ناجائز تھا۔ اس رسم کی اصلاح بھی اسی سال ہوئی۔ زنا کی سزا سو کوڑے بھی اسی سال نازل ہوئی، عفیف عورتوں پر الزام لگانا جاہلیت کا ایک معمولی فعل تھا اور ان کمزوروں کے پاس اس حملہ کے روکنے کے لئے کوئی قانونی سپر نہ تھی۔ اس سال ''حدِ قذف'' نازل ہوئی جس

[1] تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورۃ احزاب، ج۳، ص: ۴۹۱، مصر، ۱۹۳۷ء۔

کی رو سے بغیر شہادت کے تنہا اتہام جرم قرار دیا گیا، بصورتِ عدمِ وجودِ شہادت لعان کا طریقہ بتایا گیا، یعنی زن وشو دونوں اپنی سچائی اور فریق ثانی کی دروغ گوئی کا بحلف اظہار کریں اور اس کے بعد ان میں تفرقہ کر دیا جائے۔ [1]

عرب میں ایک قسم کی طلاق جاری تھی، جس کو "ظہار" کہتے ہیں۔ اس سال اس قسم کی طلاق غیر مؤثر قرار دی گئی اور اس کے لئے کفارہ مقرر کیا گیا۔ پانی نہ ملنے کی حالت میں تیمّم کی مشروعیت بھی اسی سال کا حکم ہے۔ بروایت صحیحہ نمازِ خوف کا حکم قرآن مجید میں اسی سال نازل ہوا، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی)۔

[1] بخاری، کتاب الطلاق، باب من جوز الطلاق الثلاث:٥٢٥٩ وسیرت گازرونی قلمی، ابوداود، کتاب الطلاق، باب فی اللعان:٢٢٥٣، ٢٢٥٧۔ نیز فتح الباری، ج ٢، ص: ١٠٦ دیکھنا چاہیے، یہ تمام احکام سورۂ نور میں بتقریب واقعۂ افک ٥ھ میں نازل ہوئے۔

۶ھ

صلح حدیبیہ وبیعت رضوان

ذوقعدہ ۶ھ

مکہ معظمہ سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے۔ جس کو حدیبیہ کہتے ہیں۔ گاؤں بھی اسی کنوئیں کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چونکہ معاہدہ صلح یہیں لکھا گیا، اس لئے اس واقعہ کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں یہ واقعہ نہایت اہم یعنی اسلام کی تمام آیندہ کامیابیوں کا دیباچہ ہے اور اسی بنا پر باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک صلح کا معاہدہ تھا اور صلح بھی بظاہر مغلوبانہ تھی، تاہم اللہ نے قرآن مجید میں اس کو فتح کا لقب دیا ہے۔

کعبہ اسلام کا اصلی مرکز تھا۔ اسلام کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کی تھی اور یہ لقب اسلام بھی انہی کی ایجاد ہے:

﴿ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ (۲۲/ الحج: ۷۸)

''ابراہیم (علیہ السلام) ہی ہیں جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔''

رسول اللہ ﷺ کو جو شریعت ملی تھی وہ کوئی نئی شریعت نہ تھی بلکہ وہی ابراہیمی شریعت تھی۔

﴿ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ (۲۲/ الحج۔۷۸)

''تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا مذہب۔''

زمانہ کے امتداد سے گو انہی کی اولاد بت پرست بن گئی تھی تاہم کعبہ جو ابراہیمی یادگار تھا عرب کا قبلہ گاہِ عام تھا۔ تمام عرب اس کو اپنا مشترک ورثہ آبائی سمجھتا تھا۔ نہ صرف وہ لوگ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان سے تھے، بلکہ وہ بھی جو قحطانی تھے اور جن کا سلسلہ نسب اس خاندان سے الگ تھا۔ عرب کے قبائل سال بھر آپس میں لڑتے رہتے تھے اور یہی غارت گریاں ان کی بقائے زندگی کا ذریعہ تھیں۔ کیونکہ ان کی معاش بھی اسی پر منحصر تھی۔ تاہم چار مہینے تک جو اشہر حرم کہلاتے تھے تمام لڑائیں بند ہو جاتیں اور قبائل عرب دور دور سے سفر کر کے آتے اور اس قبلہ گاہِ عام میں عبادت اور عقیدت کے رسوم بجالاتے تھے۔ وہ قبائل جن میں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے، یکجا جمع نظر آتے تھے اور شیر وشکر ہو کر ملتے تھے، گویا بھائی بھائی ہیں۔ مسلمان بہ جبر مکہ سے نکالے گئے تھے۔ لیکن یہ خیال ان کے دل سے نہیں گیا اور نہ جا سکتا تھا کہ کعبہ پر ان کا بھی کم از کم اسی قدر حق ہے جس قدر اور قبائل کا ہے۔ اس کے ساتھ مکہ سے مسلمانوں کو گونا گوں تعلقات تھے اور وہ ان کا قدیم اور محبوب وطن تھا۔ مکہ کی یاد ایک پھانس تھی جو ہر وقت ان کے کلیجے میں کھٹکتی رہتی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ مکہ میں اس

قدر ستائے گئے تھے تاہم ان کو جب مکہ یاد آتا تو روتے تھے اور پکار کر یہ اشعار پڑھتے تھے: 1

الا لیت شعری هل ابیتن لیلة	”آہ! کیا پھر بھی وہ دن آ سکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی میں
بواد وحولی اذخر وجلیل	ایک رات بسر کروں اور میرے پاس اذخر اور جلیل ہوں،
وهل اردن یوما میاه مجنة	اور کیا وہ دن بھی ہوگا کہ میں مجنة کے چشمہ پر اتروں
وهل یبدون لی شامة وطفیل	اور شامہ وطفیل مجھ کو دکھائی دیں۔“

اکثر مہاجرین جان بچا کر نکل آئے، لیکن خاندان اور بال بچے وہیں رہ گئے تھے۔

اسلام کے فرائضِ چہارگانہ میں حجِ کعبہ ایک رکنِ اعظم ہے۔ غرض مختلف اسباب سے آنحضرت ﷺ نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور احتمال نہ ہو۔ عمرہ 2 کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لئے۔ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے، صرف تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے، اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں بند ہو۔

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے۔ ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں ہمرکاب ہوئے، مقام ذوالحلیفہ پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہو گئیں یعنی قربانی کے اونٹ ساتھ تھے۔ ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگا دیے گئے۔

احتیاط کے لئے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادہ کی خبر لائے۔ جب قافلہ عُسفان کے قریب پہنچا اس نے آ کر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمد ﷺ مکہ میں کبھی نہیں آ سکتے۔

غرض قریش نے بڑے زور وشور سے مقابلہ کی تیاری کی۔ قبائلِ متحدہ کے پاس پیغام بھیجا اور جمعیت عظیم لیکر آئے۔ مکہ سے باہر بلدح ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں، خالد بن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے دوسو سوار لیکر جن میں ابو جہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقام غمیم تک آ گئے ہیں، اس لئے کترا کر داہنی طرف سے چلو۔“ فوجِ اسلام جب غمیم کے قریب پہنچ گئی تو خالد کو گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی، وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکرِ اسلام غمیم تک آ گیا۔ آنحضرت ﷺ آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر مقام کیا یہاں پانی کی قلت تھی۔ ایک کنواں تھا وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا لیکن اعجاز نبوی سے اس میں اس قدر پانی آ گیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

1 یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی مذکور ہیں، کتاب مناقب الانصار، باب مقدم النبی ﷺ واصحابه المدینة: ۳۹۲۶۔ (س)

2 وساق معه الهدی واحرم بالعمرة لیأمن الناس من حربه (ابن هشام، ج ۲، ص: ۲۱۰)

قبیلۂ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا لیکن اسلام کے حلیف اور راز دار تھے۔ قریش اور عام کفار اسلام کے خلاف جو منصوبے بناتے وہ ہمیشہ آنحضرت ﷺ کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقا تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے) ان کو آنحضرت ﷺ کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آ رہا ہے، وہ آپ ﷺ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم عمرہ [1] کی غرض سے آئے ہیں لڑنا مقصود نہیں۔ جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے۔ اور ان کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ ان کے لئے بہتر ہوگا کہ ایک مدت معین کے لئے صلح کر لیں اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی اگر وہ راضی نہیں تو اس اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور اللہ کو جو فیصلہ کرنا ہو کر دے۔'' بدیل نے جا کر قریش سے کہا کہ میں محمد ﷺ کے پاس سے پیغام لے کر آیا ہوں اجازت دو تو کہوں۔ چند شریر بول اٹھے کہ ہم کو محمد ﷺ کے پیغام سننے کی ضرورت نہیں لیکن سنجیدہ لوگوں نے اجازت دی۔ بدیل نے آنحضرت ﷺ کی شرطیں پیش کیں۔ عروہ بن مسعود ثقفی نے اٹھ کر کہا۔ کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں۔'' بولے ہاں۔ عروہ نے کہا میری نسبت تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں، سب نے کہا نہیں، عروہ نے کہا: ''اچھا تو مجھ کو اجازت دو میں خود جا کر معاملہ طے کروں محمد (ﷺ) نے معقول شرطیں پیش کی ہیں۔'' غرض آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے قریش کا پیغام سنایا اور کہا، محمد (ﷺ) فرض کرو کہ تم نے قریش کا استیصال کر دیا تو کیا اس کی اور بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود برباد کر دیا ہو؟ اس کے سوا اگر لڑائی کا رخ بدلا تو تمہارے ساتھ جو یہ بھیڑ ہے گرد کی طرح اڑ جائے گی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس بدگمانی پر اس قدر غصہ آیا کہ گالی دے کر کہا کہ کیا ہم محمد ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟ عروہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ابوبکر۔'' عروہ نے کہا: میں ان کی سخت کلامی کا جواب دیتا، لیکن ان کا ایک احسان میری گردن پر ہے جس کا بدلا ابھی تک میں انہیں ادا نہیں کر سکا۔

عروہ آنحضرت ﷺ سے بے تکلفانہ طریقہ سے گفتگو کر رہا تھا اور جیسا کہ عرب کا قاعدہ ہے کہ بات کرتے کرتے مخاطب کی ڈاڑھی پکڑ لیتے ہیں۔ وہ ریش مبارک پر بار بار ہاتھ ڈالتا تھا۔ مغیرہ بن شعبہ جو ہتھیار لگائے آنحضرت ﷺ کی پشت پر کھڑے تھے اس جرأت کو گوارا نہ کر سکے، عروہ سے کہا: ''اپنا ہاتھ ہٹا لے ورنہ یہ ہاتھ بڑھ کر واپس نہ جا سکے گا۔'' عروہ نے حضرت مغیرہ کو پہچانا اور کہا: ''او دغا باز! کیا میں تیری دغا بازی کے معاملہ میں تیرا کام نہیں کر رہا ہوں۔'' (حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے چند آدمی قتل کر دیے تھے جن کا خون بہا عروہ

---

[1] عمرہ گویا ایک چھوٹا سا حج ہے جس میں حج کی اکثر رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ یعنی اس میں حرم کے باہر میقات سے احرام باندھ کر صرف صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے اور بال منڈوائے یا کتروائے جاتے ہیں۔ (س)

نے اپنے پاس سے ادا کیا تھا)۔

عروہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے اس کے دل پر عجب اثر کیا۔ قریش سے جا کر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں۔ یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی۔ محمد ﷺ بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے، کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا، وہ وضو کرتے ہیں تو پانی جو گرتا ہے اس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے، بلغم یا تھوک گرتا ہے تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہرہ اور ہاتھوں میں مل لیتے ہیں۔ [1]

چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت خراش بن امیہ رضی اللہ عنہ کو قریش کے پاس بھیجا لیکن قریش نے ان کی سواری کے اونٹ کو جو خاص رسول اللہ ﷺ کی سواری کا تھا مار ڈالا اور خود ان پر بھی یہی گزرنے والی تھی لیکن قبائل متحدہ کے لوگوں نے بچالیا اور وہ کسی طرح جان بچا کر چلے آئے۔

اب قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو لیکن یہ لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ گو یہ سخت شرارت تھی لیکن رحمت عالم کا دامن عفو اس سے زیادہ وسیع تھا۔ آپ نے سب کو چھوڑ دیا اور معافی دے دی، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے: [2]

﴿ وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ﴾ (٤٨/ الفتح: ٢٤)

''وہ وہی اللہ ہے جس نے مکہ میں ان لوگوں کا ہاتھ تم سے اور تمہارا ہاتھ ان سے روک دیا، بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا۔''

بیعت رضوان

بالآخر آپ ﷺ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو انتخاب کیا لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے۔ آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں مکہ گئے اور آنحضرت ﷺ کا پیغام سنایا۔ قریش نے ان کو نظر بند کر لیا۔ لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''عثمان کے خون کا قصاص لینا فرض ہے۔'' یہ کہہ کر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم سے جان نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دستِ مبارک پر جان نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخِ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔ سورۂ فتح میں اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر ہے۔

[1] بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد والمصالحة مع اهل الحرب: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲ (س)۔

[2] ان آیتوں کی شان نزول میں سخت اختلاف ہے لیکن زیادہ معتبر یہی روایت ہے۔

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾ (٤٨/ الفتح:١٨)

''اللہ مسلمانوں سے راضی تھا جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔سو اللہ نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا۔تو اللہ نے ان پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی۔''

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی۔

قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ چنانچہ لوگوں نے ان کو ''خطیب قریش'' [1] کا خطاب دیا تھا۔قریش نے ان سے کہہ دیا صلح صرف اس شرط ہو سکتی ہے کہ محمد ﷺ اس سال واپس چلے جائیں۔

سہیل آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک صلح کے شرائط پر گفتگو رہی۔ بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا اور آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلم بند کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عنوان پر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا۔

عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتدا میں ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' لکھتے تھے۔''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' سے وہ آشنا نہ تھے،اس بنا پر سہیل بن عمرو نے کہا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا آگے کا فقرہ تھا ''هٰذا ما قاضى عليه محمد رسول الله'' یعنی''وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے تسلیم کیا۔''سہیل نے کہا:''اگر ہم آپ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا۔آپ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں۔''آنحضرت ﷺ نے فرمایا:''گو تم تکذیب کرتے ہو لیکن اللہ کی قسم میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔''یہ کہہ کر آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو،حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ کون فرمان گزار ہو سکتا تھا لیکن عالم محبت میں ایسے مقام بھی پیش آتے ہیں جہاں فرمانبرداری سے انکار کرنا پڑتا ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ہرگز آپ کا نام نہ مٹاؤں گا۔آپ ﷺ نے فرمایا:''اچھا مجھ کو دکھاؤ،میرا نام کہاں ہے۔''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس جگہ پر انگلی رکھ دی۔آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا۔ [2]

آنحضرت ﷺ کو لکھنا نہیں آتا تھا۔اسی بنا پر آپ کو''امی'' کہتے ہیں۔یہ واقعہ مسلم میں جہاں منقول ہے لکھا ہے کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر ابن عبداللہ لکھ دیا۔ بخاری میں چونکہ یہ واقعہ عام روایت کے خلاف ہے،اس لئے ایک معرکۃ الآراء مباحثہ بن گیا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام روزمرہ جب نظر

[1] زرقانی، ج ۲، ص: ۲۲۳ (س)۔ [2] صحیح بخاری کی اس روایت میں جو صلح حدیبیہ میں ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام اور ان کی گفتگو مذکور نہیں،یہ تصریح بخاری کی اس روایت میں ہے جو کہ کتاب المغازی، باب عمرة القضاء: ٤٢٥١ میں مذکور ہے: صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب صلح حدیبیه: ٤٦٢٩ تا ٤٦٣١ میں بھی یہ واقعہ منقول ہے۔

سے گزرتا رہتا ہے تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام کے حرف سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس سے امیت میں فرق نہیں آتا۔ بے شبہ امی ہونا آپ کا فخر ہے اور خود قرآن مجید میں یہ وصف شرف وعزت کے موقع پر استعمال ہوا ہے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۵۷)

شرائط صلح یہ تھیں

① مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

② اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

③ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں، وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جُلبّان (تھیلا وغیرہ) میں۔

④ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

⑤ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے [1] تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

⑥ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں، اتفاق یہ کہ عین اس وقت جبکہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا۔ سہیل کے صاحبزادے (ابو جندل رضی اللہ عنہ) جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے۔ سہیل نے کہا ''محمد (ﷺ)! صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے اس (ابو جندل رضی اللہ عنہ) کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دیدو۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ابھی معاہدہ قلم بند نہیں ہو چکا۔'' سہیل نے کہا: ''تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اچھا ان کو یہیں رہنے دو۔'' سہیل نے نامنظور کیا آپ ﷺ نے چند دفعہ اصرار کیا۔ لیکن سہیل کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً آنحضرت ﷺ کو تسلیم کرنا پڑا۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ کو کافروں نے اس طرح مارا تھا کہ ان کے جسم پر نشان تھے۔ مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے اور کہا، برادرانِ اسلام! کیا پھر مجھ کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں اسلام لا چکا ہوں، کیا پھر مجھ کو کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو؟ تمام مسلمان تڑپ اٹھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضبط نہ کر سکے۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں ہوں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا ہم حق پر نہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں ہم حق پر ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور اللہ کے حکم

[1] یہ تمام شرائط کتب سیر کے علاوہ صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب صلح الحديبية: ٤٦٢٩ تا ٤٦٣٢ میں بھی ہیں۔

کی نافرمانی نہیں کر سکتا اللہ میری مدد کریگا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "وہ اللہ کے پیغمبر ہیں جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔" (1) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں ان سے سرزد ہوئیں تمام عمر سخت رنج رہا اور اس کے کفارہ کے لئے انہوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی، غلام آزاد کئے، بخاری میں اگرچہ ان اعمال کا ذکر اجمالاً ہے لیکن ابن اسحاق نے تفصیل سے یہ تمام باتیں گنائی ہیں۔ (2)

اس حالت کو گوارا کرنا گو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اطاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا۔ ایک طرف (ظاہر میں) اسلام کی توہین ہے۔ ابوجندل بیڑیاں پہنے ۱۴سو جان نثاران اسلام سے استغاثہ کرتے ہیں۔ سب کے دل جوش سے لبریز ہیں اور اگر رسول اللہ ﷺ کا ذرا ایما ہو جائے تو تلوار فیصلۂ قاطع کے لئے موجود ہے، دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں اور ایفائے عہد کی ذمہ داری ہے، رسول اللہ ﷺ نے ابوجندل رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

> يا ابا جندل اصبر واحتسب فان الله جاعل لك ولمن معك من المستضعفين فرجا ومخرجا انا قد عقدنا بيننا وبين القوم صلحا وانا لا نغدربهم۔ (3)
>
> "ابوجندل! صبر اور ضبط سے کام لو اللہ تمہارے لئے اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔"

غرض ابوجندل رضی اللہ عنہ کو اسی طرح پابزنجیر واپس جانا پڑا۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں لیکن لوگ اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا یہاں تک کہ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے، تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا۔ آنحضرت ﷺ خیمہ میں تشریف لے گئے اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا: آپ ﷺ کسی سے کچھ نہ فرمائیں۔ بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائیں۔ آپ نے باہر آ کر خود قربانی کی اور بال منڈوائے۔ اب جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اتارا۔ (4)

صلح کے بعد تین دن تک آپ ﷺ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا، پھر روانہ ہوئے تو راہ میں یہ سورۃ اتری۔

﴿ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ ﴾ (٤٨/ الفتح:١)

---

(1) صحيح بخاری، كتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد:٢٧٣١، ٢٧٣٢۔(س)۔ (2) سیرت ابن ہشام، ج ٢، ص:٢١٦۔ (3) سیرت ابن ہشام، ج ٢، ص:٢١٧۔ (4) كتاب الشروط: ٢٧٣١، ٢٧٣٢ (س)

''ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔''

تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے۔ اللہ نے اس کو فتح کہا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا: ''یہ آیت نازل ہوئی ہے۔'' انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ فتح ہے؟ ارشاد ہوا کہ ''ہاں۔'' صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تسکین ہوگئی اور مطمئن ہو گئے۔ [1] نتائج مابعد نے اس راز سربستہ کی عقدہ کشائی کی۔ اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے۔ اب صلح کی وجہ سے آمد و رفت شروع ہوئی، خاندانی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے، باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آتا رہتا تھا، اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسن عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاق کی ایک زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکہ جاتے تھے ان کی صورتیں یہی مناظر پیش کرتی تھیں۔ اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس معاہدہ صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہیں لائے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ (فاتح شام) اور عمرو بن عاص (فاتح مصر) کا اسلام بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ معاہدۂ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے چلا آئے گا وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائے گا اس میں صرف مرد داخل تھے عورتیں نہ تھیں عورتوں کے متعلق خاص یہ آیت اتری:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾ . (٦٠/ الممتحنة:١٠)

''مسلمانو! جب تمہارے پاس عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچ لو، اللہ ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے، اب اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو ان کو کافروں کے ہاں واپس نہ بھیجو نہ وہ عورتیں کافروں کے قابل ہیں۔ اور نہ کافر ان عورتوں کے قابل ہیں اور ان عورتوں پر ان لوگوں نے جو خرچ کیا ہو وہ تم ان کو دے دو اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کے مہر ادا کر دو اور کافرہ عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو۔''

جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے چونکہ کفار ان کو سخت تکلیفیں دیتے تھے اس لئے وہ بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے تھے۔ سب سے پہلے عتبہ بن اُسید رضی اللہ عنہ (ابوبصیر) بھاگ کر مدینہ آئے۔ قریش نے آنحضرت ﷺ کے پاس دو شخص بھیجے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ

[1] صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب صلح الحديبية: ٤٦٣٣ صلح حدیبیہ کے واقعات صحیح بخاری میں نہایت تفصیل سے مذکور ہیں لیکن اصل موقع یعنی غزوات کے ذکر میں نہیں بلکہ کتاب الشروط میں، اس بنا پر ارباب سیر کی نگاہ سے یہ واقعات رہ گئے۔ غزوات میں جستہ جستہ واقعات ہیں ہم نے ان کو بھی لیا ہے، باقی جزئیات صحیح مسلم اور ابن ہشام سے ماخوذ ہیں۔

سے فرمایا: ''کہ واپس جاؤ۔'' حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ کیا آپ مجھ کو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ مجھ کو کفر پر مجبور کریں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ اس کی کوئی تدبیر نکالے گا۔'' حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ مجبوراً دو کافروں کی حراست میں واپس گئے۔ لیکن مقام ذوالحلیفہ پہنچ کر انہوں نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا۔ دوسرا شخص جو بچ رہا اس نے مدینہ آ کر آنحضرت ﷺ سے شکایت کی۔ ساتھ ہی ابوبصیر بھی پہنچے اور عرض کی کہ آپ نے عہد کے موافق اپنی طرف سے مجھ کو واپس کر دیا اب آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ یہ کہہ کر مدینہ سے چلے گئے اور مقام عیص میں جو سمندر کے کنارے ذومروہ کے پاس ہے رہنا اختیار کیا۔ مکہ کے بیکس اور ستم رسیدہ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ جان بچانے کا ایک ٹھکانا پیدا ہو گیا ہے تو چوری چھپے بھاگ بھاگ کر یہاں آنے لگے۔ چند روز کے بعد اچھی خاصی جمعیت ہو گئی اور اب ان لوگوں نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ قریش کا کاروانِ تجارت جو شام کو جایا کرتا تھا اس کو روک لیتے تھے۔ ان حملوں میں جو مال غنیمت مل جاتا تھا وہ ان کی معاش کا سہارا تھا۔

قریش نے مجبور ہو کر آنحضرت ﷺ کو لکھ بھیجا کہ معاہدہ کی اس شرط سے ہم باز آتے ہیں اب جو مسلمان چاہے مدینہ جا کر آباد ہو سکتا ہے۔ اس سے تعرض نہ کریں گے آپ نے آوارۂ وطن مسلمانوں کو لکھ بھیجا کہ یہاں چلے آؤ۔ چنانچہ ابوجندل اور ان کے ساتھی مدینہ میں آ کر آباد ہو گئے اور کاروانِ قریش کا راستہ بدستور کھل گیا۔

مستورات میں سے ام کلثوم جو رئیس مکہ (عقبہ بن ابی معیط) کی صاحبزادی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں مدینہ ہجرت کر کے آئیں، ان کے ساتھ ان کے دونوں بھائی عمارہ اور ولید بھی آئے اور آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان کو واپس دے دیجئے۔ آپ نے منظور نہیں فرمایا۔ صحابہ میں سے جن لوگوں کی ازواج مکہ میں رہ گئی تھیں اور اب تک کافر تھیں صحابہ نے ان کو طلاق دے دی۔ [1]

---

[1] یہ تفصیل اکتفاء کلاعی سے خمیس (ج ۲، ص: ۲۳ تا ۲۵ مطبوعہ وہبیہ مصر: ۱۲۸۳ھ) نے نقل کی ہے۔

سلاطین کو اسلام کی دعوت

(آخر) ٦ھ یا (شروع) ٧ھ

﴿ اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ (١٦/ النحل:١٢٥)

حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں میں پہنچا دیا جائے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے (ایک دن تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور خطبہ دیا۔ ''ایھا الناس! اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو حوارین عیسیٰ کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغام حق ادا کرو۔'' [1] اس کے بعد آپ نے) قیصرِ روم، شہنشاہِ عجم، عزیزِ مصر اور رؤسائے عرب کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔ جو لوگ خطوط لیکر گئے اور جن کے نام لے کر گئے، ان کی تفصیل یہ ہے: [2]

حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ	قیصرِ روم
حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ	خسرو پرویز کج کلاہ ایران
حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ	عزیزِ مصر
حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ	نجاشی بادشاہِ حبش
حضرت سلیط بن عمر بن عبد شمس رضی اللہ عنہ	رؤسائے یمامہ
حضرت شجاع بن وہب الاسدی رضی اللہ عنہ	رئیس حدودِ شام حارث غسانی

ایرانیوں نے چند برس پہلے بلادِ شام پر حملہ کر کے رومیوں کو شکست دی تھی جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت ﴿ غُلِبَتِ الرُّومُ ﴾ میں ہے۔ ہرقل نے اس کے انتقام کے لئے بڑے سر و سامان سے فوجیں تیار کیں اور ایرانیوں پر حملہ کر کے ان کو سخت شکست دی تھی۔ اس کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے وہ حمص سے بیت المقدس آیا تھا اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھائے جاتے تھے۔ [3]

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیرِ حکومت رہا کرتا تھا وہ غسانی خاندان تھا اور اس کا پایۂ تخت بُصریٰ تھا جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں اس خاندان کا تخت نشین حارث غسانی تھا۔ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کا نامۂ مبارک یہیں بصریٰ میں حارث غسانی کو لا کر دیا۔ اس نے قیصر کے پاس بیت المقدس میں بھیج دیا۔ قیصر کو خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے

[1] سیرت ابن هشام، ج ۲، ص: ۳۹۲، ۲۹۳ و (تاریخ الخمیس بحواله اکتفاء کلاعی، ج ۲، ص: ۲۹، ۳۰)۔

[2] طبری، ج ۳، ص: ۱۵۵۹ ''س'' اور ابن ہشام (باب خروج رسول الله ﷺ الی الملوك، ج ۲، ص: ۳۹۲، ۳۹۳ (س)۔ [3] ہرقل کا پورا واقعہ فتح الباری، (ج ۱، ص: ۳۱، (س) شرح صحیح بخاری سے لیا گیا ہے۔ اصل صحیح بخاری (کتاب بدء الوحی کیف کان بدء الوحی: ۷ وکتاب الجهاد، باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام والنبوة: ۲۹٤۱ (س)۔ میں مجمل واقعہ ہے۔ زائد تفصیلیں حافظ ابن حجر نے اور کتابوں سے بڑھائی ہیں۔

تو لاؤ۔ اتفاق یہ کہ ابوسفیان تجارِ عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے۔ قیصر کے آدمی ان کو غزہ سے جا کر لائے۔

قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا، خود تاج شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا تخت کے چاروں طرف بطارقہ قسیس اور رہبان کی صفیں قائم کیں، اہل عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا، تم میں سے اس مدعی نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا "میں۔" پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:

قیصر	مدعیٔ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟
ابوسفیان	شریف ہے۔
قیصر	اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟
ابوسفیان	نہیں۔
قیصر	اس خاندان میں کوئی بادشاہ بھی گزرا ہے؟
ابوسفیان	نہیں۔
قیصر	جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحبِ اثر؟
ابوسفیان	کمزور لوگ ہیں۔
قیصر	اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟
ابوسفیان	بڑھتے جاتے ہیں۔
قیصر	کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟
ابوسفیان	نہیں۔
قیصر	وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟
ابوسفیان	ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو نیا معاہدۂ صلح ہوا ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟
قیصر	تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی؟
ابوسفیان	ہاں۔
قیصر	نتیجۂ جنگ کیا رہا؟
ابوسفیان	کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔
قیصر	وہ کیا سکھاتا ہے؟
ابوسفیان	کہتا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، کسی اور کو اللہ کا شریک نہ بناؤ نماز پڑھو، پاک دامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحمی کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے کہا کہ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ اللہ پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے، پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اُس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ وعفاف کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔"

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھا جائے۔ [1]

فرمانِ رسالت کے یہ الفاظ تھے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد عبداللہ و رسولہ الی ہرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الھدی ، اما بعد! فانی ادعوك بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یؤتك اللہ اجرك مرتین فان تولیت فعلیك اثم الاریسیین ﴿قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾

(۳/ آل عمران:٦٤)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد ﷺ کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔ یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے۔ اس کو سلامتی ہے جو ہدایت کا پیرو ہے اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں۔ سلام لا، تو سلامتی میں رہے گا۔ اللہ تجھ کو دگنا اجر دے گا اور اگر تو نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو (اللہ کو چھوڑ کر) خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔"

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اس سے بطارقہ اور اہل دربار تخت برہم ہو چکے تھے۔ نامہ مبارک

[1] یہ پوری گفتگو صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں منقول ہے، ابتدائے کتاب میں بھی اور باب الجہاد میں بھی۔

کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہوئے۔ یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہلِ عرب کو دربار سے اٹھا دیا۔ اور گو اس کے دل میں نورِ اسلام آ چکا تھا لیکن تاج وتخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی۔ [1]

خسرو پرویز (شہنشاہ ایران) کے نام جو نامۂ مبارک عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ لے کر گئے تھے یہ تھا:

بسم الله الرحمن الرحيم من محمد رسول الله الى كسرىٰ عظيم فارس سلام على من اتبع الهدىٰ وآمن بالله ورسوله واشهد ان لا اله الا الله وانى رسول الله اِلى الناس كافة لينذر من كان حيا اسلم تسلم فان ابيت فعليك اثم المجوس۔ [2]

''اللہ رحمٰن رحیم کے نام سے محمد ﷺ پیغمبر کی طرف سے کسریٰ (رئیسِ فارس) کے نام، سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور اللہ اور پیغمبر پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ اللہ صرف ایک اللہ ہے اور یہ کہ اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو اللہ کا خوف دلائے تو اسلام قبول کر تو سلامت رہے گا۔ ورنہ مجوسیوں کا وبال بھی تیری گردن پر ہوگا۔''

خسرو پرویز بڑی شوکت وشان کا بادشاہ تھا، اس کی سلطنت میں دربار کو جو عظمت وجلال حاصل ہوا کبھی نہیں ہوا تھا عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا۔ نامہ مبارک میں پہلے اللہ کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ ﷺ کا نام تھا۔ خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا کہ میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے۔'' [3] پھر نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا لیکن چند روز کے بعد خود سلطنت عجم کے پرزے اڑ گئے۔

نظامی نے شیریں خسرو میں داستان مفصل لکھی ہے اور اسلامی جوش سے لکھی ہے ہم اس کے چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

دران دوراں کہ گیتی رامِ اُوبود [4] | ز مشرق تابہ مغرب نامِ اُوبود
رسولِ مابہ حجت ہائے قاہر | نبوت درجہاں مے کرد ظاہر

---

[1] مسند ابن حنبل، ص: ۷۵، ج ۴ میں ہے کہ حضرت دِحیہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ قیصر نے اپنا ایک سفیر خط کا جواب دے کر خدمت نبوی ﷺ میں بھیجا تھا اور سفیر کو نبوت کے چند سوالات بتا دیے تھے۔ اس نے سوالات پوچھے آپ ﷺ نے جوابات دیے اور آخر بغیر اسلام لائے وہ واپس گیا، لیکن یہ حدیث صحیح نہیں، اس میں ہے کہ قیصر کا خط پڑھنے کے لئے آنحضرت ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہوں نے پڑھ کر سنایا حالانکہ وہ اس وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے، (جامع کے نزدیک حسب تحقیق ابن حجر فتح الباری ج ۸ ص: ۹۷ و زرقانی ج ۳ ص: ۸۸ و ۸۹ یہ واقعہ دوسرا ہے اور اس کے بعد کا ہے اور خود اس حدیث میں تصریح ہے کہ یہ تبوک کا واقعہ ہے اور غزوۂ تبوک ربما فتح مکہ کے بعد رجب ۹ ھ میں پیش آیا ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس سے ایک یا دو سال پہلے حدیبیہ یا فتح مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے مگر تبوک میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شرکت کہیں مذکور نہیں یہ روایت اسی سند کے ساتھ کتاب الاموال ابوعبید القاسم بن سلام ص: ۲۵۵ مصر، میں بھی موجود ہے۔''س''

[2] تاریخ طبری، ج۳، ص: ۱۵۷۱۔ [3] تاریخ الخميس، ج ۲، ص: ۳٤، ۳٥۔ [4] اس سے خسرو مراد ہے۔

گہے باسنگ خارا رازمی گفت | گہے ریگش حکایت بازمی گفت
خلائق راز دعوت جام در داد | بہ ہر کشور صلائے عام درداد
بفرمود از عطا عطرے سرشتند | بہ نام ہریکے، سطرے نوشتند
چو از نام نجاشی باز پرداخت | زبہر نام خسرونامۂ ساخت
چوقاصد عرضہ کرد آں نامۂ نو | بجو شید از غضب اندام خسرو
زتیزی گشت ہر مویش سنانی | زگرمئ ہر رگش آتش فشانی
سوادے دید روشن ہیبت انگیز | نوشتۂ از محمد ﷺ سوئے پرویز
چوعنوان گاہ عالم تاب رادید | تو گفتی سگ گزیدہ آب رادید
غرور بادشاہی بردش ازراہ | کہ گستاخی کہ یارد. باچومن شاہ
کرا زہرہ کہ باایں احترامم | نویسد نام خود بالائے نامم
رخ ازگرمی چو آتش گاہ خود کرد | بخود اندیشۂ بد کرد، و بد کرد
درید آں نامۂ گردن شکن را | نہ نامہ بلکہ نام خویشتن را
فرستادہ چودید آں خشم ناکی | بہ رجعت پائے خود راکرد خاکی
ازاں آتش کہ آں دود تہی داشت | چراغ آگہاں ❶ را آگہی داشت
زگرمی آں چراغ گردن افراز | دعا را داد چوں پروانہ پرواز
عجم رازآں دعا کسریٰ درافتاد | کلاہ ازتارك کسریٰ درافتاد
زہے شاہنشہے کز بیم وامید | قلم راندہ برافریدون جمشید

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد خسرو پرویز نے گورنر یمن کو جس کا نام ''باذان'' تھا، فرمان بھیجا کہ کسی شخص کو حجاز بھیجو کہ اس نئے مدعی نبوت کو پکڑ کر میرے دربار میں لائے۔ باذان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا خرخسرہ تھا، مدینہ روانہ کیا۔ ان دونوں نے بارگاہ رسالت میں آ کر عرض کی کہ شہنشاہ عالم (کسریٰ) نے تم کو بلایا ہے، اگر تعمیل حکم نہ کرو گے تو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کردے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم واپس جاؤ اور کہہ دینا کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی۔'' ❷ پیغام پہنچا کر یمن میں آئے تو خبر آئی کہ شیرویہ (خسرو پرویز کا بیٹا) نے خسرو پرویز کو قتل کر ڈالا۔

نجاشی (بادشاہ حبش) کو آپ ﷺ نے دعوت اسلام کا جو خط بھیجا تھا، اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔'' حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ جو ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے یہیں موجود تھے۔ نجاشی نے ان کے ہاتھ پر بیعتِ اسلام کی، ابن اسحاق نے روایت

❶ آگہان یعنی ارباب علم چراغ آگہاں سے آنحضرت ﷺ مراد ہیں ''آگہی داشت'' یعنی خبر کی۔
❷ طبری، ج ۳، ص: ۱۵۷۲، ۱۵۷۴۔

کی ہے کہ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہ رسالت میں عرض نیاز کے لئے بھیجا، لیکن جہاز سمندر میں ڈوب گیا اور یہ سفارت ہلاک ہوگئی۔ ❶

عام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ ھ میں وفات پائی۔ ❷ آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور یہ خبر سن کر آپ نے غائبانہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھائی، ❸ لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح مسلم میں تصریح ہے کہ جس نجاشی کی نمازِ جنازہ آپ ﷺ نے پڑھی وہ یہ نہ تھا ❹ (لیکن ابن قیم نے ارباب سیر کی روایت کی تائید کی ہے اور مسلم کی روایت کے اس ٹکڑا کو راوی کا وہم بتایا ہے)۔ ❺

جو لوگ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے ان میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا (امیر معاویہ کی بہن) بھی تھیں، ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے نجاشی کو لکھ بھیجا کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو شادی کا پیغام سنا دو اور میرے پاس بھیج دو، نجاشی نے خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے ایجاب وقبول ادا کیا، نجاشی نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے مہر ادا کیا جس کی تعداد چار سو اشرفیاں تھیں۔ نکاح کے بعد حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں اور مدینہ کی بندرگاہ میں اتریں، آنحضرت ﷺ اس وقت خیبر میں تشریف رکھتے تھے، آنحضرت ﷺ اکثر نجاشی کے حالات ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کرتے تھے۔ ❻

عزیز مصر (مقوقس) کو آپ ﷺ نے جو خط لکھا تھا اس کے جواب میں اس نے عربی زبان میں یہ خط لکھا:

لمحمد بن عبداللہ من المقوقس عظیم القبط سلام علیك اما بعد فقد قرأت کتابك وفهمت ما ذكرت فيه وما تدعو اليه وقد علمت ان نبيًا بقى وكنت اظن انه يخرج بالشام وقد اكرمت رسولك وبعثته اليك بجاريتين لهما مكان فى القبط عظيم وكسوة واهديت اليك بغلةً لتركبها والسلام عليك۔ ❼

---

❶ طبری، ج۳، ص: ۱۵٦۹۔ ❷ تاریخ طبری، ج٤، ص: ۱۷۲۰۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب فی التکبیر علی الجنازۃ: ۲۲۰٤۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب کتب النبی ﷺ الی ملوك الكفار: ٤٦۰۹۔ ❺ زادالمعاد (س) (حضرت جامع سیرت سے اس موقع پر تسامح ہوا ہے، علامہ ابن قیم نے بعینہ وہی بات کہی ہے جو مؤلف سیرت کا مقصود ہے ان کے الفاظ یہ ہیں: وتوفى النجاشى سنة تسع واخبر رسول الله ﷺ بموته ذالك اليوم، فخرج بالناس الى المصلى فصلى عليه وكبر اربعا، قلت وهذا وهم۔ والله اعلم۔ وقد خلط راويه ولم يميز بين النجاشى الذى صلى عليه وهو الذى آمن به واكرم اصحابه وبين النجاشى الذى كتب اليه يدعوه، فهما اثنان وقد جاء ذلك مبينا فى صحيح مسلم ان رسول الله ﷺ كتب الى النجاشى وليس بالذى صلى عليه) زاد المعاد، ج۲، ص:٥٦ ذكر هديه فى مكاتباته الى الملوك وغيرهم۔ مطبعۃ میمنیہ مصر: ۱۳۲۴ھ)۔
❻ تاریخ طبری، ج۳، ص: ۱۵۷۰۔ ❼ زاد المعاد، ج۲، ص: ٥۷۔

"محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے سلام علیک کے بعد میں نے آپ ﷺ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں، لیکن میں یہ سمجھا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے، میں نے آپ کے قاصد کی عزت کی اور دولڑکیاں 1 بھیجتا ہوں جن کی قبطیوں (مصری قوم) میں بہت عزت کی جاتی ہے اور میں آپ ﷺ کے لئے کپڑا اور سواری کا ایک خچر بھیجتا ہوں۔"

بااین ہمہ عزیز مصر اسلام نہیں لایا، دولڑکیاں جو بھیجی تھیں ان میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں جو حرم نبوی میں داخل ہوئیں دوسری سیرین تھیں جو حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے ملک میں آئیں، خچر کا نام دلدل تھا جس کا ذکر اکثر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے، جنگ حنین میں آپ اسی پر سوار تھے۔ 2 طبری نے لکھا ہے کہ ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ جن کو آنحضرت ﷺ نے مقوقس کے پاس خط لے کر بھیجا تھا ان کی تعلیم سے دونوں خاتونیں خدمت نبوی میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں۔ 3 اس واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ یہ خاتونیں لونڈیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں، اس لئے آنحضرت ﷺ نے ماریہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہوگا نہ کہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپ ﷺ کے حرم میں آئیں۔

(رؤسائے عرب کو جو خط لکھے گئے تھے ان کے بھی جواب مختلف آئے، ہوذہ بن علی رئیس یمامہ نے لکھا، تم جو باتیں کہتے ہو وہ نہایت اچھی ہیں اگر حکومت میں کچھ میرا بھی حصہ ہو تو میں تمہاری اقتدا کے لئے تیار ہوں، اسلام ہوس ملک کے لئے نہیں آیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: "زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو میں نہ دوں گا۔" 4

حارث غسانی جو حدود شام کا رئیس تھا اور رومیوں کے ماتحت اطراف کے عربوں میں حکومت کرتا تھا خط پڑھ کر برہم ہوا اور فوج کو تیاری کا حکم دیا، مسلمان اس جرم کی پاداش میں ہر وقت اس کے حملہ کے منتظر رہتے تھے اور آخر موتہ اور تبوک وغیرہ کی لڑائیاں پیش آئیں)۔ 5

واقعات متفرقہ ۶ ھ خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا اسلام

(حدیبیہ کی صلح کو اللہ نے فتح کہا ہے، لیکن اجسام کی نہیں قلوب کی، اسلام کو اپنی اشاعت کے لئے امن درکار تھا اور وہ اس صلح سے حاصل ہو گیا، اس صلح کو خود دشمن فتح سمجھتے تھے، قریش اور مسلمانوں میں اب تک جو معرکے ہوئے فوجی حیثیت سے قریش کی صف میں ہر جگہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا نام ممتاز نظر آتا ہے، جاہلیت

---

1 ہم نے جاریہ کا ترجمہ لڑکی کیا ہے، عربی میں جاریہ لڑکی کو بھی کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی، ارباب سیرت ماریہ قبطیہ کو لونڈی کہتے ہیں، لیکن مقوقس نے جو لفظ ان کی نسبت لکھا ہے یعنی کہ "مصریوں میں بڑی عزت ہے" یہ لونڈیوں کی شان میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

2 صحیح بخاري، ج۲، كتاب المغازي، غزوة حنين: ٤٣١٧۔ 3 تاريخ طبري، ج۳، ص:١٥٩١۔

4 زاد المعاد، ج۲، ص:٥٨۔ 5 اور جن رؤسائے قبائل اور امرائے عرب کو دعوتی خطوط لکھے گئے تھے ان کی تفصیل دوسری جلد کے تبلیغی واقعات میں آئے گی۔ (س)

میں رسالہ کی افسری انہیں کے سپرد تھی، احد میں قریش کے اکھڑے ہوئے پاؤں انہیں کی کوشش سے سنبھلے تھے، حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش کا طلایہ انہی کی زیر افسری نظر آیا تھا، لیکن قریش کا یہ سپہ سالار اعظم بھی آخر اسلام کے حملۂ کاری سے نہ بچ سکا۔

صلح حدیبیہ کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مکہ سے نکل کر مدینہ کا رخ کیا۔ راستہ میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ملے پوچھا: کدھر کا قصد ہے؟ بولے: اسلام لانے جاتا ہوں، آخر کب تک؟ عمرو بن العاص نے کہا: ہمارا بھی یہی ارادہ ہے۔ دونوں صاحب ایک ساتھ بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے [1] اور اب وہ جوہر جو اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا اسلام کی محبت میں صرف ہونے لگا۔

فتح مکہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ جب ایک مسلمان دستہ کے افسر بن کر آنحضرت ﷺ کے سامنے سے گزرے تو آپ ﷺ نے پوچھا: ''کون ہے؟'' لوگوں نے کہا: خالد ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی تلوار ہے۔'' [2]

غزوۂ موتہ میں جب حضرت جعفر زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے علم اپنے ہاتھ میں لیا تو مسلمان خطرہ سے باہر تھے۔

عہدِ خلافت میں ایک (خالد رضی اللہ عنہ) نے شام کا ملک قیصر سے چھین لیا اور دوسرا (عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ) مصر کا فاتح ہوا۔

[1] اصابہ ابن حجر بہ روایت ابن اسحاق ج ۱، ص: ۴۱۳، (س)۔ [2] ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب خالد بن الولید: ۳۸٤٦۔ مگر اس روایت میں فتح مکہ کے موقع کی تصریح نہیں ہے۔

۷ھ خیبر

آخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ

خیبر غالباً عبرانی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں یہ مقام مدینہ منورہ سے آٹھ منزل پر ہے۔ یورپین سیاحوں میں ڈاوٹی کئی مہینہ تک یہاں ۱۸۷۷ء میں مقیم رہا، اس نے مدینہ سے اس مقام کا فاصلہ ۲۰۰ میل لکھا ❶ ہے۔ وہ نخلستان جس کے کنارہ پر خیبر ہے، نہایت زرخیز ہے، یہاں یہود نے نہایت مضبوط متعدد قلعے بنائے تھے، جن میں سے بعض کے آثار اب تک باقی ہیں۔

عرب میں یہودی قوت کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا، مدینہ سے جب رؤسائے بنونضیر جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہوئے تو انہوں نے تمام عرب کو اسلام کی مخالفت پر برانگیختہ کر دیا۔ جس کا پہلا مظہر احزاب کا معرکہ تھا، ان رؤسا میں سے حیی بن اخطب جنگ قریظہ میں قتل ہوا، جس کے بعد ابورافع سلام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا، یہ بہت بڑا تاجر اور صاحب اثر تھا۔ قبیلۂ غطفان جو عرب کا بہت بڑا صاحب اثر قبیلہ تھا، ان کی آبادی خیبر سے متصل تھی اور ہمیشہ سے یہود خیبر کے حلیف اور ہم عہد تھے، ❷ ۶ھ میں سلام نے خود جا کر قبیلۂ غطفان اور ان کے آس پاس کے قبیلوں کو اسلام کے مقابلہ کے لئے آمادہ کیا، یہاں تک کہ ایک عظیم الشان فوج لے کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کیں۔ ❸ آنحضرت ﷺ کو یہ خبریں معلوم ہوئیں تو آپ ﷺ کے ایماء سے (رمضان ۶ ہجری میں حضرت عبداللہ بن عتیک ایک خزرجی انصاری کے ہاتھ سے اپنے قلعہ خیبر میں سوتا ہوا مارا گیا) سلام کے بعد یہودیوں نے اُسیر بن رزام کو مسند ریاست پر بٹھایا، اس نے قبائل یہود کو جمع کر کے تقریر کی اور کہا کہ ”میرے پیشرووں نے محمد (ﷺ) کے مقابلہ میں جو تدبیریں اختیار کیں وہ غلط تھیں صحیح تدبیر یہ ہے کہ خود محمد ﷺ کی دارالریاست پر حملہ کیا جائے اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا۔“ ❹ اس غرض سے اُسیر نے غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کیا اور ایک فوج گراں تیار کی، آنحضرت ﷺ کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے اس افواہ پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ خود خیبر جا کر اصل واقعہ کی تحقیق کریں، چنانچہ وہ چند آدمیوں کو لے کر خیبر گئے اور چھپ کر خود اُسیر کی زبانی اس کے مشورے اور تدبیریں سنیں۔ یہ حالات آ کر آنحضرت ﷺ

---

❶ مارگولیتھ، ص: ۳۵۶۔ ❷ ابن خلدون، ج ۲، ذکر قبائل عرب (وتاریخ خمیس، ج ۲، ص: ۴۳ باب غزوۃ خیبر) (س) ❸ ابن سعد (ج ۲ ق اول) ص: ۶۶، اصلی الفاظ یہ ہیں ”کان ابو رافع بن ابی الحقیق قد اجلب فی غطفان ومن حوله من مشرکی العرب وجعل لهم الحفل العظیم لحرب رسول الله ﷺ“ (ابورافع نے غطفان اور آس پاس کے مشرکین عرب کو جنگ پر آمادہ کیا تھا اور ایک بہت بڑی بھیڑ کو آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے جمع کیا) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع: ۴۰۳۹ میں ہے وکان ابو رافع یؤذی رسول الله ﷺ ویعین علیه۔ یعنی ابو رافع آنحضرت ﷺ کو ایذا پہنچایا کرتا تھا اور آپ کے دشمنوں کو مقابلہ میں مدد دیا کرتا تھا۔ اس امداد و اعانت کی تفصیل بروایت عروہ فتح الباری میں ج ۷ ص ۲۶۳ میں مفصل مذکور ہے۔ (ن) ❹ زرقانی علی المواهب، ج ۲، ص: ۱۹۶ مصر (س)۔

کی خدمت میں عرض کیے، آپ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو ۳۰ آدمی دیکر خیبر کو روانہ کیا، ان لوگوں نے اسیر سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے کہ تم اگر حاضر ہو جاؤ تو خیبر کی حکومت تم کو دے دی جائے، چنانچہ وہ ۳۰ آدمی لے کر خیبر سے نکلا اور احتیاط کی بنا پر مخلوط قافلہ اس طرح چلا کہ دو دو شخص ہم رکاب چلتے تھے جن میں ایک یہودی اور دوسرا مسلمان ہوتا تھا، قرقرہ پہنچ کر اسیر کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی اس نے ہاتھ بڑھا کر حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کی تلوار چھیننی چاہی، انہوں نے کہا: اللہ کے دشمن! بدعہدی کرنا چاہتا ہے، یہ کہہ کر سواری بڑھائی اور جب اُسیر زد پر آ گیا تو تلوار ماری کہ اس کی ران کٹ گئی، وہ گھوڑے سے گرا، گرتے گرتے اس نے عبداللہ کو زخمی کیا، اب مسلمان پیش دستی کر کے یہود پر ٹوٹ پڑے نتیجۂ جنگ یہ تھا کہ یہود میں ایک کے سوا کوئی نہیں بچا، [1] یہ اخیر ۶ھ یا محرم ۷ھ کا واقعہ ہے۔

خیبر اب اسلام کا سب سے بڑا حریف اور اسلام کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھا، ان لوگوں نے مکہ جا کر قریش کے ذریعہ سے تمام عرب میں بغاوت کی ایک عالمگیر جنبش پیدا کر دی، جس نے واقعۂ احزاب میں مرکز اسلام (مدینہ منورہ) کو متزلزل کر دیا تھا، یہ کوشش اگرچہ ناکام رہی لیکن جو دست و بازو کام کر رہے تھے اب بھی موجود تھے۔ جن لوگوں نے جنگ احزاب برپا کرائی تھی ان میں زیادہ بااثر ابن ابی الحقیق کا خاندان تھا جو قبیلہ بنی نضیر سے تھا اور مدینہ سے جلا وطن ہو کر آیا تھا اس نے خیبر کے مشہور قلعہ قموص پر قبضہ کیا تھا، سلام بن ابی الحقیق جس کا ذکر ابھی اوپر گزر چکا ہے اسی خاندان کا رئیس تھا، اس کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق خاندان کی ریاست پر ممتاز ہوا۔ خیبر کے یہود ادھر تو غطفان سے اسلام کے مقابلہ کے لئے سازش کر رہے تھے، ادھر مدینہ کے منافقین ان کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے اور ان کو ہمت دلاتے تھے کہ مسلمان تم سے سر بر نہیں ہو سکتے۔

رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ ان لوگوں سے معاہدہ ہو جائے، اس بنا پر آپ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا لیکن ادھر تو یہود خود سخت دل اور ایک بدگمان قوم تھی ادھر منافقین ان کو ابھارتے تھے، اسی زمانہ میں رأس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے اہل خیبر کے پاس کہلا بھیجا کہ محمد ﷺ تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں لیکن تم ان سے نہ ڈرنا ان کی ہستی کیا ہے مٹھی بھر آدمی ہیں جن کے پاس ہتھیار تک نہیں۔ یہود نے یہ سن کر کنانہ اور ہوذہ بن قیس کو غطفان کے پاس بھیجا کہ ہمارے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرو تو ہم نخلستان کی نصف پیداوار تم کو دیں گے (ایک روایت میں ہے) غطفان نے اس کو منظور کیا۔ [2]

غطفان کا ایک قوت ور قبیلہ بنو فزارہ تھا ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ خیبر والے آنحضرت ﷺ پر حملہ کرنا

---

[1] یہ تمام واقعات ابن سعد، ج ۲ قسم اول ص: ۶۶، ۶۷ سے منقول ہیں، بہت سی کتابوں میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن انیس نے خود ابتدا کی اور اسیر بن رزام کو قتل کر ڈالا لیکن صحیح واقعہ وہی ہے جو ابن سعد سے منقول ہے اور وہی اس معرکہ کی وجہ ہو سکتا ہے۔

[2] تاریخ خمیس، (ج ۲ ص: ۴۳) عام روایتوں میں گو یہ ہے کہ غطفان نے مسلمانوں کے خوف سے اس کو منظور نہیں کیا تاہم یہ ظاہر ہے کہ ان کی اس ناطر فداری پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ (س)

چاہتے ہیں تو وہ خود خیبر میں آ ئے کہ ہم تمہارے ساتھ شریک ہو کر لڑیں گے، آنحضرت ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے بنوفزارہ کو خط لکھا کہ "تم خیبر والوں کی مدد سے باز آ ؤ، خیبر فتح ہو جائے گا تو تم کو بھی حصہ دیا جائے گا۔" لیکن بنوفزارہ نے انکار کیا۔ ❶

ذی قرد محرم ۷ ھ

غطفان کی شرکتِ جنگ کا دیباچہ یہ تھا کہ ذی قرد کی چراگاہ پر جو آنحضرت ﷺ کی اونٹنیوں کی چراگاہ تھی۔ (اس قبیلہ کے چند آدمیوں نے بہ سرداری عبدالرحمن بن عیینہ) چھاپہ مارا اور ۲۰ اونٹنیاں پکڑ کر لے گئے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے کو جو اونٹنیوں کی حفاظت پر متعین تھے قتل کر دیا اور ان کی بیوی کو گرفتار کر کے لے گئے (مسلمانوں نے جب تعاقب کیا تو وہ درہ میں گھس گئے، وہاں) عیینہ بن حصن جو قبائل غطفان کا سپہ سالار تھا (ان کی امداد کو موجود تھا)۔ مسلمانوں میں حضرت سلمہ بن الاکوع ایک مشہور قدر انداز صحابی تھے سب سے پہلے ان کو اس غارت گری کا علم ہوا۔ انہوں نے واصباحاہ کا نعرہ مارا اور دوڑ کر حملہ آوروں کو جالیا وہ اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے، حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے تیر برسانے شروع کئے، حملہ آور بھاگ نکلے، انہوں نے تعاقب کیا اور لڑ بھڑ کر تمام اونٹنیاں چھڑا لائے۔ دربارِ نبوت میں آ کر عرض کی کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ آیا ہوں اگر ۱۰۰ آدمی مل جائیں تو ایک ایک کو گرفتار کر کے لاتا ہوں، آپ نے رحمت عام کے لحاظ سے فرمایا: ❷

((اذا ملکت فاسجع)) "قابو پا جاؤ تو عفو سے کام لو۔"

اس واقعہ کے تین دن ❸ بعد خیبر کی جنگ پیش آئی۔

خیبر کا آغاز اور غزوات کی بہ نسبت ایک امتیاز خاص رکھتا ہے اور اگرچہ ارباب سیر کی نظر اس نکتہ پر نہیں پڑی کہ اس امتیاز کے اسباب کیا تھے؟ تاہم واقعہ کی حیثیت سے امتیازی امور ان کی زبان سے بھی بلاقصد نکل

---

❶ یہ واقعہ معجم البلدان لفظ جفاء کی ذیل میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بالفاظہا نقل کیا ہے اصل الفاظ یہ ہیں: روی موسیٰ بن عقبۃ عن ابن شہاب قال کانت بنو فزارۃ ممن قدم علی اھل خیبر لیعینوھم فراسلھم رسول اللہ ﷺ ان لا یعینوھم وساء لھم ان یخرجوا عنھم ولکم من خیبر کذا وکذا فأبوا (ج ۳، ص: ۱۵۲ مصر)۔

❷ یہ واقعہ بخاری و مسلم میں بھی منقول ہے لیکن زیادہ تفصیل ابن سعد (ج ۲، قسم اول، ص: ۵۸) و ابن اسحاق سے لی گئی ہے۔

❸ ارباب سیر نے متفقاً اس واقعہ کو خیبر کے واقعہ سے ایک سال ماقبل بیان کیا ہے، لیکن (طبری نے بہ روایت سلمہ (ج ۳، ص: ۱۵۰۲) جو اس غزوہ کے ہیرو تھے اور نیز) امام بخاری نے صاف تصریح کی ہے کہ خیبر سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے ارباب سیر کا بیان لکھ کر لکھا ہے: فعلی ھذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوۃ ذی قرد اصح مما ذکرہ اھل السیر "تو اس بنا پر جو کچھ صحیح بخاری میں غزوہ ذی قرد: ۴۱۹۴ کے متعلق مذکور ہے وہ ارباب سیر کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔" حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ عیینہ بن حصن نے ذو قرد پر دو دفعہ حملہ کیا تھا۔ عام ارباب سیر جس کا تذکرہ کرتے ہیں وہ پہلا حملہ تھا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے (فتح الباری، ج ۷، ص: ۳۵۲ باب غزوۃ ذی قرد) (س) عام ارباب سیر کو غزوہ خیبر بلکہ غزوات کے متعلق چونکہ کسی سبب کی تلاش و جستجو نہیں اس لئے ان کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ واقعات کا تسلسل اور غزوات کے اسباب کیا ہیں۔ لیکن زیادہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

گئے ہیں، سب سے مقدم یہ کہ جب آپ نے خیبر کا قصد کیا تو اعلان عام کر دیا:

((لا یخرجن معنا الا راغب فی الجهاد)) [1]

''ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ آئیں جو طالب جہاد ہوں۔''

اب تک جو لڑائیاں وقوع میں آئیں محض دفاعی تھیں۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے طرزِ حکومت کی بنیاد قائم ہوئی۔ اسلام کا اصلی مقصد تبلیغِ دعوت ہے۔ اب اگر کوئی قوم اس دعوت کی سدراہ نہ ہو تو اسلام کو نہ تو اس سے جنگ ہے، نہ اس کے رعایا بنانے کی ضرورت ہے، صرف معاہدہ صلح کافی ہے جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں لیکن جب کوئی قوم خود اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کو مدافعت کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا پڑتی ہے اور اس کو اپنے زیرِ اثر رکھنا پڑتا ہے۔ خیبر اس قاعدے کے موافق اسلام کا پہلا مفتوحہ ملک تھا۔

غزوات کے خاتمہ کے بعد یہ بحث بہ تفصیل آئے گی کہ ایک مدت تک لوگ [2] جہاد کو عرب کے قدیم طریقہ کے موافق معاش کا ذریعہ سمجھتے رہے اس لڑائی (خیبر) تک بھی یہ غلط فہمی رہی۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں یہ پردہ اٹھا دیا گیا اور اس لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس لڑائی میں صرف وہ لوگ شریک ہوں جن کا مقصد محض جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔

غرض آپ غطفان اور یہود کے حملہ کی مدافعت کے لئے مدینہ سے محرم ۷ھ [3] میں سباع بن عرفطہ غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا افسر مقرر کر کے مدینہ سے روانہ ہوئے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں۔ فوج کی تعداد ۱۶۰۰ تھی جن میں ۲۰۰ سوسوار اور باقی پیدل تھے اس وقت تک لڑائیوں میں علم کا رواج نہ تھا، چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہوتی تھیں، یہ پہلی مرتبہ تھا کہ آپ نے تین علم تیار کرائے دو حضرت حباب بن منذر اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کو عنایت ہوئے اور خاص علمِ نبوی جس کا پھریرا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی چادر سے تیار ہوا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرحمت ہوا، فوج روانہ ہوئی تو حضرت عامر بن الاکوع مشہور شاعر تھے یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے چلے:

اللهم لو لا انت ما اهتدينا	''اے اللہ! اگر تو ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے
ولا تصدقنا ولا صلينا	نہ خیرات کرتے، نہ روزے رکھتے،

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۷۷۔

[2] یہاں ''لوگ'' سے مراد منافقین ہیں، یہ لوگ غزوات میں محض غنیمت کے لالچ میں شریک ہوتے تھے۔ جہاں سخت مقابلہ پیش آنے اور مال غنیمت کے نہ ملنے کا گمان ہوتا وہاں غزوات کی شرکت سے کتراتے تھے، چنانچہ ان ہی دو وجوہ سے وہ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے اور اس پر سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی ناراضگی ظاہر فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ آیندہ غنیمت والے غزوہ میں بھی وہ شریک نہ کئے جائیں۔ اسی لئے حضور انور ﷺ نے اس موقع پر اعلان فرمایا کہ اس غزوہ میں بھی وہی شرکت کا ارادہ کریں جن کی غرض محض جہاد و اعلائے کلمۃ اللہ ہو، دنیاوی مال ومتاع نہ ہو (زرقانی وابن سعد، باب غزوۂ خیبر) (س)

[3] ابن سعد جزء مغازی، ج ۲، ق اول، ص: ۷۷ میں جمادی الاولیٰ سے ۷ھ ہے جو بہ تحقیق مذکورہ بالا صحیح نہیں (س)

فاغفر فداء لك ما اتقينا	ہم تجھ پر فدا ہوں، ہم جو احکام نہیں بجالائے
والقين سكينة علينا	ان کو معاف کر دے اور ہم پر تسلی نازل کر
انا اذا صيح بنا اتينا	ہم جب فریاد میں پکارے جاتے ہیں تو پہنچ
و ثبت الاقدام ان لا قينا	جاتے ہیں اور جب مڈبھیڑ ہو تو ہم کو ثابت قدم
وبالصياح عولوا علينا	رکھ، لوگوں نے پکار کر ہم سے استغاثہ چاہا ہے۔''

یہ اشعار صحیح مسلم ❶ و بخاری ❷ میں نقل کیے ہیں۔ مسند ابن حنبل میں بعض اشعار ❸ زیادہ ہیں، (پہلے دو مصرع کسی قدر اختلاف کے ساتھ صحیح مسلم ❹ (خیبر) میں بھی ہیں۔

ان الذين قد بغوا علينا	جن لوگوں نے ہم پر دست درازی کی ہے جب
اذا ارادوا فتنة ابينا	وہ کوئی فتنہ برپا کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان
ونحن عن فضلك ماستغنينا ❺	سے دبتے نہیں اور اے اللہ! ہم تیری عنایت سے بے نیاز نہیں۔

راہ میں ایک میدان آیا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے تکبیر کے نعرے بلند کئے۔ چونکہ تعلیم و تلقین کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا اور بات بات میں نکات شریعت کی تعلیم ہوتی رہتی تھی۔ ارشاد ہوا کہ آہستہ، کیونکہ کسی بہرے اور دور از نظر کو نہیں پکار رہے ہو، تم جس کو پکارتے ہو وہ تمہارے پاس ہی ہے۔ ❻

اس غزوہ میں چند خواتین بھی اپنی خواہش سے فوج کے ساتھ ہولی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے ان کو بلا بھیجا اور غضب کے لہجہ میں فرمایا: ''تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے حکم سے آئیں۔'' بولیں کہ یا رسول اللہ! ہم اس لئے آئے ہیں کہ چرخہ کات کر کچھ پیدا کریں گے اور اس کام میں مدد دیں گے، ہمارے پاس زخمیوں کے لئے دوائیں بھی ہیں، اس کے علاوہ ہم تیر اٹھا کر لائیں گی؟ آنحضرت ﷺ نے فتح کے بعد جب مال غنیمت تقسیم کیا تو ان کا بھی حصہ لگایا لیکن یہ حصہ کیا تھا؟ زر و جواہر نہ تھے، مال و اسباب نہ تھا اور درہم و دینار نہ تھے بلکہ صرف کھجوریں تھیں، تمام مجاہدین کو یہی ملا تھا اور ان پردہ نشینوں نے بھی یہی پایا تھا۔

یہ واقعہ ابوداؤد ❼ میں مذکور ہے۔ حدیث اور سیرت کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر غزوات میں مستورات ساتھ رہتی تھیں۔ جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں۔ جنگ احد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مشک میں پانی بھر بھر کر لانا اور زخمیوں کو پلانا اوپر گزر چکا ہے، لیکن یہ امر کہ عورتیں میدان جنگ سے تیر اٹھا اٹھا کر بھی لاتیں اور مجاہدین کو دیتی تھیں، صرف ابوداؤد نے ذکر کیا ہے لیکن سند صحیح متصل سے ذکر کیا ہے اس لئے شک کی گنجائش نہیں۔ یوں بھی عرب کی مستورات سے کم سے کم یہی توقع کی جا سکتی ہے۔

---

❶ صحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب غزوة خيبر: ٤٦٦٨۔ ❷ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة خيبر: ٤١٩٦۔ ❸ ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ تعدی اور حملہ کی ابتدا دشمنوں کی طرف سے تھی، اشعار کے بعض بعض الفاظ میں روایات کا اختلاف ہے۔ ❹ صحيح مسلم، ج ٢، ص: ٩٧۔ ❺ مسند احمد بن حنبل، ج ٤، ص: ٥٢۔

❻ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة خيبر: ٤٢٠٢۔

❼ ابو داود، كتاب الجهاد، باب في المرأة والعبد يحذيان من الغنيمة: ٢٧٢٩۔

چونکہ معلوم تھا کہ غطفان اہل خیبر کی مدد کو آئیں گے آنحضرت ﷺ نے مقام رجیع میں فوجیں اتاریں جو غطفان اور خیبر کے بیچ میں ہے، اسباب بار برداری خیمہ وخرگاہ اور مستورات یہاں چھوڑ دی گئیں [1] اور فوجیں خیبر کی طرف بڑھیں، غطفان یہ سن کر کہ اسلامی فوجیں خیبر کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہتھیار سجا کر نکلے لیکن آگے بڑھ کر جب ان کو معلوم ہوا کہ خود ان کا گھر خطرہ میں ہے تو واپس چلے گئے۔ [2]

خیبر میں چھ قلعے تھے، سالم، قموص، نطاۃ، قصارۃ، شق، مربطہ۔ اور جیسا کہ یعقوبی نے تصریح کی ہے ان میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے، ان سب میں قموص نہایت مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا۔ مرحب عرب کا مشہور پہلوان جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا اسی قلعہ کا رئیس [3] تھا، ابن ابی الحقیق کا خاندان جس نے مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر کی ریاست حاصل کر لی تھی یہیں رہتا تھا۔

لشکر اسلام جب خیبر کے قریب یعنی مقام صہباء میں پہنچا تو نماز عصر کا وقت آ چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے یہاں ٹھہر کر نماز عصر ادا کی، پھر کھانا طلب فرمایا، رسد کا ذخیرہ صرف ستو تھا وہی آپ نے بھی پانی میں گھول کر نوش فرمایا۔ [4] رات ہوتے ہوتے فوج اسلام خیبر کے سواد میں پہنچ گئی، عمارتیں نظر آئیں تو آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ ٹھہر جاؤ، پھر اللہ کا نام لے کر یہ دعا مانگی:

((انا نسئلك خير هذه القرية وخير اهلها وخير ما فيها ونعوذ بك من شرها وشر اهلها وشر ما فيها)) [5]

''اے اللہ! ہم تجھ سے اس گاؤں کی اور گاؤں والوں کی اور گاؤں کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔''

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ آپ ﷺ کا معمول عام تھا یعنی جب کسی مقام میں داخل ہوتے تھے تو پہلے یہ دعا مانگ لیتے تھے۔ چونکہ سنت نبوی یہ تھی کہ رات کو کسی مقام [6] پر حملہ نہیں کیا جاتا تھا اس لئے رات یہیں بسر کی۔ صبح کو خیبر میں داخلہ ہوا۔ یہودیوں نے مستورات کو ایک محفوظ مقام میں پہنچا دیا، رسد اور غلہ قلعہ ناعم میں یکجا کیا اور فوجیں قلعہ نطاۃ اور قموص میں فراہم کیں سلام بن مشکم بیمار تھا تاہم اس نے سب سے زیادہ حصہ لیا اور خود قلعہ نطاۃ میں آ کر فوج میں شرکت کی۔

آنحضرت ﷺ کا مقصود جنگ نہ تھا لیکن جب یہود نے بڑے بڑے سروسامان کے ساتھ جنگ کی تیاری کی تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے وعظ فرمایا اور جہاد کی ترغیب دی۔ تاریخ خمیس میں اس

---

[1] یہ تفصیل معجم البلدان (ج ٤، ص: ٢٢٩) ذکر رجیع میں ہے۔ [2] طبری، ج ٣، ص: ١٥٧٥، اصل عبارت یہ ہے، فبلغني ان غطفان لما سمعت بمنزل رسول الله ﷺ خيبر جمعوا له ثم خرجوا ليظاهروا يهود عليه حتى اذا ساروا منقلة سمعوا خلفهم في اموالهم واهاليهم حساطنوا ان القوم قد خالفوا اليهم فرجعوا على اعقابهم۔

[3] تاریخ یعقوبی، ج ٢، ص: ٥٦۔ [4] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر: ٤١٩٥۔

[5] سیرت ابن ہشام، ج ٢، ص: ٢٢٣۔ [6] صحیح بخاری میں اصل عبارت یہ ہے: ((اذا أتى قوما بليل لم يغربهم حتى يصبح)) باب غزوة خيبر: ٤١٩٧۔

موقع پر لکھا ہے:

ولما تیقن النبی ﷺ ان الیھود تحارب وعظ اصحابہ ونصحھم وحرضھم علی الجھاد۔

''اور جب آنحضرت ﷺ کو یقین ہو گیا کہ یہود لڑنے پر آمادہ ہیں تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو نصیحت کی اور جہاد کی ترغیب دی۔''

سب سے پہلے قلعہ ناعم پر فوجیں بڑھیں، حضرت محمود بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا اور دیر تک لڑتے رہے چونکہ سخت گرمی تھی، تھک کر دم لینے کے لئے قلعہ کی دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ کنانہ بن الربیع نے قلعہ کی فصیل سے چکی کا پاٹ ان کے سر پر گرایا جس کے صدمہ سے وفات پائی، لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا۔ [1]

ناعم کے بعد اور قلعے بہ آسانی فتح ہوتے گئے لیکن قلعہ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا، اس مہم پر آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو بھیجا لیکن دونوں ناکام واپس آئے، طبری میں روایت ہے کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاؤں نہ جم سکے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی کی لیکن فوج نے ان کی نسبت خود یہی شکایت کی۔ [2]

اس روایت کو طبری نے جس سلسلہ سند سے نقل کیا ہے اس کے راوی عوف ہیں۔ ان کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے لیکن بندار جب ان کی روایت بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ ''وہ رافضی اور شیطان تھا۔'' یہ لفظ بہت سخت ہے لیکن ان کی شیعیت سب کو تسلیم ہے [3] اور گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جائے شیعہ کی زبان سے اس روایت کا رتبہ کیا رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں لیکن محدثین کو اس بات میں شبہ ہے کہ ان کی جو روایتیں باپ کے سلسلہ میں منقول ہیں صحیح بھی ہیں یا نہیں؟ [4]

تاہم اس قدر ضرور صحیح ہے کہ اس مہم پر پہلے اور بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم بھیجے گئے تھے لیکن فتح کا فخر کسی اور کی قسمت میں تھا۔ جب مہم میں زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ فتح دے گا اور جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو چاہتا ہے اور اللہ اور اللہ کا رسول بھی اس کو چاہتے ہیں۔'' [5] یہ رات نہایت امید اور انتظار کی رات تھی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے تمام رات اس بے قراری میں کاٹی کہ دیکھئے یہ تاج فخر کس کے ہاتھ آتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر کبھی حکومت اور سروری کی تمنا نہیں کی لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علی رضی اللہ عنہ میں مذکور ہے

---

[1] ابن ہشام نے دو موقعوں پر اس واقعہ کا الگ ٹکڑا لکھا ہے یہ تفصیل خمیس (ج ۲، ص: ۴۶) سے لی گئی ہے۔

[2] تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۵۷۹۔ [3] میزان الاعتدال، ج ۲، ص: ۳۰۹۔

[4] ایضاً، ص: ۲۴۔ [5] یہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر: (۴۲۰۹) کے الفاظ ہیں۔

ان کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنا میں ان کی خودداری بھی قائم نہ رہ سکی۔ صبح کو دفعتاً یہ آواز کانوں میں آئی کہ علی رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟ یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی کیونکہ جناب موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا اور سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں، غرض حسب طلب وہ حاضر ہوئے، آنحضرت ﷺ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا اور دعا فرمائی جب ان کو علم عنایت ہوا تو انہوں نے عرض کیا کہ ''کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنا لیں۔'' ارشاد ہوا کہ ''بہ نرمی ان پر اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔'' [1] لیکن یہود اسلام یا صلح کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا باہر نکلا:

قد علمت خیبر انی مرحب شاکی السلاح بطل مجرب۔

''خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، دلیر ہوں تجربہ کار ہوں، سلاح پوش ہوں۔''

مرحب کے سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اس کے اوپر سنگی خود تھا، قدیم زمانہ میں گول پتھر بیچ سے خالی کر لیتے تھے یہی خود کہلاتا تھا۔ مرحب کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ رجز پڑھا:

انا الذی سمتنی امی حیدرہ کلیث غابات کریہ المنظرہ۔

''میں وہ ہوں کہ میری اماں نے میرا نام شیر رکھا تھا، میں شیر نیستان کی طرح مہیب و بدمنظر ہوں۔''

مرحب بڑے طمطراق سے آیا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی [2] پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا، اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں۔ معالم التنزیل میں ہے کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا لیکن ذوالفقار خود اور سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی، مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا تو اتفاق سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی، آپ نے قلعہ کا در جو سرتاپا پارۂ سنگ تھا اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا، اس واقعہ کے بعد ابو رافع نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا چاہا تو جگہ سے بھی نہ ہل سکا۔'' [3] یہ روایتیں ابن اسحاق اور حاکم نے روایت کی ہیں لیکن بازاری قصے ہیں۔ علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں تصریح کی ہے:

كلها واهية. [4] ''سب لغو روایتیں ہیں۔''

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد فروخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

---

[1] یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور صحیح بخاری، (کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر: ۴۲۱۰) میں منقول ہے۔ [2] طبری، ج ۳، ص: ۱۵۷۹، (یہ اشعار اور مختصر واقعات صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة ذی القرد وغیرہ: ۴۶۷۸ میں بھی ہیں)۔
[3] سیرت ابن هشام، ج ۲، ص: ۲۲۷ اور طبری، ج ۳، ص: ۱۵۸۱۔ [4] المقاصد الحسنة، ص ۹۲ مطبع علوی۔

"یہ روایت منکر ہے۔" [1] ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام سرے سے چھوڑ دیا ہے اور دوسرے میں اس مشترک نقص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں، جن کو امام بخاری اور ابوداؤد اور دارقطنی قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ [2]

ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا۔ مسند ابن حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے، [3] لیکن صحیح مسلم (اور حاکم ج ۲ ص ۳۹) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایت ہے۔ [4]

غرض یہ قلعہ (قموص) ۲۰ دن کے محاصرہ کے بعد فتح ہو گیا۔ ان معرکوں میں ۹۳ یہودی مارے گئے، جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر اور عامر زیادہ مشہور ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ۱۵ بزرگوں نے شہادت حاصل کی جن کے نام ابن سعد نے بہ تفصیل لکھے ہیں۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کر لیا گیا لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضہ میں رہنے دی جائے ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کریں گے، یہ درخواست منظور ہوئی، بٹائی کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ عبداللہ بن رواحہ کو بھیجتے تھے، وہ غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہتے تھے کہ اس میں سے جو حصہ چاہو لے لو، یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ "زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں۔" [5] خیبر کی زمین تمام مجاہدین پر جو اس جنگ میں شریک تھے تقسیم کر دی گئی، اسی میں آنحضرت ﷺ کا خمس بھی تھا۔

عام روایت ہے کہ مال غنیمت میں سے خمس کے علاوہ ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص طور پر علیحدہ کر لیا جاتا تھا جس کو صفی کہتے ہیں اس بنا پر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (زوجہ کنانہ بن الربیع) کو آپ ﷺ نے لے لیا اور آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کی تحقیق

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی نسبت بعض کتب حدیث وسیر میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے ان کو دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو دیا تھا، پھر کسی نے ان کے حسن کی تعریف کی تو ان سے مانگ لیا اور اس کے معاوضہ میں ان کو سات لونڈیاں دیں۔ مخالفین نے اس روایت کو نہایت بدنما پیرایہ میں ادا کیا ہے اور جب اصل روایت میں اتنی بات موجود ہے تو ظاہر ہے کہ مخالف اس سے کہاں تک کام لے سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، لیکن خود حضرت

---

[1] میزان الاعتدال، ج ۲، ص: ۲۱۸۔ [2] میزان الاعتدال، ترجمۃ بریدۃ بن سفیان، ج ۱، ص: ۱۴۲۔

[3] ج ۲، ص: ۱۱۵ مع شرح النووی مگر اس کو امام نووی نے مرجوح قول کی حیثیت سے نقل کیا ہے۔

[4] صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں۔ ((فضرب براس مرحب فقتلہ ثم کان الفتح علی یدیہ)) کتاب الجہاد، باب غزوۃ ذی قرد: ۴۶۷۸)۔ [5] فتوح البلدان بلاذری، ص: ۲۷؛ فتح خیبر وطبری، ج ۳، ص: ۱۵۸۹ (اصل روایت ابو داود، کتاب البیوع، باب المساقاۃ: ۳۴۱۰ میں موجود ہے)۔

انس رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتیں ہیں اور وہ باہم مختلف ہیں۔ بخاری کی جو روایت غزوۂ خیبر کے ذکر میں ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ جب قلعہ خیبر فتح ہوا تو لوگوں نے آپ کے سامنے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے حسن کا ذکر کیا، آپ نے ان کو اپنے لئے لے لیا۔ اصلی الفاظ یہ ہیں:

فلما فتح اللّٰه عليه الحصن ذكر له جمال صفية بنت حيي بن اخطب وقد قتل زوجها وكانت عروسًا فاصطفاها النبي ﷺ لنفسه۔ ❶

''جب اللہ نے قلعہ فتح کرا دیا تو لوگوں نے آپ سے صفیہ بنت حیی کے حسن و جمال کی تعریف کی۔ اس کا شوہر اس جنگ میں مارا گیا تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کو اپنے لئے پسند کر لیا۔''

لیکن بخاری کتاب الصلوٰۃ ❷ صحیح مسلم ❸ میں خود حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہی روایت اس طریقہ سے منقول ہے کہ جب لڑائی کے بعد قیدی جمع کئے گئے تو حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان میں سے ایک لونڈی مجھ کو عنایت ہو۔ آپ نے ان کو اختیار دیا کہ خود جا کر کوئی لونڈی لے لو، انہوں نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو انتخاب کیا لیکن لوگوں کو اعتراض ہوا، ایک شخص نے آ کر آنحضرت ﷺ سے کہا:

يا نبي اللّٰه اعطيت دحية صفية بنت حيي سيدة قريظة والنضير لا تصلح الا لك۔

''اے اللہ کے پیغمبر! آپ نے صفیہ رضی اللہ عنہا کو دحیہ کے حوالہ کیا، وہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ ہے اور آپ کے سوا اور کوئی اس کے لائق نہیں۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ ابوداود ❹ میں یہ دونوں روایتیں ہیں اور دونوں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، ابوداؤد کی شرح میں مازری (مشہور محدث) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو اس لئے دحیہ رضی اللہ عنہ سے لے کر ان سے عقد کیا کہ

لما فيه من انتهاكها مع مرتبتها و كونها بنت سيدهم۔ ❺

''چونکہ وہ عالی رتبہ اور رئیس یہود کی صاحبزادی تھیں اس لئے ان کا کسی دوسرے کے پاس جانا ان کی توہین تھی۔''

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فتح الباری میں اس کے قریب قریب لکھا ہے۔

❶ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة خيبر: ٤٢١١۔ ❷ صحيح بخاري، كتاب الصلوٰة، باب مايذكر في الفخذ: ٣٧١۔ ❸ صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب فضيلة اعتاقه امته ثم يتزوجها: ٣٤٩٧۔
❹ ابو داود، كتاب الخراج، باب ما جاء في سهم الصفي: ٢٩٩٨۔ ❺ حاشيه ابوداود، ج ١، ص: ٤٢١۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں ان کا شوہر بھی قبیلہ نضیر کا رئیس تھا، باپ اور شوہر دونوں قتل کیے جا چکے تھے اس حالت میں ان کے پاسِ خاطر، حفظِ مراتب اور رفعِ غم کے لیے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت ﷺ ان کو اپنے عقد میں لے لیں۔ وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کی خاندانی عزت کے لحاظ سے ان کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا۔ (بلکہ مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں یا آپ ﷺ کے نکاح میں آنا قبول کریں۔ انہوں نے دوسری صورت پسند کی یعنی یہ کہ وہ آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آ جائیں [1] حسن خلق، رحم اور مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی۔ اس قسم کے طرز عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثہ کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے۔

غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور اس سلوک کا جو اثر ہوا وہ اوپر گزر چکا ہے۔

فتح کے بعد آنحضرت ﷺ نے چند روز خیبر میں قیام کیا اگرچہ یہود کو کامل امن و امان دیا گیا اور ان کے ساتھ ہر طرح کی مراعات کی گئی تاہم ان کا طرز عمل مفسدانہ اور باغیانہ رہا۔ پہلا دیباچہ یہ تھا کہ ایک دن زینب نے جو سلام بن مشکم کی بیوی اور مرحب کی بھاوج تھی آنحضرت ﷺ کی چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ دعوت کی، آپ نے فرط کرم سے قبول فرمایا۔ زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا آپ نے ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا لیکن بشر بن براء نے پیٹ بھر کر کھایا اور زہر کے اثر سے بالآخر ہلاک ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے زینب کو بلا کر پوچھا، اس نے جرم کا اقبال کیا، یہود نے کہا: ہم نے اس لیے زہر دیا کہ اگر آپ ﷺ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپ کے ہاتھ سے نجات مل جائے گی۔'' [2]

آنحضرت ﷺ کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے۔ اس بنا پر آپ نے زینب سے تعرض نہیں فرمایا لیکن جب دو تین دن کے بعد بشر زہر کے اثر سے انتقال کر گئے تو وہ قصاص میں قتل کر دی گئی۔ [3]

ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبداللہ بن سہیل اور حضرت محیصہ رضی اللہ عنہما قحط سالی کے زمانہ میں خیبر گئے یہود نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دھوکے سے قتل کر کے ایک نہر میں ڈال دیا، حضرت محیصہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر واقعہ بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے قتل کیا؟'' عرض کیا کہ حضور وہ تو پچاس مسلمانوں کو قتل کر کے بھی جھوٹی قسم کھا لیں گے، غرض

[1] مسند ابن حنبل، ج ۳، ص: ۱۳۸، ۱۳۹ مصر، (س) [2] مسند احمد، ج ۲، ص: ۴۵۱ وتاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۵۸۳، ۱۵۸۴۔ [3] زاد المعاد، ج ۱، ص: ۳۹۸۔

آنحضرت ﷺ نے یہود سے تعرض نہیں کیا اور بیت المال سے مقتول کا خون بہا دلا دیا۔ (1)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں یہود نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سوتے میں کوٹھے پر سے گرا دیا کہ ان کا ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گیا۔ اس طرح ہمیشہ فساد انگیزیاں کرتے رہتے تھے مجبور ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کے اضلاع میں جلاوطن (2) کر دیا (یہ جملہ معترضہ سلسلہ کلام میں آ گیا تھا)

خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور وہ اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہوگئی ہے، یعنی یہ کہ اول آپ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا تھا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں گے۔ لیکن جب کنانہ بن ابی الحقیق نے خزانہ کے بتانے سے انکار کیا تو آپ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہوگئی۔ (3) بالآخر آپ نے کنانہ کو قتل کرا دیا اور تمام یہودی لونڈی غلام بنا لئے گئے۔ (4)

اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ قتل کر دیا گیا، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ خزانہ کے بتانے سے انکار کرتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، طبری میں تصریح ہے:

> ثم دفعه رسول الله الى محمد بن مسلمة فضرب عنقه باخيه محمود بن مسلمة۔ (5)
>
> ''پھر آنحضرت ﷺ نے کنانہ کو محمد بن مسلمہ کے حوالہ کیا، انہوں نے اپنے بھائی محمود بن مسلمہ کے قصاص میں اس کو قتل کر دیا۔''

باقی روایت کا یہ حال ہے کہ یہ روایت طبری اور ابن ہشام دونوں نے ابن اسحاق سے روایت کی ہے لیکن ابن اسحاق نے اوپر کے کسی راوی کا نام نہیں بتایا، محدثین نے رجال کی کتابوں میں تصریح کی ہے کہ ابن اسحاق یہودیوں سے مغازیٔ نبوی کے واقعات روایت کرتے تھے۔ (6) اس روایت کو بھی انہی روایتوں میں سمجھنا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ ابن اسحاق ان راویوں کا نام نہیں لیتے۔

کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لئے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ جھاڑی جائے رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بہت ارفع ہے۔ وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا کیا

---

(1) صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب کتاب الحاکم الی عماله: ۷۱۹۲ وصحیح مسلم، کتاب القسامة: ۴۳۴۲۔۴۳۴۹۔ (2) فتوح البلدان بلاذری، (ص: ۳۱، مطبعه موسوعات مصر: ۱۳۱۹ ھ) اور صحیح بخاری، (کتاب الشروط، باب اذا اشترط فی المزارعة اذا شئت اخرجتك: ۲۷۳۰)

(3) یہ پوری تفصیل تاریخ طبری، (ج۳، ص:۱۵۸۲) میں مذکور ہے ابن ہشام میں بھی اس کے قریب قریب ہے۔

(4) فتوح البلدان بلاذری، ص: ۲۴ لائیڈن ۱۸۶۶ء۔ (5) تاریخ طبری، ج۳، ص: ۱۵۸۲ و سیرت ابن ہشام، ج۲، ص:۲۲۹۔ (6) میزان الاعتدال، ج۳، ص۲۱۔ ابن اسحاق کی منقطع روایتوں کو محدثین نے بھی منکر قرار دیا ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے۔ وهو صالح الحديث ماله عندی ذنب الا ما قد حشا فی السيرة من الاشياء المنكرة المنقطعة۔

چند سکوں کے لئے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے؟

اصل واقعہ اس قدر تھا کہ کنانہ ابی الحقیق کو اس شرط پر امان دی گئی تھی کہ کسی قسم کی بدعہدی اور خلاف بیانی نہ کرے گا۔ [1] اس نے یہ بھی منظور کیا تھا (بلکہ ایک روایت میں ہے) کہ اگر اس کے خلاف اس نے کچھ کیا تو وہ قتل کا مستحق ہوگا۔ [2]

کنانہ نے بدعہدی کی اور جو امن اس کو دیا گیا تھا ٹوٹ گیا۔ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا اب اس کے قصاص میں وہ قتل کر دیا گیا۔ جیسا کہ ابھی ہم نے طبری کی روایت سے نقل کیا ہے۔

اب دیکھو اس روایت میں کیا کیا واقعات اضافہ ہوگئے۔

① قتل کا واقعہ کنانہ کے ساتھ خاص تھا، خزانہ کے چھپانے کا وہی مجرم تھا، محمود بن مسلمہ کو اسی نے قتل کیا تھا اس لئے وہی قتل بھی کیا جا سکتا تھا، اضافہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ابن سعد نے بکر بن عبدالرحمٰن سے جو روایت متصل نقل کی ہے اس میں کنانہ کے ساتھ اس کے بھائی کا بھی نام بڑھا دیا ہے، یعنی دونوں قتل کیے گئے۔

فضرب اعناقهما وسبى اهليهما۔ [3]

''تو آنحضرت ﷺ نے دونوں کو قتل کرا دیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا۔''

② یہاں تک بھی خیریت تھی لیکن ابن سعد نے عفان بن مسلم سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہوگئی ہے، یعنی دونوں بھائیوں کے ساتھ تمام یہودی گرفتار اور لونڈی غلام بنا لئے گئے۔

فلما وجد المال الذى غيبوه فى مسك الجمل سبى نساء هم۔ [4]

''تو جب وہ خزانہ مل گیا جس کو انہوں نے اونٹ کی کھال میں چھپا رکھا تھا تو ان کی عورتیں گرفتار کیں اور لونڈیاں بنا لیں۔''

لیکن جب یہ روایتیں محدثانہ اصول تنقید سے جانچی جاتی ہیں تو چھلکے اترتے جاتے ہیں اور اصل حقیقت رہ جاتی ہے، یہود کا قتل اور زن و بچہ کا گرفتار ہونا ایک طرف خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ کنانہ کا بھائی تک قتل نہیں کیا گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک موجود تھا۔ صحیح بخاری میں ہے:

فلما اجمع عمر على ذالك اتاه احد بنى ابى الحقيق فقال يا امير المؤمنين! اتخرجنا وقد اقرنا محمد وعاملنا على الاموال۔ [5]

''پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ارادہ کر لیا تو ابوالحقیق کا ایک بیٹا ان کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المؤمنین! آپ ہم کو نکالتے ہیں حالانکہ ہم کو محمد ﷺ نے رہنے دیا تھا اور خراج پر معاملہ کیا تھا۔''

---

[1] ابو داود، كتاب الخراج، باب ما جاء فى حكم ارض خيبر: ٣٠٠٦۔ [2] طبقات ابن سعد، غزوة خيبر، ج ٢، ق اول ص: ٨١، سطر: ٢٤۔ [3] طبقات ابن سعد، غزوة خيبر، ص: ٨١، سطر: ٢٧۔

[4] طبقات ابن سعد، جزء ثانى، قسم اول، غزوة خيبر، ص: ٨٠، سطر: ٥۔

[5] صحيح بخارى، كتاب الشروط، باب اذا اشترط فى المزارعة اذا شئت اخرجتك: ٢٧٣٠۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ یہ وہی کنانہ بن ابی الحقیق کا بھائی تھا۔ [1]
حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں عام روایتوں کی وسعت کو گھٹا کر اس حد تک پہنچایا کہ

ولم یقتل رسول اللہ ﷺ بعد الصلح الا ابنی ابی الحقیق۔ [2]

''آنحضرت ﷺ نے صلح کے بعد ابن ابی الحقیق کے دونوں بیٹوں کے سوا اور کسی کو قتل نہیں کیا۔''

لیکن حافظ موصوف کو اگر صحیح بخاری کی عبارتِ مذکورہ بالا پیش نظر ہوتی تو غالباً یہ تعداد اور بھی گھٹ جاتی۔

ابوداؤد میں جہاں ارض خیبر کا عنوان باندھا ہے، صرف ابن اَبی الحقیق کا قتل کیا جانا لکھا ہے۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ابوداؤد میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سعیۃ (حیی بن اخطب کے چچا) سے پوچھا تھا کہ وہ خزانہ کیا ہوا؟ اس نے کہا لڑائیوں میں صرف ہو گیا۔ باوجود اس کے آنحضرت ﷺ نے صرف کنانہ کے قتل کا حکم دیا، [3] یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ کنانہ کا قتل محمود بن مسلمہ کے قصاص میں ہوا تھا ورنہ اگر خزانہ کے چھپانے کا جرم قتل کا سبب ہوتا تو اس جرم کے مجرم اور بھی تھے۔

مؤرخین نے پہلی غلطی یہ کی کہ کنانہ کے قتل کا سبب اخفائے خزانہ سمجھے اور چونکہ اس جرم میں اور لوگ بھی شریک تھے اس لئے یہ تعمیم خود بخود پیدا ہوگئی کہ کنانہ کا تمام خاندان قتل کر دیا گیا۔

ایک اور نکتہ

اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ خیبر کا واقعہ محرم میں پیش آیا، یعنی آنحضرت ﷺ جب اس ارادہ سے مدینہ سے نکلے تو محرم کی اخیر تاریخیں تھیں محرم میں لڑائی شرعاً ممنوع ہے، اس لئے محدثین اور فقہا میں اس کی توجیہ کے متعلق اختلاف پیدا ہوا۔ بہت سے فقہا کا یہ مذہب ہے کہ اوائل میں البتہ ان مہینوں میں لڑائی شرعاً ممنوع تھی لیکن پھر وہ حکم منسوخ ہو گیا۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حرمت کا پہلا حکم جو نازل ہوا تھا وہ اس آیت کی رو سے تھا:

﴿ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ﴾. (۲/ البقرۃ:۲۱۷)

''کہہ دو کہ اس مہینے میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا ہے۔''

پھر سورۂ مائدہ میں یہ آیت اتری:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ ﴾. (۵/ المآئدۃ:۲)

''مسلمانو! اللہ کی حد بندیوں کی اور ماہ حرام کی بے حرمتی نہ کرو۔''

یہ پچھلی آیت پہلی آیت کے آٹھ برس بعد نازل ہوئی۔ اس وسیع زمانہ تک تو حرمت کا حکم باقی رہا۔ اب وہ کونسی آیت یا حدیث ہے جس سے یہ حکم منسوخ ہو گیا؟

---

[1] فتح الباری، ج۵، ص: ۲۴۰۔ [2] زاد المعاد، ج ۱، ص: ۳۹۵۔
[3] ابوداود، کتاب الخراج، باب ما جاء فی حکم ارض خیبر: ۳۰۰۶۔

وليس في كتاب الله ولا سنة رسوله ناسخ لحكمها.

''اور اللہ کی کتاب اور حدیث میں ان آیتوں کے حکم کا کوئی ناسخ نہیں۔''

مجوزین نے یہ استدلال کیا ہے کہ فتح حرم، طائف کا محاصرہ، بیعت رضوان، یہ سب ماہ حرام میں ہوئے تھے۔ اس لئے اگر ماہ حرام میں لڑائی جائز نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ ان کو کیونکر جائز رکھتے۔ حافظ ابن القیم نے جواب دیا ہے کہ ماہ حرام میں ابتداءً جنگ کرنا حرام ہے لیکن اگر دشمن کا مدافعہ مقصود ہے تو بالاتفاق جائز ہے، وہ سب واقعات دفاعی تھے۔ آنحضرت ﷺ نے پیش دستی نہیں کی تھی بلکہ دفاع کیا گیا تھا۔ بیعت رضوان اس لئے لی گئی تھی کہ یہ خبر مشہور ہوگئی تھی کہ کفار نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو (جو سفیر ہو کر گئے تھے) قتل کر دیا۔ طائف کا محاصرہ کوئی مستقل جنگ نہ تھی بلکہ غزوۂ حنین کا بقیہ تھا جس میں خود کفار ہر طرف سے جمع ہو کر حملہ آور ہوئے تھے۔ فتح حرم کا واقعہ حدیبیہ کی شکست کا نتیجہ تھا جس کی ابتدا قریش نے کی تھی۔ [1]

حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت صحیح جواب دیا لیکن خاص خیبر کے معاملہ میں وہ اس گرہ کو نہ کھول سکے اور بحث نامفصل رہ گئی۔ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے استاد علامہ ابن تیمیہ کو بھی اس موقع پر اشتباہ ہوا، انہوں نے "الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح" میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس قدر لڑائیاں کیں سب دفاعی تھیں، صرف بدر اور خیبر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن اگر علامہ موصوف زیادہ استقصا کرتے تو ثابت ہوتا کہ بدر اور خیبر بھی مستثنیٰ نہیں، بدر کا بیان اوپر گزر چکا ہے، خیبر کے ماسبق واقعات کو ترتیب دیکر دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ یہود اور غطفان مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

تقسیم زمین

خیبر کی زمین دو برابر حصوں میں تقسیم کی گئی، نصف بیت المال، مہمانی اور سفارت وغیرہ کے مصارف کے لئے خاص کر لیا گیا۔ باقی نصف مجاہدین پر جو اس غزوہ میں شریک تھے، مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا، کل فوج کی تعداد چودہ سو تھی، دو سو سوار تھے، سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لئے پیدل سے دوگنا ملتا تھا، اس بنا پر یہ تعداد اٹھارہ سو کے برابر تھے، اس حساب سے کل جائداد کے اٹھارہ سو حصے کئے گئے اور ہر مجاہد کے حصہ میں ایک حصہ آیا، جناب سرور کائنات ﷺ کو بھی عام مجاہدین کے برابر ایک ہی حصہ ملا۔

ولرسول الله ﷺ مثل سهم واحدهم۔ [2]

''اور آنحضرت ﷺ کا بھی عام لوگوں کی طرح ایک حصہ تھا۔''

ملکی حالت اور احکام فقہی

خیبر کی فتح سے اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دور شروع ہوتا ہے، اسلام کے حقیقی دشمن صرف دو

---

[1] زادالمعاد، ذكر غزوة خيبر، ج١، ص: ٤٠٠۔ [2] فتوح البلدان بلاذری، ذکر غزوۃ خیبر (ابوداود، کتاب الخراج، باب ماجاء فی حکم ارض خیبر: ٣٠١٤ میں ہے: النبي ﷺ معهم له سهم كسهم احدهم)۔ (س)

تھے، مشرکین اور یہود اگرچہ مذہباً باہم مختلف تھے لیکن سیاسی اسباب کی بنا پر ان میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ مدینہ کے یہود عموماً انصار کے حلیف تھے اسی طرح خیبر کے یہود غطفان کے حلیف تھے، اب آنحضرت ﷺ کے مقابلہ کے لئے مکہ اور مدینہ کے مشرکین اور منافقین سب مل کر کنفس واحدۃ ہو گئے، خیبر کی فتح کے بعد یہود کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور مشرکین کا ایک بازو جاتا رہا۔

اب تک اسلام چاروں طرف سے نرغہ کی حالت میں تھا، اس بنا پر بجز عقائد اور ضروری عبادت کے شریعت کے اور احکام کی تاسیس و تعلیم کا موقع نہ تھا، شریعت کے احکام جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے حالات کے اقتضا سے بتدریج آئے ہیں، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ خیبر کی فتح سے ادھر تو یہود کی فتنہ انگیزیوں سے نجات ملی ادھر حدیبیہ کی صلح سے مشرکین کی طرف سے فی الجملہ اطمینان حاصل ہوا، اس بنا پر اب مسلمان جدید فقہی احکام کی تعمیل کے قابل ہو چکے تھے۔

ارباب سیر نے غزوۂ خیبر کے تذکرہ میں عموماً ذکر کیا ہے کہ اس موقع پر متعدد جدید فقہی احکام نازل ہوئے [1] اور آنحضرت ﷺ نے ان کی تبلیغ کی، ان کی تفصیل یہ ہے:

① پنجہ سے شکار کرنے والے پرند حرام ہوئے۔

② درندہ جانور حرام کر دیے گئے۔

③ گدھا اور خچر حرام کر دیا گیا۔

④ اب تک معمول تھا کہ لونڈیوں سے فوراً تمتع جائز سمجھا جاتا تھا، اب استبراء کی قید ہو گئی، یعنی اگر وہ حاملہ ہے تو وضع حمل تک، ورنہ ایک مہینہ تک تمتع جائز نہیں۔

⑤ چاندی سونے کا بہ تفاضل خریدنا حرام ہوا۔

⑥ بعض روایتوں میں ہے کہ متعہ بھی اسی غزوہ میں حرام ہوا۔

وادی القریٰ اور فدک

تیماء اور خیبر کے درمیان ایک وادی ہے جس میں بہت سی بستیاں آباد ہیں، اس کو وادی القریٰ کہتے ہیں قدیم زمانہ میں عاد و ثمود یہاں آباد تھے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ عاد و ثمود کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ اسلام سے پہلے ان بستیوں میں یہود آ کر آباد ہوئے اور زراعت اور آب رسانی کو بہت ترقی دی اور اب یہود کا مخصوص مرکز بن گیا تھا۔ [2]

خیبر کے بعد آنحضرت ﷺ نے وادی القریٰ کا رخ کیا، لیکن لڑنا مقصود نہ تھا، مگر یہود پہلے سے تیار تھے، انہوں نے فوراً تیر اندازی شروع کر دی، آنحضرت ﷺ کا محمل آپ کے غلام حضرت مدعم رضی اللہ عنہ اتار

---

[1] یہاں نزول سے وحی متلو یعنی قرآن مراد نہیں ہے۔ [2] معجم البلدان لفظ قری، ج ۷، ص: ۷۳، (س)۔

رہے تھے کہ ایک تیر آیا اور وہ جاں بحق ہوئے۔ عام مؤرخین نے یہود کی تیاری کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن امام بیہقی نے صاف تصریح کی ہے۔

وقد استقبلتنا یهود بالرمی ولم نکن علی تعبیة ❶

''یہود ہمارے مقابلہ کو تیر ے چلاتے ہوئے نکلے اور ہم تیار نہ تھے۔''

بہر حال جنگ شروع ہوگئی لیکن تھوڑے سے مقابلہ کے بعد یہود نے سپر ڈال دی اور خیبر کے شرائط کے موافق صلح ہوگئی۔

ادائے عمرہ

صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال آنحضرت ﷺ مکہ میں آ کر عمرہ ادا کریں گے اور تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں گے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے اس سال عمرہ ادا کرنا چاہا اور اعلان کرا دیا کہ جو لوگ واقعہ حدیبیہ میں شریک تھے ان میں سے کوئی رہ نہ جائے چنانچہ بجز ان لوگوں کے جو اس اثنا میں مر چکے تھے، سب نے یہ سعادت حاصل کی۔ معاہدہ میں شرط تھی کہ مسلمان مکہ میں آئیں تو ہتھیار ساتھ نہ لائیں، اس لئے اسلحہ جنگ بطن یاجج میں جو مکہ سے آٹھ میل ادھر ہے چھوڑ دیے گئے اور دو سو سواروں کا ایک دستہ اسلحہ کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا گیا۔

آنحضرت ﷺ لبیک کہتے ہوئے حرم کی طرف بڑھے، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اونٹ کی مہار تھامے ہوئے آگے آگے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے: ❷

خلوابنی الکفار عن سبیله	''کافرو! سامنے سے ہٹ جاؤ
الیوم نضربکم علی تنزیله	آج جو تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے
ضربًا یزیل الهام عن مقیله	وہ وار جو سر کو خوابگاہ سر سے الگ کر دے
ویذهل الخلیل عن خلیله	اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے۔''

صحابہ کا جم غفیر ساتھ تھا۔ برسوں کی دیرینہ تمنا اور فرض مذہبی بڑے جوش کے ساتھ ادا کر رہا تھا، اہل مکہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی آب وہوا نے کمزور کر دیا ہے، اس بنا پر آپ نے حکم دیا کہ لوگ طواف کے تین پہلے پھیروں میں اکڑتے ہوئے چلیں۔ عربی زبان میں اس کو ''رمل'' کہتے ہیں، چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے۔

اہل مکہ نے اگرچہ چار و ناچار عمرہ کی اجازت دے دی تھی تاہم ان کی آنکھیں اس منظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی تھیں، رؤسائے قریش نے عموماً شہر خالی کر دیا اور پہاڑوں پر چلے گئے۔ تین دن کے بعد

---

❶ زرقانی، بر مؤطا بہ حوالہ بیہقی، باب الجهاد ذکر غلول، ص: ۳۱۳، (س)۔

❷ یہ اشعار اور یہ واقعہ ترمذی نے شمائل (باب صفة کلام رسول اللہ ﷺ فی الشعر: ۲۴۵) میں نقل کیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: ''محمد ﷺ سے کہہ دو کہ شرط پوری ہوچکی، اب مکہ سے نکل جائیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی آپ ﷺ اسی وقت روانہ ہو گئے، چلتے وقت حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صغیر السن صاحبزادی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں، آنحضرت ﷺ کے پاس ''چچا چچا'' ❶ کہتی دوڑی آئیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہاتھوں میں اٹھالیا، لیکن حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دعوے پیش کیے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ، کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، زید کہتے تھے کہ حمزہ رضی اللہ عنہ میرے مذہبی بھائی تھے، اس رشتہ سے یہ میری بھتیجی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دعویٰ تھا کہ میری ہمشیرہ بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت ﷺ نے سب کے دعوے مساوی الدرجہ دیکھ کر ان کو اسماء کی گود میں دیا، وہ امامہ کی خالہ تھیں، پھر فرمایا کہ ''خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔'' ❷

---

❶ آنحضرت ﷺ رشتہ میں ان کے بھائی تھے لیکن انہوں نے تعظیماً کہا (یا اس لیے کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دونوں رضاعی بھائی تھے)۔ ❷ اس واقعہ کا بڑا حصہ صحیح بخاری (کتاب المغازی، باب عمرة القضاء: ٤٢٥١) سے ماخوذ ہے، بعض زائد تفصیلیں زرقانی سے لی گئی ہیں جو کتب حدیث کے حوالہ سے زرقانی نے نقل کی ہیں۔

۸ھ غزوۂ موتہ

جمادی الاولیٰ ۸ھ

موتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے جو بلقا سے اس طرف ہے۔ عرب میں جو مشرقی تلواریں مشہور ہیں وہ یہیں بنتی تھیں۔ ❶ کثیر مشہور شاعر کہتا ہے:

صوارم یجلوھا بموتۃ صیقل۔

''وہ تلواریں جن کو موتہ میں صیقل گر جلا دیتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے شاہ بُصریٰ یا قیصر روم کے نام ایک خط لکھا تھا، عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں جو عرب رؤسا حکمران تھے ان میں ایک شرحبیل بن عمرو بھی تھا جو اسی علاقہ بلقا کا رئیس اور قیصر کا ماتحت تھا۔ یہ عربی خاندان ایک مدت سے عیسائی تھا اور شام کے سرحدی مقامات میں حکمران تھا، یہ خط حارث بن عمیر لے کر گئے تھے، شرحبیل نے ان کو قتل کر دیا، اس کے قصاص کے لئے آنحضرت ﷺ نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو جو آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، سپہ سالاری ملی اور ارشاد ہوا کہ اگر ان کو دولت شہادت نصیب ہو تو جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور وہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ فوج کے سردار ہوں ❷ حضرت زید رضی اللہ عنہ غلام تھے گو آزاد ہو چکے تھے، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت ﷺ کے مقرب خاص تھے، عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے، اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ جعفر و عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما کے ہوتے زید کو افسر کرنا کس بنا پر ہے، چنانچہ لوگوں میں چرچے ہوئے ❸ لیکن اسلام جس مساوات کے قائم کرنے کے لئے آیا تھا اس کے لئے اسی قسم کا ایثار درکار تھا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی مہم میں جس میں تمام مہاجرین کو شرکت کا حکم ہوا تھا آنحضرت ﷺ نے انہی زید رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو فوج کا افسر مقرر کیا تھا، اس وقت بھی لوگوں میں چرچے ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے سنا تو خطبہ دیا اور فرمایا کہ ''تم لوگوں نے ان کے باپ کی افسری پر بھی اعتراض کیا تھا حالانکہ یقیناً وہ افسری کے قابل تھے۔'' چنانچہ صحیح بخاری ❹ میں بہ تفصیل یہ واقعہ منقول ہے۔ گو یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی۔ لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصلی محور تبلیغ اسلام تھا، ارشاد ہوا کہ پہلے ان کو دعوت اسلام دی جائے، اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو جنگ کی ضرورت نہیں، یہ بھی حکم ہوا کہ اظہار ہمدردی کے لئے اس مقام پر جانا جہاں حارث بن عمیر نے ادائے فرض میں جان دی ہے، ثنیۃ الوداع تک آنحضرت ﷺ خود فوج کی

❶ معجم البلدان لفظ موتہ، ج ۸، ص: ۱۹۰۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ موتہ: ۴۲۶۱۔ ❸ فتح الباری، ج ۷، ص: ۳۹۳۔ (س)۔

❹ کتاب المغازی، باب بعث النبی ﷺ اسامۃ بن زید فی مرضہ الذی تو فی فیہ: ۴۴۶۹۔

مشایعت کے لئے تشریف لے گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پکار کر دعا کی کہ اللہ سلامت اور کامیاب لائے۔ ❶

فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو جاسوسوں نے شرحبیل کو خبر دی جس نے مقابلہ کے لئے کم وبیش ایک لاکھ فوج تیار کی۔ ادھر خود قیصر روم (ہرقل) قبائل عرب کی بے شمار فوج لے کر مآب میں خیمہ زن ہوا جو بلقاء کے اضلاع میں ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے یہ حالات سن کر چاہا کہ ان واقعات کی دربار رسالت میں اطلاع دی جائے اور حکم کا انتظار کیا جائے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہمارا اصل مقصد فتح نہیں بلکہ دولت شہادت ❷ ہے جو ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے۔

غرض یہ مختصر گروہ آگے بڑھا اور ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا، حضرت زید رضی اللہ عنہ برچھیاں کھا کر شہید ہوئے، ان کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے علم ہاتھ میں لیا، گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں پھر اس بے جگری سے لڑے کہ تلواروں سے چور ہو کر گر پڑے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ میں نے ان کی لاش دیکھی تھی، تلواروں اور برچھیوں ❸ کے ۹۰ (سے زائد) زخم تھے لیکن سب کے سب سامنے کی جانب تھے، پشت نے یہ داغ نہیں اٹھایا تھا، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ بھی داد شجاعت دے کر شہید ہوئے۔

اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ سردار بنے اور نہایت بہادری سے لڑے صحیح بخاری میں ہے کہ آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں ❹ لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا مقابلہ کیا تھا، بڑی کامیابی یہی تھی کہ فوجوں کو دشمن کی زد سے بچا لائے۔ جب یہ شکست ❺ خوردہ فوج مدینہ کے قریب پہنچی اور اہل شہر ان کی مشایعت کو نکلے تو لوگ غم خواری کے بجائے ان کے چہروں پر خاک پھینکتے تھے کہ او فرار یو! تم اللہ کی راہ سے بھاگ آئے۔

---

❶ طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۹۳ (س)۔ ❷ ابن ہشام، غزوۃ موتۃ، ج ۲، ص: ۲۵۲۔ (س)

❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ موتۃ: ۴۲۶۰، ۴۲۶۱۔ ❹ ایضاً: ۴۲۶۵، ۴۲۶۶۔ (س)

❺ مصنف نے یہاں ابن اسحاق کی روایت پر اعتماد کر کے اس فوج کو شکست خوردہ لکھا ہے اور ان کی واپسی پر ان سب کو بلا امتیاز فراری ہونے کا مستحق ظاہر کیا ہے لیکن جیسا کہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ موتۃ: ۴۲۶۲ میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے از روئے وحی فرمایا کہ پھر اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد سیف اللہ نے مسلمانوں کے علم کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا ((فتح اللہ علیھم)) ارباب سیر اور اہل روایت اور شراح حدیث اس غلبہ یا فتح کی تشریح میں مختلف ہیں۔ ایک فریق کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پوری فتح حاصل ہوئی۔ دوسرے کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور فتح یہ ہے کہ مسلمان اس قلت تعداد اور کفار اپنی کثرت کے باوجود تھک کر غیر منفصل جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کے مقابلہ سے ہٹ آئے۔ تیسرا فریق یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو فتح کفار کے ایک خاص دستہ کے مقابلہ میں حاصل ہوئی اور اس سے مال غنیمت بھی حاصل کیا۔ چوتھا بیان یہ ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ یہ ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اتنے بڑے لشکر کے حملوں کو روک دیا اور بہ سلامت پیچھے ہٹ آئے۔ اس مقام پر فتح الباری، روض الانف سہیلی اور البدایہ ابن کثیر ملاحظہ کرنی چاہیے۔ اسی طرح مسلمانوں کی جس فوج کو اپنے اوپر فراری ہونے کا گمان تھا یا مسلمانوں نے ان کو فراری کہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی کہ نہیں تم فراری نہیں بلکہ پھر دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو، اس کی مخاطب پوری اسلامی فوج نہیں بلکہ ان کی فوج کا ایک خاص دستہ تھا جو جلدی کر کے پہلے مدینہ چلا آیا تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری، روض الانف سہیلی، والبدایہ ابن کثیر، باب غزوۃ موتۃ، (س)۔

رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے آپ کو خاص محبت تھی ان کی شہادت کا نہایت قلق تھا۔ آپ مسجد میں جا کر غمزدہ بیٹھے۔ اسی حالت میں ایک شخص نے آ کر کہا کہ جعفر رضی اللہ عنہ کی مستورات رو رہی ہیں، اور ماتم کر رہی ہیں آپ ﷺ نے منع کرا بھیجا، وہ گئے اور واپس آ کر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں، آپ نے دوبارہ بھیجا، وہ پھر گئے اور واپس آ کر عرض کی کہ ہم لوگوں کی نہیں چلتی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تو ان کے منہ میں خاک بھر دو''۔ یہ واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح بخاری میں منقول ہے، صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس شخص سے کہا کہ اللہ کی قسم! تم یہ نہ کرو گے (منہ میں خاک ڈالنا) اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف سے نجات نہ ملے گی۔ [1]

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ موتۃ من أرض الشام: ٤٢٦٣۔

فتح مکہ

رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾ (۴۸/ الفتح:۱)

جانشین ابراہیم (علیہ السلام) کا سب سے مقدم فرض توحید خالص کا احیا اور حرم کعبہ کا آلائش سے پاک کرنا تھا۔ لیکن قریش کے پے در پے حملوں اور عرب کی مخالفت عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض کو روک رکھا۔ صلح حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لئے امن و امان قائم ہو گیا اور دلدادگان حرم ایک دفعہ یادگار ابراہیمی کو غلط انداز نظر سے دیکھ آئے، لیکن معاہدۂ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا۔ حلم وعفو وتحمل کی حد ہو چکی، اب وقت آ گیا کہ آفتاب حق حجاب ہائے حائل کو چاک کر کے باہر نکل آئے۔

صلح حدیبیہ کی بنا پر قبائل عرب میں خزاعہ آنحضرت ﷺ کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف بنوبکر نے قریش سے محالفت کا معاہدہ کر لیا تھا، ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں۔ اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں اور اب تک رکی رہیں، کیونکہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلہ میں صرف ہو رہا تھا، صلح حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا تو بنوبکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آ گیا دفعتہً وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور روسائے قریش نے علانیہ ان کو مدد دی عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں بدل کر [1] بنوبکر کے ساتھ تلواریں چلائیں، خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی، بنوبکر رک گئے کہ حرم کا احترام ضروری ہے، لیکن ان کے رئیس اعظم نوفل نے کہا: یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آ سکتا۔ غرض عین حدود حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ دفعتہً یہ صدا بلند ہوئی،

لا ھم انی ناشد محمدا	حلف ابینا و ابیہ الا تلدا
فانصر رسول اللہ نصرا اعتدا	ادع عباداللّٰہ یاتوا مددا

''اے اللہ! میں محمد ﷺ کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے، اے اللہ کے پیغمبر! ہماری اعانت کر، اور اللہ کے بندوں کو بلا، سب اعانت کے لئے حاضر ہوں گے۔''

معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس ناقہ [2] سوار جن کا پیش رو عمرو بن سالم ہے، فریاد لے کر آئے ہیں آنحضرت ﷺ نے واقعات سنے تو آپ کو سخت رنج ہوا۔ تاہم آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین

[1] طبری، ج ۳، ص: ۱۶۲۰، (ابن سعد جزء مغازی، ص: ۹۷ میں کچھ اور نام بھی ہیں)۔ (س)

[2] طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۹۷، (س)

شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے:

① مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

② قریش، بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

③ اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ بن عمرو نے قریش کی زبان سے کہا کہ "صرف تیسری شرط منظور ہے۔" ❶ لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی۔ انہوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید کرا لائیں، ابوسفیان نے مدینہ آ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں درخواست کی، بارگاہ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا، ابوسفیان نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بیچ میں ڈالنا چاہا، لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا، ہر طرف سے مجبور ہو کر جناب فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے پاس آیا، امام حسن رضی اللہ عنہ پانچ برس کے بچے تھے، ابوسفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا، تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا، جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل۔" بالآخر ابوسفیان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایما سے مسجد نبوی میں جا کر اعلان کر دیا کہ "میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔" ❷

ابوسفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا کہ یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں اور نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ کی تیاریاں کیں، اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں، احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ ایک معزز صحابی تھے، انہوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں، آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ (اور حضرت زبیر، حضرت مقداد اور حضرت ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہم) کو بھیجا ❸ کہ قاصد سے خط چھین لائیں، خط آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، تو تمام لوگوں کو حاطب کے افشائے راز پر حیرت ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیتاب ہو گئے اور عرض کی کہ "حکم ہو تو ان کی گردن اڑا دوں؟" لیکن جبین رحمت پر شکن نہ تھی۔ ارشاد ہوا: "عمر! تم کو کیا معلوم ہے کہ اللہ نے اہل بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہو کہ تم سے مؤاخذہ نہیں ہے۔"

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے عزیز و اقارب اب تک مکہ میں تھے اور ان کا کوئی حامی نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آنحضرت ﷺ نے قبول فرمایا۔ ❹

❶ زرقانی، (ج ۲، ص: ۳۳۶) نے یہ واقعہ مغازی ابن عائذ سے نقل کیا ہے تعجب ہے کہ دوسرے مؤرخین اور ارباب سیر ایسے ضروری واقعہ کو قلم انداز کر گئے۔ ❷ زرقانی علی المواھب، ج ۲، ص: ۳۳۷، (س) ❸ زرقانی علی المواھب، ج ۲، ص: ۳۳۹، (س) ❹ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الفتح. ٤٢٧٤۔

غرض ۱۰ رمضان، ۸ ہجری کو کوکبۂ نبوی ﷺ نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا، دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں، قبائل عرب راہ میں آ کر ملتے جاتے تھے، مرالظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں، یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔

آنحضرت ﷺ کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا وادی ایمن بن گیا، فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی، تحقیق کے لئے انہوں نے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے) ابوسفیان اور بدیل بن ورقاء کو بھیجا، خیمہ نبوی کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا اس نے ابو سفیان کو دیکھ لیا [1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ جذبۂ انتقام کو ضبط نہ کر سکے تیز قدمی سے آگے بڑھے اور بارگاہ رسالت میں آ کر عرض کیا کہ کفر کے استیصال کا وقت آ گیا لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جان بخشی کی درخواست کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ عرض کیا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عمر! اگر یہ شخص تمہارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت دلی نہ کرتے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ یہ نہ فرمائیں آپ جس دن اسلام لائے تھے مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی، خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی۔ [2]

ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعویدار تھی۔ اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائل عرب کا اشتعال اور آنحضرت ﷺ کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفو نبوی) تھی، اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ ''خوف کا مقام نہیں۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا، [3] لیکن طبری وغیرہ میں اس اجمال کی تفصیل میں حسب ذیل مکالمہ لکھا ہے:

رسول اللہ ﷺ	کیوں ابوسفیان کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟
ابوسفیان	کوئی اور اللہ ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔
رسول اللہ ﷺ	کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں؟
ابوسفیان	اس میں تو ذرا شبہ ہے۔

بہر حال، ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو ان کا ایمان متزلزل تھا لیکن مؤرخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے چنانچہ غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی۔

---

[1] اصل واقعہ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ الرّایة یوم الفتح: ٤٢٨٠ میں کافی تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن مزید تفصیل اور جزئیات حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن عائذ وغیرہ سے نقل کئے ہیں میں نے ان کو بھی لے لیا ہے، بعض واقعات طبری سے ماخوذ ہیں۔ [2] طبری، ج ۳، ص: ١٦٣٢، (س) [3] بخاری ایضًا۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ ابو سفیان کو پہاڑی کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں۔ کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا، قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں، سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا، پھر جہینہ، (سعد بن) ہذیم، سلیم ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے، ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو ہو جاتے تھے، سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سر و سامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں، ابوسفیان نے متحیر ہو کر پوچھا: یہ کون لشکر ہے؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نام بتایا، دفعتاً سردار فوج حضرت سعد بن عبادہ ہاتھ میں علم لئے ہوئے برابر سے گزرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے،

اليوم يوم الملحمة ، اليوم تستحل الكعبة۔

''آج گھمسان کا دن ہے، آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔''

سب سے اخیر کوکبۂ نبوی نمایاں ہوا جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔ ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ ''حضور ﷺ نے سنا؟ عبادہ رضی اللہ عنہ کیا کہتے ہوئے گئے؟'' ارشاد ہوا کہ ''عبادہ نے غلط کہا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔'' [1] یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علم سعید بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے۔ [2] مکہ پہنچ کر آپ نے حکم دیا کہ علم نبوی ﷺ مقام حجون پر نصب کیا جائے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں۔ [3]

اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا، یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا یا دروازہ بند کر لے گا، یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا اس کو امن دیا جائے گا، تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا اور خالد رضی اللہ عنہ کی فوج پر تیر برسائے، چنانچہ تین صاحب (یعنی حضرت کرز بن جابر فہری اور حضرت حُبیش بن اشعر [4] اور حضرت سلمہ بن المیلا رضی اللہ عنہم [5] نے شہادت پائی، حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مجبور ہو کر حملہ کیا، یہ لوگ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے، آنحضرت ﷺ نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو خالد رضی اللہ عنہ سے باز پرس کی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتدا مخالفین نے کی تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قضائے الٰہی یہی تھی۔'' [6]

لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ حضور ﷺ قیام کہاں فرمائیں گے؟ کیا اپنے قدیم مکان میں؟ شریعت میں مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا، ابو طالب (آنحضرت ﷺ کے عم) نے جب انتقال کیا تھا تو ان کے صاحبزادے عقیل اس وقت کافر تھے، اس لئے وہی وارث ہوئے، انہوں نے یہ

---

[1] یہ خاص صحیح بخاری: ۴۲۸۰ کی روایت ہے۔ [2] ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۹۸۔ [3] مصنف نے یہاں حضرت عروہ کی روایت لی ہے جو گو صحیح بخاری میں ہے مگر مرسل ہے، صحیح و مرفوع روایات جو صحیح بخاری میں ہیں ان کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ مکہ کے زیریں حصہ سے اور حضور انور ﷺ بالائی حصہ سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ فتح الباری، ج ۸، ص: ۸۔

[4] ان (دونوں بزرگوں) کی شہادت کا ذکر صحیح بخاری: ۴۲۸۰ میں بھی ہے۔

[5] سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۲۷۱۔ [6] ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۹۸۔

مکانات ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''عقیل نے گھر کہاں چھوڑا کہ اس میں اتروں۔ ❶ اس لئے مقام خیف میں ٹھہروں گا جہاں قریش نے (ہمارے خلاف) کفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا۔''

اللہ کی شان، حرم محترم، جو خلیل بت شکن کی یادگار تھا اس کے آغوش میں ۳۶۰ بت جاگزین تھے، آنحضرت ﷺ ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے:

﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ﴾ ❷ (۱۷/ الاسراء: ۸۱)

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔''

عین کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے جن کو قریش خدا مانتے تھے، آنحضرت ﷺ نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیئے جائیں۔ ❸ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر جس قدر تصویریں تھیں وہ بھی مٹا دیں ❹ حرم ان آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپ نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے، کنجی طلب کی اور دروازہ کھلوایا، آپ ﷺ حضرت بلال اور طلحہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں لیکن نماز نہیں ادا کی۔

خطبۂ فتح

شاہنشاہی، اسلام کا یہ پہلا دربار عام تھا، خطبۂ سلطنت یعنی بارگاہِ احدیت کی تقریر خلافت الٰہی کے منصب سے رسول اللہ ﷺ نے ادا کی، جس کا خطاب صرف اہل مکہ سے نہیں، بلکہ تمام عالم سے تھا:

((لا الـه الا الـلـه وحـده لاشريك لـه صدق وعـده ونصر عبده وهزم الاحزاب وحده الا كل مأثرة اودم اومال يدعىٰ فهو تحت قدمي هاتين الا سدانة البيت وسقاية الحاج...... يا معشر قريش ان الله قد اذهب عنكم نخوة الجاهلية وتعظمها بالاباء، الناس من ادم وادم من تراب))

''ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس نے اپنا وعدہ سچا کیا،

❶ صحیح بخاری، ایضا: ٤٢٨٢ (صحیح بخاری فتح مکہ میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے جو روایت (۴۲۸۲) ہے اس میں تصریح ہے کہ حضور ﷺ نے یہ ارشاد فتح مکہ کے موقع پر کیا لیکن اس میں خیف کے قیام کا ذکر نہیں لیکن جو روایت (٤٢٨٤، ٤٢٨٥) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا اور اس میں خیف کی تصریح ہے ابن حجر نے یہ تطبیق کی ہے کہ ممکن ہے کہ دونوں موقعوں پر لوگوں کے سوال پر یہ ارشاد فرمایا ہو، فتح الباری، ج ٨، ص: ١٣ وج ٢، ص: ٣٦٠، (س)۔

❷ اس موقع پر اس پوری آیت کے پڑھنے کا ذکر ابن سعد فتح مکہ (ص:۹۹) میں ہے۔ صحیح بخاری فتح مکہ (۴۲۸۷) میں الفاظ آئے ہیں ﴿جاء الحق وزهق الباطل﴾ ﴿جاء الحق وما يبدئ الباطل وما يعيد﴾ یعنی ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور اب باطل پھر نہ آئے گا۔'' (س)۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ الرایة: ٤٢٨٨۔

❹ ابن سعد، جزء مغازی، ص: ١٠٢۔

اس نے اپنے بندہ کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا، ہاں تمام مفاخر تمام انتقامات خون ہائے قدیم، تمام خون بہا، سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹا دیا تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔''

پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی: [1]

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ ﴾ (٤٩/ الحجرات: ٢٠)

''لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ، لیکن اللہ کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو، اللہ دانا اور واقف کار ہے۔''

بخاری میں ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ)) [2]

''اللہ اور اس کے رسول نے شراب کی خرید وفروخت حرام کر دی۔''

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوت اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے، اس لئے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی۔

خطبہ کے اصولی مطالب

عرب میں دستور تھا کہ کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کے خون کا انتقام لینا خاندانی فرض قرار پا جاتا تھا، یعنی اگر اس وقت قاتل نہ ہاتھ آ سکا تو خاندانی دفتر میں مقتول کا نام لکھا جاتا اور سینکڑوں برس گزرنے کے بعد بھی انتقام کا فرض ادا کیا جاتا تھا، قاتل اگر مر چکا ہوتو اس کے خاندان یا قبیلے کے آدمی کو قتل کرتے تھے، اسی طرح خون بہا کا مطالبہ بھی اَبًا عَنْ جَدٍّ چلا آتا تھا، یہ خون کا انتقام عرب میں سب سے بڑے فخر کی بات تھی، اس طرح اور بہت سی لغو باتیں مفاخر قومی میں داخل ہو گئی تھیں، اسلام ان سب کے مٹانے کے لئے آیا تھا اور اس بنا پر آپ ﷺ نے (اس طریق) انتقام اور خون بہا اور نیز تمام غلط مفاخر کی نسبت فرمایا کہ ''میں نے ان کو پاؤں سے کچل دیا۔''

عرب اور تمام دنیا میں نسل اور قوم وخاندان کے امتیاز کی بنا پر ہر قوم میں فرق مراتب قائم کئے گئے تھے، جس طرح ہندوؤں نے چار ذاتیں قائم کیں اور شودر کو وہ درجہ دیا جو جانوروں کا درجہ ہے اور اس کے ساتھ یہ

---

[1] سیرت ابن هشام، ج ۲، ص:۲۷۳۔ [2] کتاب المغازی، باب..... : ٤٢٩٦۔

بندش کردی کہ وہ کبھی اپنے رتبہ سے ایک ذرہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔ اسلام کا سب سے بڑا احسان جو اس نے تمام دنیا پر کیا، مساوات عام کا قائم کرنا تھا، یعنی عرب وعجم، شریف رزیل، شاہ وگدا، سب برابر ہیں۔ ہر شخص ترقی کر کے ہر انتہائی درجہ پر پہنچ سکتا ہے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کی آیت پڑھی اور پھر توضیح فرمائی کہ "تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔"

خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ ﷺ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ وسنان نے پیکر قدسی ﷺ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت ﷺ کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بھی بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا: "تم کو کچھ معلوم ہے، میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟"

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے:

اخ کریم وابن اخ کریم۔

"تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے۔"

ارشاد ہوا:

((لا تثریب علیکم الیوم اذهبوا فانتم الطلقاء)) [1]

"تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

کفار مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا، اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے، لیکن آپ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دست بردار ہو جائیں۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بام کعبہ پر چڑھ کر اذان دی، وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے ان کی آتش غیرت پھر مشتعل تھی، عتاب بن اسید نے کہا: "اللہ نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے پہلے اس کو دنیا سے اٹھا لیا۔" [2] ایک اور سردار قریش نے کہا: "اب جینا بے کار ہے۔" [3]

مقامِ صفا میں آپ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے آپ کے ہاتھ پر بیعت

---

[1] زرقانی، ج ۲، ص: ۳۹۱۔ [2] ابن هشام، ج ۲، ص: ۲۷٤ (حضرت عتاب رضی اللہ عنہ بعد کو مسلمان ہوئے)(س)

[3] اصابه تذکرة عتاب بن اسید، ج ۲، ص: ٤٥١۔

کرتے تھے، مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ ان سے ارکان اسلام اور محاسن اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا، پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آنحضرت ﷺ دست مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے [1] آپ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

ان مستورات میں ہند بھی آئی یہ وہی ہند ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ کی ماں تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اسی نے قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی وہ نقاب پہن کر آئی، شریف عورتیں عموماً نقاب پہنتی تھیں لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اس کو پہچاننے نہ پائے، بیعت کے وقت اس نے (نہایت دلیری بلکہ گستاخی سے) باتیں کیں، جو حسب ذیل ہیں: [2]

رسول اللہ ﷺ	اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔
ہند	یہ اقرار آپ نے مردوں سے تو نہیں لیا لیکن بہر حال ہم کو منظور ہے۔
رسول اللہ ﷺ	چوری نہ کرنا۔
ہند	میں اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں؟
رسول اللہ ﷺ	اولاد کو قتل نہ کرنا۔
ہند	ربیناهم صغارًا وقتلتم کبارًا فانت وهم اعلم۔ ''ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا، بڑے ہوئے تو جنگ [3] بدر میں آپ نے ان کو مار ڈالا، اب آپ اور وہ باہم سمجھ لیں۔''

رؤسائے عرب میں دس شخص تھے جو قریش کے سرتاج تھے، ان میں صفوان بن امیہ جدہ بھاگ گئے، عمیر بن وہب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ رئیس عرب مکہ سے جلاوطن ہو جاتا ہے، آپ نے علامت امان کے طور پر اپنا عمامہ عنایت کیا عمیر جدہ پہنچ کر ان کو واپس لائے حنین کے معرکہ تک یہ اسلام نہیں لائے [4] (بعد کو مسلمان ہو گئے)۔

عبداللہ بن زبعری عرب کے مشہور شاعر جو (پہلے) آنحضرت ﷺ کی ہجویں کہا کرتے تھے اور قرآن مجید پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، نجران بھاگ گیا لیکن پھر آ کر اسلام لائے۔ [5]

ابوجہل کا بیٹا عکرمہ یمن چلا گیا لیکن اس کی حرم (ام حکیم) نے آنحضرت ﷺ سے امان لی اور جا کر یمن سے لائیں [6] یہ واقعہ ابوجہل سے کہنے کے قابل نہیں کہ اس کا جگر بند کفر کی گود سے نکل کر اسلام کے

[1] طبری، ج ۳، ص: ۱٦٤٤۔(س) [2] طبری، ج۳، ص: ۱٦٤۳ مختصراً (س)
[3] جنگ بدر میں ہند کے لڑکے کافروں کے ساتھ شریک ہو کر لڑے تھے اور لڑ کر مارے گئے تھے۔
[4] طبری، ج ۳، ص: ۱٦٤٥ (س) واصابہ ذکر صفوان بن امیة، ج ۲، ص: ۱۸۷۔(س)
[5] ابن ہشام، ج ۲، ص: ۲۷۷ (س) [6] طبری، ج ۳، ص: ۱٦٤٦، (س)

آغوش میں آ گیا اور اب ہم اس کو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

اشتہار یان قتل

ارباب سیر کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گو اہل مکہ کو امن عطا کیا تھا تاہم دس اشخاص [1] کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل کر دیے جائیں، ان میں سے بعض مثلاً عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، خونی مجرم تھے اور قصاص میں قتل کئے گئے، لیکن متعدد ایسے تھے کہ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو مکہ میں ستایا کرتے تھے یا آپ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک عورت اس جرم پر قتل کی گئی کہ وہ آپ کے ہجویہ اشعار گایا کرتی تھی۔

لیکن محدثانہ تنقید کی رو سے یہ بیان صحیح نہیں، اس جرم کا مجرم تو سارا مکہ تھا، کفار قریش میں سے (بجز دو چار کے) کون تھا جس نے آنحضرت ﷺ کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں بایں ہمہ انہیں لوگوں کو یہ مژدہ سنا دیا گیا کہ انتم الطلقاء جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے وہ تو نسبتاً کم درجہ کے مجرم تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت صحاح ستہ میں موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا، خیبر میں جس یہودی عورت نے آپ کو زہر دیا۔ اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے قتل کا حکم ہو گا، ارشاد ہوا کہ ''نہیں'' خیبر کے کفرستان میں اک یہودیہ، زہر دے کر رحمت عالم کے طفیل سے جانبر ہو سکتی ہے، اس سے کم درجہ کے مجرم عفو نبوی سے کیونکر محروم رہ سکتے ہیں۔

اگر درایت پر قناعت نہ کی جائے تو روایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بالکل ناقابل اعتبار رہ جاتا ہے، صحیح بخاری میں صرف ابن خطل کا قتل مذکور ہے [2] اور یہ عموماً مسلم ہے کہ وہ قصاص میں قتل کیا گیا۔ مقیس کا قتل بھی شرعی قصاص تھا۔ باقی جن لوگوں کی نسبت حکم قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو ستایا کرتے تھے وہ روایتیں صرف ابن اسحاق تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں، یعنی اصول حدیث کی رو سے وہ روایت

---

[1] حافظ مغلطائی نے پندرہ نام مختلف حوالوں سے جمع کئے ہیں، جو خود محدثین کے نزدیک غیر محتاطانہ ہیں۔ عام ارباب سیرت نے دس شخصوں کے نام لیے ہیں، ابن اسحاق نے آٹھ نام گنائے ہیں، ابوداود اور دارقطنی کی روایت میں صرف چھ ہیں، بخاری میں صرف ابن خطل کا واقعہ مذکور ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ تحقیق کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ عام روایت کی رو سے جن دس شخصوں کی سزائے موت کا اعلان کیا گیا تھا ان کا حال یہ ہے کہ وہ شدید مجرم تھے تاہم سات اشخاص خلوص سے ایمان لائے اور ان کو معافی دے دی گئی، صرف چار شخص قتل ہوئے تین مرد اور ایک عورت عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، حویرث بن نقیر اور قریبہ، ابن خطل کی لونڈی، ابن خطل اور ابن صبابہ دونوں خونی مجرم تھے، ابن خطل نے جو اسلام لا چکا تھا اپنے ایک مسلمان خادم کو قتل کر کے مرتد ہو گیا تھا، مقیس بن صبابہ کا واقعہ یہ ہے کہ اس کا ایک بھائی ایک انصاری کے ہاتھ سے غلطی سے مارا گیا، آنحضرت ﷺ نے اس کی دیت ادا کرا دی تھی، تاہم مقیس منافقانہ اسلام لایا اور غدر سے اس انصاری کو قتل کر دیا اور حویرث نے آنحضرت ﷺ کی دو صاحبزادیوں کے ساتھ جب وہ ہجرت کر رہی تھیں شرارت کی تھی اور ان دونوں کو اونٹوں سے گرا دینا چاہتا تھا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر دیا۔ قریبہ جو ابن خطل کی لونڈی تھی، مکہ کی ایک مغنیہ تھی جو آنحضرت ﷺ کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھی۔ دیکھو زرقانی، ج ۲، ص: ۳۶۱ تا ۳۶۴ اور ابن ھشام ذکر فتح مکہ، ج ۲، ص: ۲۷۲۔ (س)

[2] بخاری، کتاب المعازی، باب این رکز النبی ﷺ الرایۃ ..... : ۴۲۸۶۔ (س)۔

منقطع ہے جو قابل اعتبار نہیں، ابن اسحاق کا فی نفسہٖ جو درجہ ہے وہ ہم کتاب کے دیباچہ میں لکھ آئے ہیں۔

سب سے زیادہ معتبر روایت جو اس بارے میں پیش کی جاسکتی ہے ابوداؤد کی وہ روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا: ''چار اشخاص کو کہیں امن نہیں دیا جاسکتا۔'' [1] لیکن ابوداؤد نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند جیسی چاہیے مجھ کو نہیں ملی۔ [2] پھر اس کے بعد ابن خطل کی روایت نقل کی ہے، (اور شروع میں جو روایت ہے) اس کا ایک راوی احمد بن المفضل ہے جس کو ازدی نے منکر الحدیث لکھا ہے اور ایک راوی اسباط بن نصر ہے جس کی نسبت نسائی کا قول ہے کہ ''قوی نہیں ہے۔'' اگرچہ اس قدر جرح کسی روایت کے نامعتبر ہونے کے لئے کافی نہیں لیکن واقع جس قدر اہم ہے۔ اس کے لحاظ سے راوی کی اس قدر جرح بھی روایت کے مشکوک ہونے کے لئے کافی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض سرداران قریش جو مخالفین اسلام کے پیشرو تھے، آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی خبر سن کر مکہ سے بھاگ گئے۔ لیکن یہ صرف ابن اسحاق کا قیاس ہے کہ وہ اس وجہ سے بھاگے تھے کہ ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا، ان اشتہاری مفرورین میں ابن اسحاق نے عکرمہ کو بھی شمار کیا ہے جو ابوجہل کے فرزند تھے۔ لیکن مؤطا امام مالک میں جس کی نسبت امام شافعی کا قول ہے کہ آسمان کے نیچے (قرآن کے

---

[1] ابو داود، كتاب الجهاد، باب قتل الاسير: ٢٦٨٤۔ [2] ابوداؤد نے باب قتل الاسیر میں اس معنی کی تین روایتیں درج کی ہیں۔ پہلی وہ روایت ہے جس کا ذکر مصنف نے اخیر میں کیا ہے۔ یہ روایت احمد بن المفضل، اسباط بن نصر، سدی کبیر، مصعب بن سعد اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے، اس میں چار مرد اور دو عورتوں کے قتل کا حکم مذکور ہے، جن میں سے ایک ابن ابی سرح ہے جس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور انور ﷺ کی رضا کے بغیر آپ کی خدمت میں لا کر پیش کیا اور اس کو کچھ دیر کے تامل کے بعد پناہ دی اور وہ مسلمان ہوا۔ (ابو داود، كتاب الجهاد، باب قتل الاسير: ٢٦٨٣) اس روایت میں احمد بن مفضل اور اسباط بن نصر اور سدی کبیر تینوں پر علمائے رجال نے جرحیں کی ہیں اور خصوصاً اسباط بن نصر پر اور زیادہ جرحیں ہیں، یہ روایت اسی سلسلہ سے نسائی نے باب قتل المرتد (۴۰۷۲) میں اور حاکم نے مستدرک کتاب المغازی (۴۶/۳) میں اس کو نقل کیا ہے۔ اس سلسلہ کے یہ تینوں راوی شیعہ ہیں اور حاکم نے مستدرک میں اس پہلو سے اپنا اظہار خیال کر دیا ہے۔ ابوداؤد کی دوسری روایت عمرو بن عثمان بن عبدالرحمان بن سعید مخزومی سے ہے کہ انہوں نے اپنے دادا سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے چار مردوں اور دو عورتوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کو پناہ نہیں دی جاسکتی۔ ان دو عورتوں میں سے جو دونوں مغنیہ لونڈیاں تھیں ایک مسلمان ہوگئی اور ایک قتل کی گئی۔ (رقم الحدیث ۲۶۸۴) اس روایت کے متعلق ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے شیخ ابوالعلاء سے اس کی سند اچھی طرح سمجھی نہیں، یہی روایت اسی سلسلہ سے دارقطنی اواخر کتاب الحج (۳۰۰/۲) میں ہے۔ اس میں سند کے آخر میں یوں ہے۔ عمرو بن عثمان نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے یہ روایت سنی۔ اس سے ظاہر ہے کہ سند کے اسی حصہ میں ابوداؤد کو شک ہے۔ ابوداؤد کی تیسری روایت (۲۶۸۵) میں صرف ابن خطل کے قتل کا ذکر ہے جو صحیح بخاری کی روایت سے بھی ثابت ہے، بیہقی نے حکم بن عبدالملک، قتادہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ایک روایت کی ہے جس میں تین مرد اور ایک عورت یعنی چار اشخاص کے قتل کا حکم ہے، تین مرد یہ ہیں، ابن خطل، مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد، ابن ابی سرح اور عورت کا نام ام سارہ تھا۔ عبداللہ بن سعد کے قتل کی ایک انصاری نے نذر مانی تھی مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سفارش سے ان کی جان بخشی ہوئی اور ام سارہ وہی عورت ہے جو فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کے مکہ پر حملہ کرنے کا خط خفیہ لے کر چلی تھی۔ اس روایت میں حکم بن عبدالملک مطلقاً ناقابل اعتبار ہے اور اس کی اس روایت کو عقیلی نے لکھا ہے کہ کوئی تاکید اس کے رفقا میں سے کسی نے نہیں کی ہے۔ تہذیب ابن حجر، ج ۲، ص: ۴۳۱، ۴۳۲، (س)

علاوہ) کوئی کتاب اس سے زیادہ صحیح نہیں۔ یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے:

''حارث بن ہشام کی صاحبزادی ام حکیم عکرمہ بن ابی جہل کی زوجہ تھیں، وہ فتح مکہ کے دن اسلام لائیں۔ لیکن ان کے شوہر عکرمہ بن ابوجہل اسلام سے بھاگ کر یمن چلے گئے، ام حکیم یمن گئیں اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئے اور مکہ میں آئے، آنحضرت ﷺ نے جب ان کو دیکھا تو فرط مسرت سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی پھر ان سے بیعت لی۔'' [1]

یہ بات بھی اس موقع پر خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جن لوگوں کو امن دیا جاتا تھا وہ اسلام پر مجبور نہیں کیے جاتے تھے۔ تمام مؤرخین اور ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ حنین کی لڑائی میں جو فتح مکہ کے بعد پیش آئی لشکر اسلام میں مکہ کے بہت سے کفار بھی شامل تھے جو اس وقت تک کافر تھے اور شکست بھی زیادہ تر اسی وجہ سے ہوئی کہ پہلے حملے میں انہی کافروں کے قدم اکھڑے اور اس ابتری کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم بھی نہ ٹھہر سکے۔ [2]

خزائن حرم

حرم میں نذور اور ہدایا کا خزانہ ایک مدت سے جمع ہوتا چلا آتا تھا وہ محفوظ رکھا گیا، لیکن مجسمہ جات اور تصویریں برباد کر دی گئیں، ان میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مجسمے بھی تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی تھی [3] جس سے لوگوں نے قیاس کیا کہ کسی زمانہ میں عیسائیت کا اثر زیادہ غالب ہو گیا تھا، رنگین تصویریں جو دیواروں پر تھیں مٹانے پر بھی ان کے دھندلے نشان رہ گئے تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر تک باقی رہے۔ [4]

مکہ معظمہ میں آنحضرت ﷺ کا قیام پندرہ دن تک رہا، جب یہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مقرر کرتے گئے کہ لوگوں کو اسلام کے مسائل اور احکام سکھائیں۔

فتح مکہ اور بت شکنی

فتح مکہ کا اصلی مقصد اشاعتِ توحید اور اعلائے کلمۃ اللہ تھا، کعبہ میں سینکڑوں بت تھے جن میں ہبل بھی تھا جو بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا، یہ انسان کی صورت کا تھا اور یاقوت احمر سے بنا تھا۔ سب سے پہلے جس نے

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب النكاح باب نكاح المشرك اذا اسلمت زوجته قبله، رقم الأثر: ١١٥٦۔

[2] مصنف رحمہ اللہ کی یہ تحقیق عام اور مشہور روایت کے برعکس ہے۔ مؤرخین کی تصریح یہ ہے کہ مکہ کے جو لوگ حنین کے موقع پر لشکر اسلام میں شامل ہوئے تھے وہ مسلم تھے البتہ ابھی ان میں پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی۔

[3] فتح البارى، ذكر فتح مكة۔

[4] فتح البارى، ذكر فتح مكہ (اخبار مکہ ازرقی میں بہ تفصیل یہ واقعات مذکور ہیں)۔

اس کو کعبہ میں لا کر رکھا تھا، خزیمہ بن مدرکہ تھا جو مضر کا پوتا اور عدنان کا پڑپوتا تھا، ہبل کے سامنے سات تیر رہتے تھے جن پر ''لا''، ''و نعم'' لکھا ہوا تھا، عرب جب کوئی کام کرنا چاہتے تھے تو ان تیروں پر قرعہ ڈالتے اور ''ہاں'' یا ''ناں'' جو کچھ نکلتا اس پر عمل کرتے [1] جنگ احد میں ابوسفیان نے اسی ہبل کی جے پکاری، وہ عین کعبہ کے اندر تھا چنانچہ جب آنحضرت ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو اور بتوں کے ساتھ وہ بھی برباد کر دیا گیا۔ مکہ کے اطراف میں اور بہت سے بڑے بڑے بت تھے جن کے لئے حج کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں، ان میں سے سب سے بڑا لات، مناۃ اور عزیٰ تھے، عزیٰ قریش کا اور لات اہل طائف کا معبود تھا، مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر نخلہ ایک مقام ہے، عزیٰ یہیں منصوب تھا، بنوشیبان اس کے متولی تھے، اہل عرب کا اعتقاد تھا کہ اللہ جاڑوں میں ''لات'' کے ہاں اور گرمیوں میں ''عزیٰ'' کے ہاں بسر کرتا ہے، عزیٰ کے سامنے عرب وہ تمام مناسک اور رسوم بجالاتے تھے جو کعبہ میں بجالاتے تھے، اس کا طواف کرتے اور اس پر قربانیاں چڑھاتے۔ [2]

مناۃ کا تخت گاہ مشلّل تھا، جو قدید کے پاس مدینہ منورہ سے سات میل ادھر ہے، وہ ایک بن گھڑا پتھر تھا، ازد، غسان، اوس اور خزرج اس کا حج کرتے تھے، عمرو بن لحی نے جو اصنام قائم کئے تھے یہ ان سب میں بالاتر تھا اوس اور خزرج جب کعبہ کا حج کرتے تو احرام اتارنے کی رسم (بال منڈانا) اسی کے پاس آ کر ادا کرتے تھے۔ [3]

قبیلہ ہذیل کا بت سواع تھا، جو ینبع کے اطراف رہاط میں تھا، یہ ایک پتھر تھا، اس کے متولی بنولحیان تھے۔

بت پرستی کے یہ وہ طلسم تھے جن میں سارا عرب گرفتار تھا، اب ان کی بربادی کا وقت آ چکا تھا اور دفعتہً ہر جگہ خاک اڑنے لگی۔

---

[1] معجم البلدان، ذکر ھبل بحوالہ ھشام بن محمد کلبی۔

[2] یہ تمام تفصیل زرقانی، ج ۲، ص: ۴۰۰ میں ہے۔ [3] معجم البلدان، ذکر مناۃ۔

ہوازن وثقیف

غزوۂ حنین، اوطاس طائف

شوال ۸ھ

﴿ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ ﴾ (۹/ التوبۃ:۲۵)

حنین

حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ ذوالمجاز عرب کا مشہور بازار اور عرفہ سے تین میل ہے [1] اور یہ اس کے دامن میں ہے۔ اس مقام کو اوطاس [2] بھی کہتے ہیں، ہوازن ایک بڑے قبیلہ کا نام ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔

اسلام کی فتوحات کا دائرہ گو وسیع ہوتا جاتا تھا لیکن اہل عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا قبلہ اعظم یعنی مکہ اب تک محفوظ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ محمد ﷺ اگر قریش پر غالب آ گئے اور مکہ فتح ہو گیا تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، مکہ جب فتح ہوا تو تمام قبائل نے خود پیش قدمی کی اور اسلام قبول کرنا شروع کیا [3] لیکن ہوازن اور ثقیف پر اس کا الٹا اثر پڑا، یہ قبیلے نہایت جنگجو اور فنون جنگ سے واقف تھے، اسلام کو جس قدر غلبہ ہوتا جاتا تھا، یہ زیادہ مضطر ہوتے تھے۔ [4] کہ ان کی ریاست اور امتیاز کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ اس بنا پر فتح مکہ (کے بعد) ہوازن اور ثقیف کے رؤسا نے یہ سمجھ لیا کہ اب ان کی باری ہے اس لئے انہوں نے ایک دوسرے سے مل کر مشورہ کیا اور تمام قبائل عرب سے قرارداد ہو گئی کہ مسلمانوں کے خلاف جو اس وقت مکہ میں جمع ہیں ایک عام حملہ کیا جائے، مکہ فتح ہوا تو ان کو یقین ہو گیا کہ اب جلد تدارک نہ کیا گیا تو پھر کوئی طاقت اسلام کو زیر نہ کر سکے گی۔

آنحضرت ﷺ کی روانگی کے وقت ان کو یہ غلط خبر پہنچی تھی کہ حملہ کا رخ انہی کی طرف ہے اس لئے اب انتظار کی حاجت بھی نہ تھی، دفعتاً بڑے زور وشور کے ساتھ خود حملہ کے لئے بڑھے، جوش کا یہ عالم تھا کہ ہر قبیلہ تمام اہل وعیال لیکر آیا تھا کہ بچے اور عورتیں ساتھ ہونگی تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دے دیں گے۔

اس معرکہ میں اگرچہ ثقیف اور ہوازن کی تمام شاخیں شریک تھیں تاہم کعب اور کلاب الگ رہے، فوج

---

[1] (یہاں مصنف کی عبارت میں کچھ اغلاق ہے، مطلب یہ ہے کہ حنین زرقانی کی تصریح کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان عرب کے مشہور بازار ذوالمجاز کے پاس ہے جو عرفہ سے تین میل ہے۔ لیکن ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن کے سفر کی مسافت پر واقع ہے)۔(س) [2] قاضی عیاض کی یہی رائے ہے لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق یہ حنین کے علاوہ دیار ہوازن میں دوسری وادی کا نام ہے۔ فتح الباری وزرقانی ذکر غزوۃ ھوازن واوطاس، (س)۔

[3] صحیح بخاری، کتاب المغازی: ۴۳۰۲۔ [4] مارگولیتھ صاحب لکھتے ہیں: "حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام سے بدوی قبائل جن کو ریگستان کی آزادی بہت عزیز تھی نہایت خائف تھے۔"

کی سرداری کے لئے انتخاب تو مالک بن عوف [1] کا کیا گیا جو قبیلۂ ہوازن کا رئیس اعظم تھا۔ (لیکن مشیر کی حیثیت سے) درید بن الصمہ (کو بھی ساتھ لے لیا گیا جو) عرب کا مشہور شاعر اور قبیلہ جشم کا سردار تھا اس کی شاعری اور بہادری کے معرکے اب تک عرب کی تاریخ میں یادگار ہیں لیکن اس کی عمر سو برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، چونکہ پورا عرب اس کو مانتا تھا اسے اور اس کی رائے و تدبیر پر تمام ملک کو اعتماد تھا، خود مالک بن عوف نے اس سے شرکت کی درخواست کی، پلنگ پر اٹھا کر اس کو میدان جنگ میں لائے، اس نے پوچھا کہ یہ کونسا مقام ہے، لوگوں نے کہا: اوطاس بولا "ہاں یہ مقام جنگ کے لئے موزوں ہے، اس کی زمین نہ بہت سخت ہے، نہ اس قدر نرم کہ پاؤں دھنس جائیں۔" پھر پوچھا کہ "یہ بچوں کے رونے کی آوازیں کیسی آ رہی ہیں۔" لوگوں نے کہا کہ بچے اور عورتیں ساتھ آئی ہیں کہ کوئی شخص پاؤں پیچھے نہ ہٹائے۔ بولا کہ "جب پاؤں اکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ میدان جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔ بدقسمتی سے اگر شکست ہوئی تو عورتوں کی وجہ سے اور بھی ذلت ہوگی۔" پھر پوچھا کہ "کعب اور کلاب بھی شریک ہیں یا نہیں؟" اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان معزز قبیلوں کا ایک شخص بھی میدان جنگ میں نہیں تو کہا: "اگر آج کا دن عزت و شرف کا دن ہوتا تو کعب و کلاب غیر حاضر نہ ہوتے۔" اس کی رائے تھی کہ میدان سے ہٹ کر کسی محفوظ مقام میں فوجیں جمع کی جائیں اور وہیں اعلان جنگ کیا جائے۔ لیکن مالک بن عوف نے جو تیس سالہ نوجوان تھا جوش شباب میں اس رائے کو قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ خرف ہو چکے، آپ کی عقل بے کار ہو چکی۔ [2]

رسول اللہ ﷺ کو (مکہ میں) ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپ نے تصدیق کے لئے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ کو بھیجا، وہ جاسوس بن کر حنین میں آئے اور کئی دن تک فوج میں رہ کر تمام حالات تحقیق کئے۔ آنحضرت ﷺ نے مجبوراً مقابلہ کی تیاریاں کیں، رسد اور سامان جنگ کے لئے قرض کی ضرورت پیش آئی، عبداللہ بن ربیعہ، جو ابوجہل کے ماں جائے بھائی تھے، نہایت دولت مند تھے، ان سے تیس ہزار درہم قرض لئے، [3] صفوان بن امیہ جو مکہ کا رئیس اعظم اور مہمان نوازی میں مشہور تھا، لیکن اب تک اسلام نہیں لایا تھا، اس سے آنحضرت ﷺ نے اسلحہ جنگ مستعار مانگے، اس نے سو زرہیں اور ان کے لوازمات پیش کئے۔ [4]

شوال ۸ ہجری مطابق جنوری و فروری ۶۳۰ء اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی، اس سر و سامان سے حنین پر بڑھیں کہ (بعض) صحابہ رضی اللہ عنہم کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ "آج ہم پر کون غالب

---

[1] مالک بن عوف رضی اللہ عنہ غزوہ طائف کے بعد مسلمان ہو گئے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جنگ قادسیہ میں شریک اور دمشق کے حاکم ہوئے (زرقانی، ج ۳ ص: ۶)۔ (س)۔ [2] یہ تمام تفصیل طبری میں ہے، ج ۳ ص: ۱۶۵۵ تا ۱۶۵۷۔ (س)

[3] مسند ابن حنبل، ج ۴ ص: ۳۶، اصابہ میں امام بخاری سے بھی یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس میں دس ہزار کی تعداد ہے۔

[4] مؤطا، كتاب النكاح، باب نكاح المشرك اذا اسلمت زوجته قبله: ۱۱۵٤۔ میں ہے کہ جب آپ نے اس سے ہتھیار مانگے تو اس نے کہا جبراً یا طوعاً (یعنی جبراً مانگتے ہو تو میں نہیں دیتا) آپ ﷺ نے فرمایا: "جبراً نہیں طوعاً۔" (ابوداود، باب الضمانة: ۳۵٦۲ میں بھی اسی قسم کی روایت ہے)

آ سکتا ہے؟'' لیکن بارگاہ ایزدی میں یہ نازش پسند نہ تھی۔

﴿ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۝ ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۲۵)

''اور حنین کا دن یاد کرو، جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے، لیکن وہ کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت کے تنگی کرنے لگی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے، پھر اللہ نے اپنے رسول (ﷺ) پر اور مسلمانوں پر تسلی نازل کی اور ایسی فوجیں بھیجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور کافروں کو عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے۔''

فتح کے بجائے وہلۂ اول میں مطلع صاف تھا رسول اللہ ﷺ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رفقائے خاص میں سے بھی کوئی پہلو میں نہ تھا۔ [1] حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ جو شریک جنگ تھے ان کا بیان ہے کہ جب لوگ بھاگ

---

[1] لیکن اور روایتوں میں چند اصحاب کا ثابت قدم رہنا مذکور ہے۔ ان دونوں روایتوں کی تطبیق یہ ہے کہ یہ دو مختلف وقفوں کے حالات ہیں، راوی نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے، تفصیل آگے آئے گی مصنف نے آیندہ تفصیل کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا ہے اس لئے تفصیل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند باتیں قابل تشریح ہیں:

(۱) پہلی یہ کہ مصنف نے اول وہلہ میں مسلمانوں کی شکست تسلیم کی ہے، یہ ابن اسحاق وغیرہ اہل سیر کی رائے ہے لیکن حدیث صحیح کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کامیابی ہوئی لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے دشمن کے تیر اندازوں نے موقع پا کر تیر اندازی شروع کر دی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی، انتشار اور پراگندگی پیدا ہوگئی۔ بخاری میں حضرت براء رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں:

وانا لما حملنا عليهم انكشفوا فاكببنا على الغنائم فاستقبلنا بالسهام۔ (بخاری، کتاب المغازی، باب قول الله تعالىٰ ويوم حنين اذ : ۴۳۱۷)

''اور ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے تو ہم لوگ مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے تو انہوں نے ہم کو تیروں پر دھر لیا۔''

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس جنگ میں کچھ لوگ محض اس غرض ہی سے شریک ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکہ دیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے جو اس جنگ میں شریک تھیں حضور انور ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! ان طلقاء کو قتل کر دیجئے انہی کی وجہ سے شکست ہوئی ہے الفاظ یہ ہیں:

اقتل من بعدنا من الطلقاء انهزموا بك۔ (کتاب الجهاد، باب غزوة النساء مع الرجال: ۴۶۸۰)

''ہمارے سوا ان طلقاء کو قتل کر دیجئے ان ہی نے آپ ﷺ کو شکست دلوائی۔''

امام نووی رحمہ اللہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

لم يحصل الفرار من جميعهم وانما فتحه عليهم من فى قلبه مرض من مسلمى اهل مكة المؤلفة ومشركيها الذين لم يكونوا اسلموا وانما كانت هزيمتهم فجاءة لا نصبابهم عليهم دفعة واحدة ورشقهم بالسهام ولا ختلاط اهل مكة معهم ممن لم يستقر الايمان فى قلبه وممن يتربص بالمسلمين الدوائر وفيهم نساء وصبيان خرجوا للغنيمة۔ (غزوة حنين)

''سب لوگ نہیں بھاگے تھے بلکہ مکہ کے مؤلفۃ القلوب میں جو منافق تھے اور مکہ کے مشرکین (جو اس جنگ میں شریک ہو گئے تھے اور جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) انہوں نے بھاگنا شروع کیا تھا اور یہ ناگہانی ہزیمت اس وجہ سے ہوئی کہ دشمنوں نے ایک ساتھ تیروں کی بارش شروع کر دی تھی اور فوج میں ایسے اہل مکہ بھی تھے جن کے دلوں میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نکلے تو میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ ایک مسلمان کے سینہ پر سوار ہے، میں نے عقب سے اس کے شانہ پر تلوار

(🔘🔘 گزشتہ سے پیوستہ) ایمان راسخ نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں پر مصائب کے منتظر تھے، اس میں عورتیں اور بچے بھی تھے جو غنیمت کے لئے آئے تھے۔"

مؤرخ طبری نے اس موقع پر مکہ کے ان طلقاء کی زبان سے جو فقرے نقل کئے ہیں وہ بھی اسی راز کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ اہل مکہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ دل سے نہ تھے (ج ۳ ص: ۱۶۶۰ لائیڈن) متقدم مفسروں میں سے ابن جریر طبری نے لکھا ہے: ان الطلقاء انجفلوا یومئذ بالناس وجلوا عن النبی ﷺ۔ (ابن جریر، طبری، ج ۱۰، ص: ۶۲) عہد متوسط کے مفسروں میں سے ابوحیان اندلسی کے الفاظ یہ ہیں:

یقال ان الطلقاء من اهل مكة فروا وقصدوا القاء الهزيمة فى المسلمين۔ (بحر المحيط، ج ۵، ص: ۲۴)

"کہا جاتا ہے کہ مکہ کے طلقاء بھاگ گئے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے۔"

متاخر مفسروں میں سے صاحب روح المعانی نے تفسیر سورۂ توبہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

وكان اول من انهزم الطلقاء مكرًا منهم وكان ذلك سببًا لوقوع الخلل وهزيمة غيرهم۔ (ج ۱۰، ص:۶۶)

"سب سے پہلے طلقا مکر وفریب سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے اس سے مسلمانوں میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہوئی۔"

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ پسپائی کے وقت آنحضرت ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ثابت قدم رہی۔

اس سلسلہ میں بنائے اشتباہ بخاری (۴۳۳۷) کی حضرت انس رضی اللہ عنہ والی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

فادبروا عنه حتى بقى وحده۔ "لوگ پیچھے ہٹ گئے یہاں تک کہ آپ ﷺ تنہا رہ گئے۔"

مصنف نے ان الفاظ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس جگہ رسول اللہ ﷺ تھے وہاں کوئی نہ تھا، اسی روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب حضرت رسول کریم ﷺ نے انصار کو آواز دی تو انصار نے یہ الفاظ کہے: لبيك يا رسول الله ابشر نحن معك۔ "ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ ﷺ آپ خوش ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے پاس رہیں۔" اسی باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت اس سے پہلے ہے جس میں انصار کے الفاظ یہ ہیں:

لبيك يا رسول الله وسعديك نحن بين يديك۔ (بخاری، غزوۂ طائف: ۴۳۳۳)

"ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ ﷺ! آپ خوش ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے سامنے ہیں۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضور ﷺ کی تنہائی اور رفقائے خاص کے پاس رہنے کی تطبیق ان الفاظ میں کی ہے:

ويجمع بين قوله حتى بقى وحده وبين الاخبار الدالة على انه بقى معه جماعة بان المراد بقى وحده متقدما على العدو والذين ثبتوا معه كانوا وراءه۔ (ج ۸ ص: ۲۴ مصر)

"اور اس قول میں کہ حضور ﷺ تنہا رہ گئے اور ان واقعات میں جو اس پر دال ہیں کہ حضور کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت تھی تطبیق یہ ہے کہ حضور ﷺ دشمن کے سامنے سب سے آگے مقام میں تھے اور جو آپ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم تھے وہ آپ ﷺ کے پیچھے تھے۔"

دوسرے یہ کہ بخاری ہی میں حضرت براء رضی اللہ عنہ کی جو روایت ہے اس میں حضرت براء رضی اللہ عنہ تصریح کرتے ہیں ابوسفیان بن حارث اس وقت حضرت رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھے اور آپ کی سواری کی لگام تھامے تھے۔ (غزوۂ حنین، بخاری: ۴۳۱۵)

مسلم میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پرزور الفاظ یہ ہیں کہ "میں نے اور ابوسفیان بن حارث نے حضور ﷺ سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔

فلزمت انا وابو سفيان بن الحارث بن عبدالمطلب رسول الله ﷺ فلم نفارقه۔ (مسلم، كتاب الجهاد، باب غزوة حنين: ۴۶۱۲)

صحیحین کی ان روایات کے سوا روایات ذیل بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے:

(۱) ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں جو حکم بن عتیبہ سے مروی ہے، چار آدمیوں کا حضور ﷺ کی خدمت میں باقی رہنا بتایا گیا ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص: ۲۳) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر 🔘🔘)

دے ماری جوزرہ کو کاٹ کر اندر اتر گئی۔اس نے مڑ کر مجھ کو اس زور سے دبوچا کہ میری جان پر بن گئی،لیکن پھر وہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا اسی اثنا میں میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا،پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ بولے کہ قضائے الٰہی یہی تھی۔ ❶

شکست کے مختلف اسباب تھے،مقدمۃ الجیش میں جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی افسری میں تھا زیادہ تر فتح مکہ کے جدید الاسلام نوجوان تھے۔وہ جوانی کے غرور میں اسلحہ جنگ پہن کر بھی نہیں آئے تھے۔ ❷ فوج میں دو ہزار طلقاء یعنی وہ لوگ تھے جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے۔ ❸ ہوازن قدر اندازی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے،میدان جنگ میں ان کا ایک تیر بھی خالی نہیں جاتا تھا۔ ❹ کفار نے معرکہ گاہ میں پہلے پہنچ کر مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں،کھوؤں اور دروں میں جا بجا جما دیے تھے،فوج اسلام نے صبح کے وقت جب خوب اجالا بھی نہیں ہوا تھا حملہ کیا،میدان جنگ اس قدر نشیب میں تھا کہ پاؤں جم نہیں سکتے تھے،حملہ آوروں کا بڑھنا تھا کہ سامنے سے ہزاروں فوجیں ٹوٹ پڑیں،ادھر کمین گاہوں سے قدر اندازوں کے دستے نکل آئے اور تیروں کا مینہ برسا دیا،مقدمۃ الجیش ابتری کے ساتھ بے قابو ہو کر پیچھے ہٹا اور پھر تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔صحیح بخاری میں ہے کہ (فادبروا عنه حتى بقى

(۞۞ گزشتہ سے پیوستہ) (۲) ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس دن حضور ﷺ کے ہمراہ سو آدمی نہیں باقی رہ گئے تھے۔(ترمذی، ابواب الجهاد، باب ما جاء في الثبات عند القتال: ١٦٨٩)

(۳) مسند احمد،(ج ا،ص:۴۵۳) وحاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس دن حضور ﷺ کے ہمراہ اسی آدمی باقی رہ گئے تھے۔ (فتح الباری،ج ۸،ص:۲۳)

(۴) بیہقی نے حارثہ بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے۔(زرقانی،ج ۳،ص:۲۲) ابونعیم نے دلائل میں سو کی تفصیل بتائی ہے کہ تیس سے کچھ زائد مہاجرین تھے بقیہ انصار تھے۔(فتح الباری،ج ۸،ص:۲۳)۔

(۵) ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کے پاس اس وقت مہاجرین انصار اور اہل بیت میں سے حسب ذیل اصحاب رضی اللہ عنہم موجود تھے:حضرت ابوبکر،حضرت عمر،حضرت علی،حضرت عباس بن عبدالمطلب،حضرت ابوسفیان بن حارث،حضرت جعفر بن ابی سفیان بن حارث،حضرت فضل بن عباس،حضرت ربیعہ بن حارث،حضرت اسامہ بن زید،حضرت ایمن بن ام ایمن رضی اللہ عنہم۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے الفاظ بقی وحدہ اپنے ظاہری معنی پر باقی نہیں رہ سکتے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ آگے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے لیکن اس کی صاف توجیہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے ثابت قدم رہنے والوں کی کمی کا ظاہر کرنا مقصود ہے ورنہ حقیقت یہ نہ تھی۔دوسری روایت میں ثابت قدم رہنے والوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں۔(ملاحظہ ہو زرقانی،ج ۳،ص:۴۲) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت سرور کونین ﷺ کے آس پاس تھے اور تھوڑی تھوڑی تعداد میں حضور ﷺ کے پاس پہنچنے لگے یہاں تک کہ خاصی جماعت حضور ﷺ کے گرد جمع ہو گئی اسی وجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتلائی ہے۔(س) ❶ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب قول الله تعالىٰ ويوم حنين اذ ...: ٤٣٢١، ٤٣٢٢۔(س) ❷ بخاري، كتاب الجهاد، باب من صف اصحابه عندالهزيمة و نزل عن دابته: ٢٩٣٠ (س)۔ ❸ مصنف کا یہ فقرہ واضح نہیں ہے مقصود یہ ہے کہ گو وہ کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے جیسا کہ عمدة القاري، ج٨، ص: ٣٥٩ مصر اور شرح مسلم نووي غزوة النساء مع الرجال(٤٦٨٠) میں ہے لیکن ہنوز وہ تازہ مسلمان تھے راسخ الاسلام نہیں ہوئے تھے اس لئے مہاجرین و انصار جیسا استقلال و ثبات ان میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔(س)۔ ❹ بخاري، كتاب الجهاد، باب من صف اصحابه ...: ٢٩٣٠) (س)

وحدہ) ❶ یعنی ''سب لوگ ٹل گئے اور آنحضرت ﷺ اکیلے رہ گئے۔''

تیروں کا مینہ برس رہا تھا۔ بارہ ہزار فوجیں ہوا ہوگئی تھیں لیکن ایک پیکر مقدس پا برجا تھا جو تنہا ایک فوج، ایک ملک، ایک اقلیم، ایک عالم، بلکہ مجموعۂ کائنات تھا۔

آنحضرت ﷺ نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا: ((یا معشر الانصار!)) آواز کے ساتھ صدا آئی ''ہم حاضر ہیں'' پھر آپ نے بائیں جانب مڑ کر پکارا، اب بھی وہی آواز آئی، آپ سواری سے اتر پڑے اور جلال نبوت کے لہجہ میں فرمایا: ''میں اللہ کا نبی اور اس کا پیغمبر ہوں۔'' ❷

بخاری کی دوسری روایت میں ہے: ❸

انـــا الـــنـبـــی لا کـــذب	انـا ابـن عبـدالـمـطـلـب
''میں پیغمبر ہوں، یہ جھوٹ نہیں ہے۔	میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نہایت بلند آواز تھے، آپ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو، انہوں نے نعرہ مارا: ❹

یامعشر الانصار	''او گروہِ انصار!''
یااصحاب الشجرۃ	اے اصحاب الشجرۃ! (بیعت رضوان والے)

اس پر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعتہً پلٹ پڑی، جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے انہوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے، دفعتہً لڑائی کا رنگ بدل گیا، کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ تھی) جم کر لڑے لیکن ان کے ستر آدمی مارے گئے اور جب ان کا علمبردار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔

شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی جس کے ساتھ سپہ سالار لشکر مالک بن عوف بھی تھا۔ ❺

اوطاس

درید بن الصمۃ کئی ہزار کی جمعیت لیکر اوطاس میں آیا۔ آنحضرت ﷺ نے (ابو عامر اشعری کے ماتحت) تھوڑی سی فوج اس کے استیصال کے لئے بھیج دی (حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہ، درید کے بیٹے کے ہاتھ سے مارے گئے اور علم اسلام اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا، دشمن کو قتل کر کے علم اس کے ہاتھ سے چھین لیا) ❻ درید ایک شتر پر ہودج میں سوار تھا، ربیعہ رضی اللہ عنہ

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف: ٤٣٣٧۔

❷ ایضًا۔ ❸ ایضًا، باب قول اللہ تعالیٰ: ٤٣١٥، ٤٣١٦۔

❹ ابن سعد، جلد مغازی، ص: ١٠٩، ١١٢۔ ❺ ایضًا۔ ❻ مسند ابن حنبل، ج ٤، ص: ٣٩٩۔

بن رفیع نے اس پر تلوار کا وار کیا لیکن اچٹ کر رہ گئی، اس نے کہا: ''تیری ماں نے تجھ کو اچھے ہتھیار نہیں دیے۔'' پھر کہا کہ ''میرے محمل میں تلوار ہے نکال لو اور جب اپنی ماں کے پاس واپس جانا تو کہنا کہ میں نے درید کو قتل کر دیا۔'' ربیعہ رضی اللہ عنہ نے جا کر ماں کو اس کے قتل کی خبر دی تو اس نے کہا: ''اللہ کی قسم! درید نے تیری تین ماؤں کو آزاد کرایا تھا۔'' ❶

اسیران جنگ کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی، ان میں حضرت شیما رضی اللہ عنہا بھی تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی رضاعی بہن تھیں، لوگوں نے جب ان کو گرفتار کیا تو انہوں نے کہا: ''میں تمہارے پیغمبر کی بہن ہوں۔'' لوگ تصدیق کے لئے آنحضرت ﷺ کے پاس لائے انہوں نے پیٹھ کھول کر دکھائی کہ ایک دفعہ بچپن میں آپ ﷺ نے دانت سے کاٹا تھا، یہ اس کا نشان ہے۔ فرط محبت سے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کے بیٹھنے کے لئے خود ردائے مبارک بچھائی، محبت کی باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں اور ارشاد کیا کہ ''جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو اور گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے۔'' انہوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا، چنانچہ عزت اور احترام کے ساتھ پہنچا دی گئیں۔ ❷

محاصرہ طائف

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ طائف نہایت محفوظ مقام تھا، طائف اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے گرد شہر پناہ کے طور پر چار دیواری تھی، یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہمسر تھا، عروہ بن مسعود جو یہاں کا رئیس تھا، ابوسفیان (امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے باپ) کی لڑکی اس کو بیاہی تھی، کفار مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا تو مکہ یا طائف کے رؤسا پر اترتا، یہاں کے لوگ فن جنگ سے بھی واقف تھے، طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمہ نے جرش (یمن کا ایک ضلع) میں جا کر قلعہ شکن آلات یعنی ضبور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا۔ ❸

یہاں ایک محفوظ قلعہ تھا، اہل شہر اور حنین کی شکست خوردہ فوج نے اس کی مرمت کی سال بھر کا رسد کا سامان جمع کیا، چاروں طرف منجنیقیں اور جا بجا قدر انداز متعین کئے۔ ❹

آنحضرت ﷺ نے حنین کے مال غنیمت اور اسیران جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیے گئے تھے، غرض محاصرہ ہوا اور اسلام میں یہ پہلا موقع تھا، کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ اور منجنیقیں استعمال کئے گئے، دبابہ پر اہل

---

❶ طبری، ج ۳، ص: ۱٦٦٦ مطبوعہ یورپ۔ ❷ طبقات ابن سعد، واصابہ، کتاب النسآء، ج۸، ص: ۱۲۳ وطبری، (ج ۳، ص: ۱٦٦۸) ❸ طبری، ج ۳، ص: ۱٦٦۹ مطبوعہ یورپ وسیرت ابن ہشام، ج۲، ص: ۳۱۲۔ ❹ تاریخ خمیس، ج۲، ص: ۱۲۲ وابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۱۰۔

قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں اور اس شدت کی تیر باری کی کہ حملہ آوروں کو ہٹنا پڑا، بہت سے لوگ زخمی ہوئے، بیس دن تک محاصرہ رہا، لیکن شہر فتح نہ ہوسکا، آنحضرت ﷺ نے نوفل بن معاویہ کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا کہ لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے اگر کوشش جاری رہی تو پکڑ لی جائے گی، لیکن چھوڑ دی جائے تب بھی کچھ اندیشہ نہیں، چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھالیا جائے۔ [1] صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ آپ ﷺ ان کو بددعا دیں، آپ نے یہ دعا دی، [2]

((اللّٰھم! اھد ثقیفا و ائت بھم))

''اے اللہ! ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہوجائیں۔''

تقسیم غنائم

محاصرہ چھوڑ کر آپ جعرانہ تشریف لائے، غنیمت کا بیشمار ذخیرہ تھا۔ چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار (سے زیادہ) بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی، [3] اسیران جنگ کے متعلق آپ نے انتظار کیا ان کے عزیز و اقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے، لیکن کئی دن گزرنے پر کوئی نہ آیا، مال غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے، چار حصے حسب قاعدہ اس فوج کو تقسیم کئے گئے خمس بیت المال اور غربا و مساکین کے لئے رکھا گیا۔

مکہ کے اکثر رؤسا جنھوں نے حال میں اسلام قبول کیا تھا، ابھی تک مذبذب الاعتقاد تھے انہی کو قرآن مجید میں مؤلفۃ القلوب کہا ہے، قرآن مجید میں جہاں زکوۃ کے مصارف بیان کئے ہیں، ان لوگوں کا نام بھی ہے، آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو نہایت فیاضانہ انعامات دیے جن کی تفصیل یہ ہے:

ابوسفیان، مع اولاد،	۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی
حکیم بن حزام	۲۰۰ اونٹ
نضیر بن حارث بن کلدہ ثقفی	۱۰۰ اونٹ
صفوان بن امیہ	۱۰۰ اونٹ
قیس بن عدی	۱۰۰ اونٹ
سہیل بن عمرو	۱۰۰ اونٹ
حویطب بن عبدالعزیٰ	۱۰۰ اونٹ

(ان کے علاوہ تین غیر مکی نو مسلم رئیس بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرے)

اقرع بن حابس (تمیمی)	۱۰۰ اونٹ

[1] ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۱٤، ۱۱٥۔ [2] ابن سعد، (جزء مغازی، ص: ۱۱٥) (س)۔

[3] طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۱۰، (س)

عیینہ بن حصن (فزاری) ۱۰۰ اونٹ

مالک بن عوف (نصری) ۱۰۰ اونٹ

ان کے سوا بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے، عام تقسیم کی رو سے فوج کے حصہ میں جو آیا وہ فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں تھیں چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا۔ اس لئے ہر سوار کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں۔ ❶

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی عموماً اہل مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے۔ اس پر انصار کو رنج ہوا، بعضوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ ❷ بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے۔ ❸

آنحضرت ﷺ نے یہ چرچے سنے تو انصار کو طلب فرمایا، ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا جس میں لوگ جمع ہوئے، آپ ﷺ نے انصار کی طرف خطاب کیا: ''کہ تم نے ایسا کہا؟'' لوگوں نے عرض کی کہ ''حضور! ہمارے سربرآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا، نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے۔'' ❹ صحیح بخاری باب مناقب الانصار (۳۷۸۷) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے، انہوں نے کہا: ''آپ نے جو سنا صحیح ہے۔''

آپ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فن بلاغت میں نہیں مل سکتی، انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا:

''کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، اللہ نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے، اللہ نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، اللہ نے میرے ذریعہ سے تم کو دولت مند کیا۔''

آپ ﷺ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ ''اللہ اور رسول ﷺ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔'' ❺

آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد (ﷺ!) تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تو مفلس آیا تھا ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔''

یہ کہہ کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو، لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد ﷺ کو لے کر اپنے گھر آؤ۔''

---

❶ طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۱۰ وزرقانی علی المواهب، ج ۳، ص:٤٢(س)۔

❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوة الطائف: ٤٣٣١۔

❸ ایضاً:٤٣٣٧۔ ❹ ایضاً: ٤٣٣١۔ (س)

❺ ایضاً: ٤٣٣٠ وفتح الباری، ج ٨، ص: ٤١ (س)۔

انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ ''ہم کو صرف محمد ﷺ درکار ہے۔'' اکثروں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے ڈاڑھیاں تر ہوگئیں، آپ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں، میں نے ان کو جو کچھ دیا حق کی بنا پر نہیں دیا بلکہ تالیف قلب کے لئے دیا۔ ❶

حنین کے اسیران جنگ اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے، ایک معزز سفارت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ اسیران جنگ رہا کر دیئے جائیں، یہ وہ قبیلہ تھا کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا اسی قبیلہ سے تھیں، رئیس قبیلہ (زہیر بن صرد) نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور آنحضرت ﷺ کی طرف مخاطب ہو کر کہا: ''جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں، انہی میں تیری پھوپھیاں اور تیری خالائیں ہیں، اللہ کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں اور تجھ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''خاندان عبدالمطلب کا جس قدر حصہ ہے وہ تمہارا ہے لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو۔'' نماز ظہر کے بعد ان لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے سامنے پیش کی، آپ نے فرمایا: ''مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے، لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کے لئے سفارش کرتا ہوں۔'' مہاجرین اور انصار بول اٹھے، ہمارا حصہ بھی حاضر ہے، اس طرح چھ ہزار دفعتاً آزاد تھے۔ ❷

واقعات متفرقہ

حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے اسی سال ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت ﷺ نے ابراہیم رکھا، آنحضرت ﷺ کو اس بچہ سے نہایت محبت تھی، ڈیڑھ سال (۱۷ یا اٹھارہ مہینے) زندہ رہا۔ جس دن ابراہیم نے وفات پائی سورج گرہن ہوا، عرب کا عقیدہ تھا کہ سورج گرہن عظیم الشان انسان کی موت کی علامت ہے، لوگوں نے سمجھا کہ یہ ابراہیم کی موت کا نتیجہ ہے، آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ ''سورج اور چاند اللہ کی قدرت ہیں، کسی کے مرنے اور جینے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے کسوف کی نماز با جماعت ادا فرمائی۔ ❸

آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔ ❹

---

❶ ایضا: ۴۳۳۰ وفتح الباری، پوری تفصیل فتح الباری میں ہے۔

❷ طبری، ج ۳، ص: ۱۶۷۲ (س) وطبقات ابن سعد، جلد مغازی، ص: ۱۱۱۔

❸ بخاری، کتاب الکسوف، باب الصلوة فی کسوف الشمس: ۱۰۴۰، و باب الصدقة فی الکسوف: ۱۰۴۴۔

❹ طبقات ابن سعد، ذکر نساء، ج۸، ص: ۲۲ واصابة، ج۸، ص: ۹۲۔

سنہ ۹ھ

واقعہ ایلاء وتخییر وغزوۂ تبوک

ایلاء اور تخییر ۹ ھ [1]

رسول اللہ ﷺ زاہدانہ اور تمام زخارف دنیوی سے بیگانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دو دو مہینے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے، مدت العمر دو وقت برابر سیر ہو کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اس جنس لطیف میں شامل تھیں جن کی مرغوب ترین چیز عموماً زیب وزینت اور ناز ونعمت ہے اور گو شرف صحبت نے ان کو تمام ابنائے جنس سے ممتاز کر دیا تھا تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں ہو سکتی تھی خصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحات اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور غنیمت کا سرمایہ اس قدر پہنچ گیا ہے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی ان کی راحت وآرام کے لئے کافی ہو سکتا ہے، ان واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کے صبر وقناعت کا جام لبریز ہو جاتا تھا۔

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں بڑے بڑے گھرانوں کی خواتین تھیں، حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا تھیں جو رئیس قریش کی صاحبزادی تھیں، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا جو قبیلہ بنی المصطلق کے رئیس کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کا باپ خیبر کا رئیس اعظم تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کے والد فاروق اعظم تھے، بشریت کے اقتضا سے ان میں منافست بھی تھی اور حریف کے مقابلہ میں اپنے رتبہ اور شان کا خیال رہتا تھا، آنحضرت ﷺ سے ہر ایک کو جو شدید محبت تھی وہ
ع باسایہ ترانمی پسندم، کی حد تک تھی۔

ایک دفعہ کئی دن تک آنحضرت ﷺ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس معمول سے زیادہ بیٹھے جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس کہیں سے شہد آ گیا تھا انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا، آپ کو شہد بہت مرغوب تھا، آپ نے نوش فرمایا، اس میں وقت مقررہ سے دیر ہو گئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو رشک ہوا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ جب ہمارے یا تمہارے گھر میں آئیں تو کہنا چاہیے کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے، (مغافیر کے پھولوں سے شہد کی مکھیاں رس چوستی ہیں) آنحضرت ﷺ نے

[1] بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ ذوالحجہ ۵ ھ کا واقعہ ہے، اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ نزول حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے لیکن آگے چل کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے کہ جب اس حادثہ کی مبہم خبر سے مسلمانوں میں اضطراب دیکھا تو سمجھے کہ غسان کا بادشاہ حملہ آور ہوا، جس کی اطلاع پہلے معلوم ہو چکی تھی، غسان کا حملہ ۹ ھ میں ہونے والا تھا، حافظ ابن حجر اور محدث دمیاطی نے بدلائل ثابت کیا کہ یہ اوائل ۹ ھ کا واقعہ ہے (دیکھو فتح الباری، جلد ۹، صفحہ: ۲۵۰) (س)

قسم کھائی کہ میں شہد نہ کھاؤں گا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری: ❶

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ ﴾ (٦٦/ التحريم: ١)

''اے پیغمبر! اپنی بیویوں کی خوشی کے لئے تم اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو؟''

علامہ عینی نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے:

فان قلت كيف جاز لعائشة وحفصة الكذب والمواطاة التي فيها ايذاء رسول الله ﷺ قلت كانت عائشة صغيرة مع انها وقعت منها من غير قصد الايذاء بل على ماهو من جبلة النساء في الغيرة على الضرائر۔ ❷

''اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کو جھوٹ بولنا اور آنحضرت ﷺ کے خلاف سازش کرنا کیونکر جائز تھا؟ تو جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ کمسن تھیں، اس کے علاوہ ان کا مقصود آنحضرت ﷺ کو ایذا دینا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ عورتیں اپنی سوکنوں کے مقابلہ میں رشک سے تدبیریں اختیار کرتی ہیں، اس طرح کی ایک تدبیر تھی۔''

لیکن علامہ موصوف کا جواب تسلیم کرنا مشکل ہے، اول تو یہ واقعہ ایلاء کے واقعہ کے سلسلہ میں ہے جو ۹ھ میں واقع ہوا تھا، اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سترہ برس کی ہو چکی تھیں، دوسرے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کمسن تھیں لیکن اور ازواج مطہرات جو اس میں شریک ہوئیں وہ تو پوری عمر کی تھیں، خود حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی عمر آنحضرت ﷺ کی شادی کے وقت ۲۱ برس کی تھی۔

ہمارے نزدیک مغافیر کی بو کا اظہار کرنا کوئی جھوٹ بات نہ تھی، تمام روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ لطیف المزاج تھے اور رائحہ کی ذرا سی ناگواری کو برداشت نہیں فرما سکتے تھے ❸ مغافیر کے پھولوں میں اگر کسی قسم کی کرختگی ہو تو تعجب کی بات نہیں ❹ البتہ ازواج مطہرات کا ایکا کرنا بظاہر محل اعتراض ہو سکتا ہے لیکن یہ کسی کا اعتقاد نہیں کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن معصوم تھیں یا اپنے انجاح مقصد کے لئے جائز وسائل نہیں اختیار کرتی تھیں، اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ آنحضرت ﷺ نے کوئی راز کی بات حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے فرمائی اور تاکید کر دی کہ کسی سے نہ کہنا، لیکن انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دیا اس پر یہ آیت اتری:

﴿ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ ﴾

(٦٦/ التحريم: ٣)

❶ صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة التحريم: ٤٩١٢ اس واقعہ کو بخاری، كتاب الطلاق، (باب لم تحرم ما احل الله لك: ٥٢٦٧، ٥٢٦٨) میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ اس تدبیر میں اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی شریک کر لی گئیں اور جس نے اول اس کا اظہار کیا وہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ ❷ تفسير سورة تحريم، ج٩، ص: ٢٢٦۔
❸ مسند احمد، ج٦، ص: ٢٤٩، (س) ❹ عمدة القاري، ج٩، ص: ٢٢٦، (س)

''اور جب کہ پیغمبر ﷺ نے اپنی بعض بیویوں سے راز کی بات کہی اور انہوں نے فاش کر دی اور اللہ نے پیغمبر کو اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے اس کا کچھ حصہ ان سے کہا اور کچھ چھوڑ دیا، پھر جب ان سے کہا تو انہوں نے کہا کہ آپ کو کس نے خبر دی، پیغمبر نے کہا مجھ کو خدائے عالم خبیر نے خبر دی۔''

شکر رنجیاں بڑھتی گئیں اور حضرت عائشہ وحفصہ رضی اللہ عنہما نے باہم مظاہرہ کیا، یعنی دونوں نے اس پر اتفاق کیا کہ دونوں مل کر زور ڈالیں، اس پر حضرت عائشہ وحضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی شان میں یہ آیتیں اتریں:

﴿ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴾ (٦٦/ التحريم:٤)

''اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو تمہارے دل مائل ہو چکے ہیں اور اگر ان کے (یعنی رسول اللہ) کے مقابلہ میں ایکا کرو تو اللہ اور جبریل اور نیک مسلمان اور سب کے بعد فرشتے رسول اللہ کے مددگار ہیں۔''

حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے جن معاملات کی وجہ سے ایکا کیا تھا وہ خاص تھے لیکن توسیع نفقہ کے تقاضے میں تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن شریک تھیں، آنحضرت ﷺ کے سکون خاطر میں یہ تنگ طلبی اس قدر خلل انداز ہوئی کہ آپ نے عہد فرمایا کہ ایک مہینہ تک ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے نہ ملیں گے، اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں آپ گھوڑے سے گر پڑے اور ساق مبارک پر زخم آیا آپ نے بالا خانہ [1] پر تنہا نشینی اختیار کی، واقعات کے قرینہ سے لوگوں نے خیال کیا کہ آپ نے تمام ازواج کو طلاق دی، اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کو ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے دلچسپ اور پر اثر تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا ہے، اس بیان میں کچھ ابتدائی واقعات بھی آ گئے ہیں جن سے اصل معاملہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ [2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں اور ایک انصاری (اوس بن خولی یا عتبان بن مالک) ہمسایہ تھے اور معمول تھا کہ باری باری سے ایک دن بیچ دے کر ہم دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

---

[1] بالا خانہ کے لئے احادیث میں مشربہ کا لفظ آیا ہے، مشربہ کے نام سے زیادہ تر مشربہ ام ابراہیم (ماریہ) مشہور ہے، اسی لئے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ وہی بالا خانہ تھا، لیکن یہ قطعاً غلط ہے، مشربہ ام ابراہیم مدینہ سے باہر واقع تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو روایت تمام صحاح میں موجود ہے اور جس کو مصنف نے آگے نقل کیا ہے اس سے بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ وہ مقام تھا جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر اور مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوڑ دوڑ کر کبھی ادھر کبھی ادھر جاتے تھے، ابو داود میں تصریح ہے کہ یہ مشربہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کا بالا خانہ تھا جو مسجد نبوی ہی سے متصل دیگر ازواج مطہرات کے حجروں کے برابر تھا (ابو داود، کتاب الصلوة، باب الامام يصلي من قعود:٦٠٢۔(س)۔

[2] یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب یعنی کتاب النکاح، باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها: ٥١٩١، وکتاب الطلاق، باب قوله تعالى: ﴿للذين يؤلون من نسائهم﴾: ٥٢٨٩، وكتاب العلم، باب التناوب في العلم: ٨٩ میں باختلاف عبارت منقول ہے، صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب في الايلاء واعتزال النساء، الخ: ٣٦٩١ تا ٣٦٩٦ میں بھی کئی طریق سے مذکور ہے، ان روایتوں میں باہم جزئیات میں اختلاف ہے ہم نے تا امکان سب روایتوں کو جمع کیا ہے۔

قریش کے لوگ عورتوں پر قابو رکھتے اور ان پر غالب رہتے تھے۔لیکن جب مدینہ میں آئے تو یہاں انصار کی عورتیں مردوں پر غالب تھیں ان کا انداز دیکھ کر ہماری عورتوں نے بھی ان کی تقلید شروع کی، ایک دن میں نے کسی بات پر اپنی بیوی کو ڈانٹا، انہوں نے الٹ جواب دیا، میں نے کہا: تم میری بات کا جواب دیتی ہو، بولیں تم کیا ہو؟، رسول اللہ ﷺ کی بیویاں ان کو برابر کا جواب دیتی ہیں، یہاں تک کہ دن بھر آنحضرت ﷺ سے روٹھی رہتی ہیں، میں نے دل میں کہا، غضب ہو گیا، اٹھ کر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ) کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا تو واقعی آنحضرت ﷺ سے رات بھر روٹھی رہتی ہے، حفصہ نے اقرار کیا، میں نے کہا تجھ کو یہ خیال نہیں کہ رسول کی ناراضی اللہ کی ناراضی ہے، بخدا رسول اللہ ﷺ میرا خیال فرماتے ہیں ورنہ تجھ کو طلاق دے چکے ہوتے، پھر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا اور ان سے بھی یہی شکایت کی، بولیں کہ عمر! تم ہر معاملہ میں دخل دینے لگے، یہاں تک کہ اب رسول اللہ ﷺ اور ان کی ازواج کے معاملات میں بھی دخل دیتے ہو، میں چپ رہ گیا اور اٹھ کر چلا آیا۔

کچھ رات گئی، میرے ہمسایہ انصاری باہر سے آئے اور بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، میں گھبرا کر اٹھا اور دروازہ کھول کر پوچھا خیر ہے؟ انہوں نے کہا: غضب ہو گیا، میں نے کہا: کیا غسانی [1] مدینہ پر چڑھ آئے؟ بولے کہ نہیں، اس سے بھی بڑھ کر یعنی رسول اللہ ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی، میں صبح کو مدینہ میں آیا، آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز فجر ادا کی، آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہو کر بالا خانہ میں تنہا جا کر بیٹھ گئے، میں حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا تو دیکھا وہ بیٹھی رو رہی ہے، میں نے کہا: ''میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا۔'' حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے اٹھ کر مسجد نبوی میں آیا، دیکھا تو صحابہ منبر کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، میں ان کے پاس بیٹھ گیا، لیکن طبیعت کو سکون نہیں ہوتا تھا، اٹھ کر بالا خانہ کے پاس آیا اور رباح (خادم خاص) سے کہا اطلاع کرو، لیکن آنحضرت ﷺ نے کچھ جواب نہیں دیا، میں اٹھ کر پھر مسجد میں آیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بیتاب ہو کر بالا خانہ کے نیچے آیا اور دربان سے دوبارہ اذن طلبی کی درخواست کی، جب کچھ جواب نہیں ملا تو میں نے پکار کر کہا، رباح! میرے لئے اذن مانگ شاید رسول اللہ ﷺ کو یہ خیال ہے کہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی سفارش کرنے آیا ہوں، اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ فرمائیں تو حفصہ رضی اللہ عنہا کی گردن اڑا دوں، آنحضرت ﷺ نے اجازت دی، اندر گیا تو دیکھا کہ آپ کھرّی چارپائی [2] پر لیٹے ہیں اور جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ادھر ادھر نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہوئے تھے ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کھونٹی پر لٹک رہی تھی، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آنحضرت ﷺ نے سبب پوچھا: میں نے عرض کی: اس سے

---

[1] غسانی عرب کا ایک خاندان تھا، جو شام میں رومیوں کے ماتحت بادشاہی کرتا تھا، وہ رومیوں کی تحریک سے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ [2] بعض روایتوں میں حصیر (چٹائی) کا لفظ آیا ہے اور بعض میں سریر (چارپائی) ابن حجر نے یہ تطبیق دی ہے کہ وہ تھی چارپائی لیکن چٹائی جس سے بنی جاتی ہے اس سے بنی ہوئی تھی (فتح الباری، جلد ۹ صفحہ: ۲۵۱)۔

بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا، قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ پیغمبر ہو کر، آپ کی یہ حالت ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا لیں اور ہم آخرت۔''

میں نے عرض کی کیا آپ نے ازواج کو طلاق دے دی؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''نہیں۔'' میں اللہ اکبر پکار اٹھا، پھر عرض کی، کہ مسجد میں تمام صحابہ مغموم بیٹھے ہیں اجازت ہو تو جا کر خبر کر دوں کہ واقعہ غلط ہے، چونکہ ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا تھا، آپ ﷺ بالا خانہ سے اتر آئے [1] اور عام باریابی کی اجازت ہو گئی۔ اس کے بعد آیت تخییر نازل ہوئی:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۸۔۲۹)

''اے پیغمبر (ﷺ)! اپنی بیویوں سے کہہ دے کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور دنیا کا زیب و آرائش مطلوب ہے تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر بطریق احسن رخصت کر دوں اور اگر اللہ، اللہ کا رسول اور آخرت مطلوب ہے تو اللہ نے تم میں سے نیکوکاروں کے لئے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے۔''

اس آیت کی رو سے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو مطلع فرما دیں کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں، دنیا اور آخرت۔ اگر تم چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور رسول اور زندگانی ابدی کی طلبگار رہو تو اللہ نے نیکوکاروں کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

مہینہ ختم ہو چکا تھا، آپ ﷺ بالا خانہ سے اُترے، چونکہ ان تمام معاملات میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پیش پیش تھیں ان کے پاس تشریف لے گئے اور مطلع فرمایا، انہوں نے کہا: میں سب کچھ چھوڑ کر اللہ اور رسول کو

[1] آنحضرت ﷺ بالاتفاق ۲۹ روز بالا خانہ پر تشریف فرما رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ مکالمہ پہلے روز کا واقعہ ہے یا آخری روز کا اس روایت کے جتنے طرق ہیں ان کا ابتدائی ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ پہلے ہی دن کا واقعہ ہے اور آخرت کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ انتیسویں روز کا واقعہ ہے مصنف مرحوم نے آخری فقروں کا لحاظ کیا ہے اور بظاہر اس کو انتیسویں روز کا واقعہ سمجھا ہے، لیکن اس بنا پر لازم آتا ہے کہ ۲۸ دن تک گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کو واقعۂ ایلاء کی اطلاع ہی نہ تھی، حالانکہ اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا، اس بنا پر محدثین نے یہ تاویل کی ہے کہ اس مکالمہ کا اکثر حصہ پہلے روز کا واقعہ ہے لیکن صرف اترنے کا بیان آخر روز کا واقعہ ہے، راوی نے بیچ کا سلسلہ چھوڑ دیا، بخاری کی اس روایت سے جو کتاب النکاح، باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها (۵۱۹۱) اور کتاب اللباس باب ماکان یتجوز رسول اللہ ﷺ من اللباس والبسط (۵۸۴۳) میں مذکور ہے یہ صاف تصریح موجود ہے، اس بنا پر اس فقرہ کو یوں پڑھنا چاہیے کہ جب ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا۔ (س)

لیتی ہوں، تمام ازواج مطہرات نے بھی یہی جواب دیا۔

ایلاء، تخییر، مظاہرہ حفصہ و عائشہ رضی اللہ عنہما، یہ واقعات عام طور پر اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ گویا مختلف زمانوں کے واقعات ہیں اور ان سے ایک ظاہر بین یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ ہمیشہ ناگواری کے ساتھ بسر کرتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں واقعے ہم زمان اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، صحیح بخاری [1] میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے اس میں صاف تصریح ہے کہ مظاہرۂ ازواج مطہرات سے انعزال، افشائے راز، آیت تخییر کا نزول سب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں۔

حافظ ابن حجر انعزال کے متعدد اسباب لکھ کر لکھتے ہیں:

وهذا هو اللائق بمكارم اخلاقه ﷺ وسعة صدره وكثرة صفحه وان ذلك لم يقع منه حتى تكرر موجبه منهن۔ [2]

''آنحضرت ﷺ کے مکارم اخلاق، کشادہ دلی اور کثرت عفو کے یہی مناسب ہے اور آپ نے اس وقت تک ایسا نہیں کیا ہوگا جب تک ان سے اس قسم کی حرکتیں متعدد بار ظہور پذیر نہ ہوئیں۔''

مظاہرہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی ضرر رساں سازش تھی جس کا اثر بہت پرخطر تھا۔ آیت مذکور یہ ہے:

﴿ وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ ﴾ (٦٦/ التحريم:٤)

''اور اگر تم دونوں (حضرت عائشہ و حفصہ رضی اللہ عنہما) رسول اللہ ﷺ کے برخلاف ایکا کرو تو اللہ اس کا مولا ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور ان سب کے ساتھ فرشتے بھی مددگار ہیں۔''

اس آیت میں تصریح ہے کہ اگر ان دونوں کا ایکا قائم رہا تو رسول اللہ ﷺ کی مدد کو اللہ اور جبریل اور نیک مسلمان موجود ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرشتے بھی اعانت کے لئے تیار ہیں۔

روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے وہ نفقہ کی توسیع چاہتی تھیں اور اگر ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کر دی جائیں لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں اور حضرت عائشہ و حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پرخطر ہو سکتی ہے جس کی مدافعت کے لئے ملائے اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو۔

اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا، مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک

[1] صحيح بخاري، باب النكاح (باب موعظة الرجل ابنته: ٥١٩١)۔

[2] فتح الباري، ج٩، ص: ٢٥٤۔

گروہ کثیر موجود تھا جن کی تعداد (۴۰۰) تک بیان کی گئی ہے، یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے خود آنحضرت ﷺ کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوادیں (ابن حجر نے اصابہ میں ام جلندح کے حال میں لکھا ہے: وكانت تحرش بين ازواج النبي ﷺ [1] ''وہ ازواج مطہرات کو باہم بھڑکایا کرتی تھیں۔'') افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آ چکی تھی، رسول اللہ ﷺ پندرہ دن تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کبیدہ خاطر رہے، حضرت حسان رضی اللہ عنہ افک میں شریک ہو گئے تھے، آنحضرت ﷺ کی سالی حمنہ جو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں سازش میں آ گئی تھیں، چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک قریبی عزیز (مسطح) کو جو شریک تہمت تھے مالی اعانت سے محروم کر دیا تھا، غرض اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت پر وحی نہ آ جاتی تو ایک فتنۂ عظیم برپا ہو چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی کشیدگیِ خاطر اور کبیدگی اور تنگ طلبی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دیکر بھڑکانا چاہا ہوگا، چونکہ مظاہرہ کے ارکان اعظم حضرت عائشہ و حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما تھیں، ان کو خیال ہوا ہوگا کہ ان کے ذریعہ سے ان کے والدین (حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما) کو اس سازش میں شریک کر لینا ممکن ہے لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ کی خاک پر قربان کر سکتے تھے، چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اذن نہ ملا تو انہوں نے پکار کر کہا کہ ''ارشاد ہو تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا سر لے کر آ ؤں۔''

آیت میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے یعنی اگر عائشہ و حفصہ رضی اللہ عنہما سازش بھی کریں گی اور منافقین اس سے کام لیں گے تو اللہ پیغمبر کی اعانت کے لئے موجود ہے اور اللہ کے ساتھ جبریل و ملائکہ بلکہ تمام عالم ہے۔

روایات کا ذبہ

ان واقعات میں کذابین رواۃ نے اس قدر تلبیسات اور خداعیاں کی ہیں کہ بڑے بڑے مؤرخین و ارباب سیر نے یہ روایتیں اپنی تصانیف میں سند کے طور پر درج کر دیں، اس لئے ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

اس قدر عموماً مسلّم ہے اور خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی خاطر سے کوئی چیز اپنے اوپر حرام کر لی تھی، اختلاف اس میں ہے کہ وہ کیا چیز تھی؟ بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ ایک کنیز تھیں جن کو عزیز مصر نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحفۃً بھیجا تھا، ماریہ قبطیہ کی روایت تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے جن میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا راز جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے فاش کر دیا تھا، ان ہی ماریہ قبطیہ کا راز تھا اگر چہ یہ روایتیں بالکل موضوع اور ناقابل ذکر ہیں، لیکن یورپ کے اکثر مؤرخوں نے آنحضرت ﷺ کے معیار اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں ان کی گل

[1] الاصابة لابن حجر: ج٨، ص:٢١٨۔

سرسبد یہی ہیں، اس لئے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے۔ ان روایتوں میں واقعہ کی تفصیل کے متعلق اگرچہ نہایت اختلاف ہے، لیکن اس قدر سب کی قدر مشترک ہے کہ ماریہ قبطیہ آنحضرت ﷺ کی موطوءہ کنیزوں میں تھیں اور آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی ناراضی کی وجہ سے ان کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔

حافظ ابن حجر شرح صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں:

ووقع عند سعید بن منصور باسناد صحیح الی مسروق قال حلف رسول اللہ ﷺ لحفصة لا یقرب امته الخ۔ ❶

''اور سعید بن منصور نے سند صحیح کے ساتھ جو مسروق تک منتہی ہوتی ہے، یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سامنے قسم کھائی کہ اپنی کنیز سے مقاربت نہ کریں گے۔''

اس کے بعد حافظ موصوف نے مسند، (ہیثم بن کلیب) اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

وللطبرانی من طریق الضحاك عن ابن عباس قال دخلت حفصة بیتها فوجده یطأ ماریة فعاتبته۔ ❷

''اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر میں گئیں تو آنحضرت ﷺ کو حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہم بستر دیکھا، اس پر انہوں نے آنحضرت ﷺ کو معاتب کیا۔''

ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے، ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں محض افترا اور بہتان ہیں۔

علامہ عینی شرح صحیح بخاری باب النکاح جلد ۹ صفحہ ۵۴۸ میں لکھتے ہیں:

والصحیح فی سبب نزول الآیة انه فی قصة العسل لا فی قصة ماریة المروی فی غیر الصحیحین وقال النووی ولم تأت قصة ماریة من طریق صحیح۔

''اور آیت کی شان نزول کے باب میں صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے واقعہ میں ہے ماریہ رضی اللہ عنہا کے قصہ کے باب میں نہیں ہے جو صحیحین کے سوا اور کتابوں میں مذکور ہے، نووی نے کہا ہے کہ ماریہ کا واقعہ کسی صحیح طریقہ سے مروی نہیں ہے۔''

یہ حدیث تفسیر ابن جریر، طبرانی، مسند ہیثم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ان کتابوں میں عموماً جس قسم کی رطب ویابس روایتیں مذکور ہیں اس کے لحاظ سے جب تک ان کی صحت کے متعلق کوئی خاص تصریح نہ ہو

❶ ج ۸، ص: ۵۰۳۔ ❷ فتح الباری، ج ۸، ص: ۵۰۳ مطبوعہ مصر۔

تو لائق التفات نہیں، حافظ ابن حجر نے ان میں ایک طریقہ کی توثیق کی ہے، یعنی وہ روایت جس کے راوی اخیر مسروق ہیں۔ [1] لیکن اولاً تو اس روایت میں ماریہ قبطیہ کا نام مطلق نہیں، صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی کنیز کے پاس نہ جاؤں گا اور وہ مجھ پر حرام ہے۔ اس کے علاوہ مسروق تابعی ہیں، یعنی آنحضرت ﷺ کو نہیں دیکھا اس لئے یہ روایت اصول حدیث کی رو سے منقطع ہے۔ یعنی اس کا سلسلۂ سند صحابی تک نہیں پہنچتا۔ اس حدیث کے ایک اور طریقہ کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحیح کہا ہے۔ [2] لیکن اس طریقہ کے ایک اور راوی عبدالملک رقاشی ہیں جن کی نسبت دار قطنی نے لکھا ہے:

كثير الخطأ فى الاسانيد والمتون يحدث من حفظه۔ [3]

''سندوں میں اور اصل الفاظِ حدیث میں بہت خطا کرتے ہیں اور اپنے حافظہ کی بنیاد پر حدیث بیان کرتے ہیں۔''

یہ امر مسلم ہے کہ ماریہ کی روایت صحاح ستہ کی کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ [4] یہ بھی تسلیم ہے کہ سورۂ تحریم کا شان نزول جو صحیح بخاری اور مسلم میں مذکور ہے، (یعنی شہد کا واقعہ) قطعی طریقہ سے ثابت ہے، امام نووی نے جو ائمہ محدثین میں سے ہیں صاف تصریح کی ہے کہ ماریہ رضی اللہ عنہا کے باب میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں، حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے جن طریقوں کو صحیح کہا ان میں سے ایک منقطع اور دوسرے کا راوی کثیر الخطا ہے ان واقعات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روایت استناد کے قابل ہے۔ یہ بحث اصول روایت کی بنا پر تھی، درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کدوکاوش کی حاجت نہیں، جو رکیک واقعہ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کیے جا سکتے، نہ کہ اس ذات پاک کی طرف جو تقدس ونزاہت کا پیکر تھا۔ (ﷺ)

---

[1] فتح البارى، تفسير سورة تحريم، ج٨، ص:٥٠٣۔

[2] ج٤، ص:٣٨٦۔ [3] تهذيب التهذيب، ج٦، ص:٤٢٠۔

[4] (یعنی ماریہ کے نام سے اور مشہور لغو واقعات کے شمول کے ساتھ نہیں ورنہ نسائی، كتاب عشرة النساء، باب الغيرة: ٣٤١١ میں اس قدر مذکور ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کے اصرار سے، آنحضرت ﷺ نے ایک لونڈی کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، لیکن اس کا ایک راوی مجروح ہے)۔ (س)۔

غزوۂ تبوک

رجب ☆ ۹ھ مطابق نومبر ۶۳۰ء

تبوک ایک مشہور مقام ہے جو مدینہ اور دمشق کے وسط میں نصف راہ پر مدینہ سے چودہ منزل ہے۔

جنگ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے زیر اثر حکومت کر رہا تھا، مذہباً عیسائی تھا، اس لئے قیصر روم نے اسی کو اس مہم پر متعین کیا۔ مدینہ میں یہ خبریں اکثر مشہور ہوتی رہتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ کے ایلاء کے واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب عتبان بن مالک نے دفعتہً آ کر یہ کہا کہ غضب ہو گیا۔ تو انھوں نے کہا کیوں خیر ہے؟ کیا غسانی آ گئے؟ [1]

شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغن زیتون بیچنے آیا کرتے تھے، انہوں نے خبر دی [2] کہ رومیوں نے شام میں لشکر گراں جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں جمع کر دی ہیں، اس فوج میں لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور مقدمۃ الجیش بلقاء تک آ گیا ہے [3] مواہب لدنیہ میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا کہ "محمد ﷺ نے انتقال کیا اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں۔" اس بنا پر ہرقل نے چالیس ہزار فوجیں روانہ کیں۔

بہر حال یہ خبریں تمام عرب میں پھیل گئیں اور قرائن اس قدر قوی تھے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ سوئے اتفاق یہ کہ سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں۔ ان اسباب سے لوگوں کو گھر سے نکلنا نہایت شاق تھا۔ [4] منافقین جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے ان کا پردہ فاش ہو چلا، وہ خود بھی جی چراتے تھے [5] اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے:

﴿ لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ﴾ (۹/ التوبۃ:۸۱) "گرمی میں نہ نکلو۔"

سویلم ایک یہودی تھا۔ اس کے گھر پر منافقین جمع ہوتے اور لوگوں کو لڑائی پر جانے سے روکتے چونکہ ملک پر رومیوں کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے تمام قبائل عرب سے فوجیں اور مالی اعانت طلب کی۔ [6] صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دو سو اوقیہ چاندی اور دو سو اونٹ پیش کئے۔ [7]

☆ ماہ رجب، ارباب سیر کا متفقہ قول ہے جو ۹ھ میں اکتوبر، نومبر میں پڑا تھا لیکن قرآن مجید میں غزوہ کا شدید گرمی میں ہونا مذکور ہے، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ غزوہ سفر طائف کے چھ ماہ بعد پیش آیا (زرقانی، ج ۳، ص: ۷۱ بحوالہ ابن حجر) اس لحاظ سے اس سفر کا گرمی کے موسم میں امکان ہے۔

[1] (بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة التحريم، باب تبتغي مرضات ازواجك: ٤٩١٣ وكتاب النكاح، باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها: ٥١٩١)

[2] مواهب لدنيه (مع زرقانی ج ٣، ص: ٧٢) [3] طبقات ابن سعد، غزوات، ص: ١١٩۔

[4] مارگولیتھ صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ حنین میں انصار مال غنیمت سے محروم رہے تھے اس لئے وہ بے دل ہو گئے تھے کہ ہم کیا لڑیں۔ جب فوائد جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے لیکن یہ مارگولیتھ صاحب کا حسن ظن ہے (قرآن نے خود بتا دیا ہے تو قیاس کی کیا حاجت ہے) (س)

[5] ابن هشام، ج ٢، ص: ٣٣٢۔ [6] ابن سعد، جزء المغازي، ص: ١١٩ (س) وابن هشام، ج ٢، ص: ٣٣٢، ٣٣٣۔ [7] زرقاني، ج ٣، ص: ٧٢ (س)۔

اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بڑی بڑی رقمیں لا کر حاضر کیں تاہم بہت سے مسلمان اس بنا پر جانے سے رہ گئے کہ سفر کا سامان نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور اس درد سے روئے کہ آنحضرت ﷺ کو اُن پر رحم آیا، تاہم اُن کے چلنے کا کچھ سامان نہ ہوسکا، انہی کی شان میں سورۂ توبہ کی یہ آیتیں اُتری ہیں: ❶

﴿ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴾ . (٩/ التوبة:٩٢)

''اور نہ ان لوگوں پر کچھ اعتراض ہے کہ جب تمہارے پاس آئے کہ ہم کو سواری دیجئے اور تم نے کہا کہ میرے پاس سواری کہاں ہے جس پر تم کو سوار کرسکوں تو وہ واپس گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہمارے پاس خرچ نہیں ہے۔''

آنحضرت ﷺ کا معمول تھا جب آپ ﷺ مدینہ سے تشریف لے جاتے تو کسی کو شہر کا حاکم مقرر فرما کر جاتے چونکہ اس غزوہ میں بخلاف اور معرکوں کے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن ساتھ نہیں گئی تھیں، اہل حرم کی حفاظت کے لئے کسی عزیز خاص کا رہنا ضروری تھا، اس لئے اب کے یہ منصب جناب امیر کو ملا لیکن انہوں نے شکایت کی کہ آپ ﷺ مجھ کو بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جاتے ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہو جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی۔'' ❷

غرض آپ ﷺ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے نکلے جس میں دس ہزار گھوڑے تھے۔ ❸ راہ میں وہ عبرتناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، یعنی قوم ثمود کے مکانات جو پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے تھے، چونکہ اس مقام پر عذاب الٰہی نازل ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پیے اور نہ کسی کام میں لائے۔ ❹

تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی لیکن اصلیت سے بالکل خالی بھی نہ تھی، غسانی رئیس عرب میں ریشہ دوانیاں کررہا تھا۔ صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں جہاں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے لکھا ہے کہ شام سے ایک قاصد آیا اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو رئیس غسان کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ میں نے سُنا ہے کہ محمد (ﷺ) نے تمہاری قدر نہ کی، اس لئے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمہاری شان کے موافق تم سے برتاؤ کروں گا، حضرت کعب رضی اللہ عنہ معتوب نبوی ﷺ تھے لیکن انہوں نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا۔ ❺

---

❶ سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۳۳۳۔ ❷ صحیح بخاری، كتاب المغازى، غزوة تبوك: ٤٤١٦ وسیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۳۳٤۔ ❸ طبقات ابن سعد، جزء مغازی، ص: ۱۱۹۔ (س)۔

❹ صحيح بخاری، كتاب المغازى، باب نزول النبى ﷺ الحجر: ٤٤١٩، ٤٤٢٠، سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص: ۳۳۵۔ ❺ بخاری، كتاب المغازى، باب حديث كعب بن مالك: ٤٤١٨۔

تبوک پہنچ کر آنحضرت ﷺ نے بیس دن تک قیام کیا۔ [1] ایلہ [2] کا سردار جس کا نام یوحنا تھا، حاضر خدمت ہوکر جزیہ دینا منظور کیا۔ [3] ایک سفید خچر بھی نذر میں پیش کیا۔ جس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ نے اس کو ردائے مبارک عنایت فرمائی [4] جربا اوراذرح کے عیسائی بھی حاضر ہوئے اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کی [5] دومۃ الجندل جو دمشق سے پانچ منزل پر ہے وہاں ایک عربی سردار جس کا نام اکیدر تھا، قیصر کے زیراثر تھا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو چارسو (بیس) کی جمعیت کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس کو گرفتار کیا اور اس شرط پر رہائی دی کہ خود دربار رسالت میں حاضر ہوکر شرائط صلح پیش کرے، چنانچہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مدینہ میں آیا۔ آپ ﷺ نے اس کو امان دی۔ [6]

تبوک سے جب آپ ﷺ واپس پھرے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ عالم شوق میں استقبال کو نکلے یہاں تک کہ پردہ نشینانِ حرم بھی جوش میں گھروں سے نکل پڑیں اور لڑکیاں یہ اشعار گاتی نکلیں: [7]

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا للّٰہ داع

"وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند طلوع ہوا۔ جب تک خدا کا پکارنے والا کوئی دنیا میں باقی ہے ہم پر خدا کا شکر فرض ہے۔"

مسجدِ ضرار

منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں میں کسی طرح پھوٹ ڈال دو، ایک مدت سے وہ اس خیال میں تھے کہ مسجد قبا کے توڑ پر وہیں ایک مسجد اس حیلہ سے بنائیں کہ جو لوگ ضعف یا کسی اور وجہ سے مسجد نبوی ﷺ میں نہ پہنچ سکیں، یہاں آکر نماز ادا کرلیا کریں۔ ابوعامر جو انصار میں سے عیسائی ہوگیا تھا، اس نے منافقین سے کہا کہ تم سامان کرو، میں قیصر کے پاس جاکر وہاں سے فوجیں لاتا ہوں کہ اس ملک کو اسلام سے پاک کردوں۔ [8]

آنحضرت ﷺ جب تبوک تشریف لے جانے لگے تو منافقین نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ ہم نے بیماروں اور معذوروں کے لئے ایک مسجد تیار کی ہے آپ ﷺ چل کر اس میں ایک دفعہ نماز پڑھادیں تو مقبول ہوجائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت میں مہم پر جارہا ہوں جب تبوک سے

[1] طبقات ابن سعد، ج غزوات: ۱۱۹۔ [2] یہ مقام خلیج عقبہ کے پاس ہے۔ (مارگولیتھ)۔
[3] سیرت ابن ھشام، ج ۲، ص: ۳۳۸۔ [4] زرقانی بحوالہ ابن ابی شیبہ، ج ۳، ص: ۸۶۔ (س)۔
[5] سیرت ابن ھشام، ج ۲، ص: ۳۳۸۔ [6] طبقات ابن سعد، ج مغازی، ص: ۱۲۰۔
[7] زرقانی بحوالہ ابن جریر، (ج ۳، ص: ۹۲) (س)۔ [8] زرقانی بحوالہ ابن جریر، (ج ۳، ص: ۹۱) (س)۔

واپس پھرے تو مالک اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ جا کر مسجد میں آگ لگا دیں۔ [1] اسی مسجد کی شان میں یہ آیتیں اتری ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۷۔۱۰۸)

’’اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد ضرار اور پھوٹ ڈالنے اور کفر کی غرض سے تیار کی اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے خدا اور رسول ﷺ سے لڑتے ہیں ان کو ایک کمین گاہ ہاتھ آئے اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے ایسا کیا اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ محمد (ﷺ)! تو کبھی اس مسجد میں جا کر نہ کھڑا ہو وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تو اس میں نماز پڑھے، وہاں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی محبوب ہے اور خدا صفائی پسند کرنے والوں کو چاہتا ہے۔‘‘

حج اسلام اور اعلان براءت

مکہ ۸ھ میں فتح ہوا لیکن چونکہ ابھی تک ملک میں اچھی طرح امن وامان قائم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس سال مشرکین ہی کے اہتمام سے ارکان حج انجام پائے، مسلمانوں نے حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو مکہ کے امیر مقرر ہوئے تھے۔ فریضۂ حج ادا کیا، اب ۹ھ پہلا موقع ہے کہ کعبہ کفر وشرک کی ظلمت سے پاک ہو کر عبادت ابراہیمی کا مرکز قرار پاتا ہے۔ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ذیقعدہ یا ذوالحجہ ۹ھ میں آنحضرت ﷺ نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لئے روانہ فرمایا، ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ قافلہ سالار، حضرت علی رضی اللہ عنہ نقیبِ اسلام اور حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت جابر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم [2] وغیرہم معلم تھے۔ قربانی کے لئے (آنحضرت ﷺ کی طرف سے) بیس اونٹ ساتھ تھے۔

قرآن نے اس حج کو حج اکبر کہا ہے [3] کہ یہ پہلا موقع تھا کہ رسم حج ابراہیمی سنت میں جلوہ گر ہوئی۔

---

[1] سیرت ابن هشام، ج۲، ص:۳٤۱، زیادہ تفصیل زرقانی علی المواهب، ج۳، ص:۹۰، ۹۱ پر ہے۔

[2] بخاری، کتاب الحج، باب لایطوف بالبیت عریان: ۱٦۲۲ کتاب المغازی، باب حج ابی بکر بالناس: ٤۳٦۳ وکتاب التفسیر تفسیر سورة براءة، باب قوله: ﴿فسيحوا في الارض﴾ الخ: ٤٦٥٥ و باب قوله: ﴿واذان من الله﴾ الخ: ٤٦٥٦ وباب قوله: ﴿الا الذين عاهدتم﴾: ٤٦٥۷ وصحیح مسلم، کتاب الحج، باب لا یحج البیت مشرك الخ: ۳۲۸۷۔

[3] سورۂ توبہ میں ہے کہ ﴿يوم الحج الاكبر﴾ مصنف نے اس حج کو حج اکبر کہنے کی جو توجیہ لکھی ہے اس کو بھی گو بعض علما نے اختیار کیا ہے لیکن عام خیال یہ ہے کہ خاص اسی سال کے حج کو حج اکبر نہیں کہا گیا ہے بلکہ ہر حج عمرہ کے مقابلہ میں حج اکبر ہے اور عمرہ حج اصغر ہے، ملاحظہ ہو روح المعانی، ج ۱۰، ص: ٤۲ (س)۔

اس حج کا مقصد یہ تھا کہ خانۂ خلیل میں عہد جاہلیت کے اختتام اور حکومت اسلام کی ابتدا کا اعلان کیا جائے۔ مناسک ورسوم حج کی عام طور سے تعلیم دی جائے۔ زمانہ جاہلیت کے رسوم وعادات کا ابطال کیا جائے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مناسک حج کی لوگوں کو تعلیم دی، یوم النحر میں خطبہ دیا جس میں حج کے مسائل بیان کئے، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ سورۂ براءت کی ۴۰ آیتیں پڑھ کر سنائیں اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔ نہ کوئی برہنہ اب حج کرنے پائے گا اور وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے تھے، ان کے نقض عہد کے سبب سے آج سے چار مہینے کے بعد ٹوٹ جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اس اعلان کی اس زور زور سے منادی کی کہ گلا پڑ گیا [1] سورۂ براءت کی ابتدائی آیتیں جس میں اللہ نے اس کا حکم فرمایا وہ یہ ہیں: [2]

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۔۴)

''اے مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا (اور انہوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا) ان کی خدا اور، خدا کے رسول کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اب (اے معاہدہ شکن مشرکو!) چار مہینے کی تم کو مہلت ہے اس میں تم ملک میں چلو پھرو اور جان لو کہ تم خدا کو عاجز نہ کر سکو گے حج اکبر کے دن لوگوں کو اعلان عام ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان مشرکین کا اب ذمہ دار نہیں اگر (تم نے اے مشرکین!) توبہ کر لی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر اب بھی پھرے رہو تو یقین کرو کہ تم خدا کو ہرا نہ سکو گے اے پیغمبر! تو کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دے لیکن وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے اس کے ایفا میں تمہارے ساتھ کچھ کمی نہ کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں انہوں نے تمہارے دشمنوں کی مدد کی تو زمانہ معاہدہ کو تم پورا کرو۔

---

[1] مسند ابن حنبل، ج ۲، ص: ۲۹۹۔ عام تفصیل زرقانی، ج ۳، ص: ۱۰۲ وغیرہ میں موجود ہے (س)

[2] ان آیات میں یہ بیان ہے کہ مسجد حرام کے پاس (صلح حدیبیہ میں) جو معاہدے ہوئے تھے وہ ٹوٹ گئے لیکن وہ معاہدے تو فتح مکہ سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے اور اس کے بعد کفار سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ مصنف نے اس بنا پر اپنے ایک مکتوب ۔مکاتیب شبلی، حصہ دوم مکتوب نمبر ۲۷، ص: ۵۱، ۵۲) میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیتیں ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہوں گی اور شاید اسی لئے مصنف نے یہ واقعات قلم انداز کر دیے ہیں لیکن خاکسار جامع کا خیال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ معاہدہ کے متعلق یہ آیتیں گو ۸ھ میں نازل ہوئی ہوں لیکن ان کا عام اعلان مع دیگر ضروری احکام کے جیسا کہ صحاح ستہ کی مستند روایات میں مذکور ہے ۹ھ کے موسم حج میں ہوا ہو۔ (س)۔

خدا پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔''

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ﴾

(۹/ التوبة:۲۸)

''اے مسلمانو! مشرکین تو ناپاک ہیں اب وہ اس سال کے بعد کعبہ کے قریب نہ آئیں۔''

(طبری نے بواسطہ سدی روایت کی ہے کہ اس اعلان کے بعد کفار عام طور سے مسلمان ہوگئے [1])

واقعات متفرقہ

(نو سال کے بعد اب ملک میں امن و امان کا دور شروع ہوا۔ اب حصولِ دولت کے مواقع حاصل تھے۔ اس بنا پر زکوۃ کا حکم اس سال نازل ہوا اور تحصیل زکوۃ کے لئے عمال قبائل میں مقرر ہوئے۔ [2]

اسلام کے سایہ میں بعض غیر مسلم قومیں بھی داخل ہو چکی تھیں، ان کے جزیہ کی یہ آیت اتری:

﴿ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ (۹/ التوبة:۲۹)

''تا آنکہ چھوٹے بن کر وہ جزیہ نہ ادا کریں۔''

سود کی تحریم بھی اسی سال نازل ہوئی اور اس کے ایک سال بعد ۱۰ھ میں حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ نے اس کا اعلان عام فرمایا۔

نجاشی [3] جس کے ظل حمایت میں مسلمانوں نے چند سال حبشہ میں بسر کئے، اس نے امسال انتقال کیا، آنحضرت ﷺ نے اس کی وفات کا خود اعلان فرمایا کہ مسلمانو! آج تمہارے برادر صالح اصحمہ نے وفات پائی، اس کے لئے دعائے مغفرت مانگو۔ اس کے بعد نجاشی کے لئے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی)۔

---

[1] ج ٤، ص: ۱۷۲۱۔(س) [2] طبری، ج ٤، ص: ۱۷۲۲۔(س)۔

[3] تاریخ طبری، ج ٤، ص: ۱۷۲۰۔ غائبانہ نماز جنازہ کا ذکر صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں ہے۔

غزوات پر دوبارہ نظر

کتاب کا یہ حصہ سادہ سوانح زندگی پر محدود ہے۔ بحث و تدقیقات اور رفع شکوک کے لئے دوسرے حصے ہیں، اس بنا پر مناسب یہ تھا کہ غزوات کے متعلق جو مباحث ہیں، انہی حصوں میں لکھے جاتے لیکن کتب سیر میں کثرت اور اہمیت دونوں حیثیتوں سے جو واقعات زیادہ تر نمایاں ہیں، صرف غزوات ہیں، اگر صرف تصانیف سیرت کو پیش نظر رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تمام تر سوانح عمری غزوات ہی کا نام ہے، چنانچہ پہلے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ سیرت نہیں بلکہ مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں، مثلاً: مغازی ابن عقبہ، مغازی ابن اسحاق، مغازی واقدی یہ انداز تحریر آج تک چلا آیا، اس لئے اگر یہ طرز بالکل بدل دی جائے تو جو شخص کوئی قدیم تصنیف پہلے پڑھ چکا ہوگا وہ اس جدید تصنیف کو پڑھ کر سمجھے گا کہ سیرت کے بجائے کوئی اور چیز پڑھ رہا ہے۔ ان اسباب سے ہم کو بھی غزوات کو تفصیل سے لکھنا پڑا، لیکن غزوات کو پڑھ کر جو سوالات دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں ان کو دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھنا ناظرین کے اضطراب کا باعث ہوگا۔

غیر مذہب والوں نے غزوات کے مقاصد اور اسباب کے سمجھنے میں سخت غلطیاں کی ہیں، نہ صرف بدنیتوں نے، بلکہ نیک دلوں نے بھی۔ لیکن یہ تعجب کی بات نہیں، اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔

عرب اور جنگ و غارت گری

اس باب میں سب سے مقدم اور سب سے اہم اس حقیقت کا معلوم کرنا ہے کہ عرب کی قومیت کو ''جنگ و غارت گری'' سے کیا تعلق ہے؟ ہر قوم کے اخلاق و عادات، رسوم و معاملات، محاسن و اوصاف، معائب و مثالب، غرض اس کی کل قومی زندگی کا ایک خاص اساس الامر ہوتا ہے کہ سب چیزیں اسی سے بنتی اور اسی سے نشو و نما پاتی ہیں، عرب میں یہ چیز جنگ و غارت گری تھی، اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ عرب ایک ویران ملک تھا، کسی قسم کی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی لوگ ان پڑھ اور جاہل تھے، خورش اور پوشش کا قدرتی سامان صرف بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے کہ ان کا دودھ اور گوشت کھاتے اور بالوں کو بن کر کمبل بناتے تھے لیکن یہ جائیداد بھی ہر شخص کو نصیب نہ تھی، یا تھی تو بقدر ضرورت نہ تھی، اس لئے حملہ اور غارت گری شروع ہوئی اور معاش کا سب سے بڑا بلکہ تنہا ذریعہ غارت گری قرار پایا، ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے: [1]

وذلك انهم كانوا يكرهون ان تتوالى عليهم ثلاثة اشهر لا تمكنهم الا غارة فيها لان معاشهم كان من الاغارة.

''یہ اس لئے کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ ان پر تین ماہ متواتر اس طرح گزر جائیں کہ ان میں وہ

---

[1] كتاب الامالی، ج ۱، ص: ٦ مطبوعہ مصر۔

غارت گری نہ کرسکیں کیونکہ ان کا ذریعہ معاش یہی تھا۔"

چونکہ لوٹ میں زیادہ تر بکریاں ہاتھ آتی تھیں اور بکری کو عربی میں "غنم" کہتے ہیں اس لئے لوٹ کے مال کو عربی میں "غنیمت" کہنے لگے، [1] اس لفظ نے پھر یہ وسعت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج و تخت لٹ کر آیا تو اسی نام سے پکارا گیا۔

رفتہ رفتہ یہی لفظ عربی قوم، عربی زبان اور عربی تاریخ کا سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ نمایاں اور سب سے زیادہ وسیع الاثر لفظ بن گیا آج بھی ایک سلطان، ایک رئیس، ایک شیخ القبائل اپنے عزیز و اقارب کو سفر کے وقت رخصت کرتا ہے تو کہتا ہے، سالمًا غانمًا "یعنی سلامت آنا اور لوٹ کر لانا۔" ہماری زبان میں سب سے عزیز چیز کو جو "غنیمت" کہتے ہیں، (مثلاً آپ کا تشریف لانا نہایت غنیمت ہے) یہ وہی لفظ ہے اور عربی زبان سے آیا ہے۔

ضرورت معاش کی وجہ سے تمام عرب میں غارت گری اور جنگ عام ہوگئی تھی، تمام قبائل ایک دوسرے پر ڈاکہ ڈالتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے، صرف حج کے زمانہ میں مذہبی خیال سے چار مہینے مخصوص کردیے تھے، جن کو "اشہر حرم" کہتے تھے، ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہوجاتی تھیں لیکن متصل تین تین مہینہ تک معاش کا معطل رہنا سخت گراں تھا، اس لئے "نسی" ایک رسم ایجاد کرلی تھی، یعنی ان مہینوں کو حسب ضرورت دوسرے مہینوں سے بدل لیتے تھے۔

حافظ ابن حجر، صحیح بخاری کی شرح (تفسیر سورۂ توبہ) میں لکھتے ہیں:

کانوا یجعلون المحرم صفرا و یجعلون صفرا المحرم لئلا یتوالی علیهم ثلاثة اشهر لا یتعاطون فیها القتال۔ الخ [2]

"وہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم کردیا کرتے تھے، تاکہ پے در پے تین مہینے تک لڑائی سے محروم نہ ہو جائیں۔"

ثار کا عقیدہ

لڑائی کا اصلی ابتدائی سبب یہ تھا لیکن جب یہ سلسلہ چھڑا تو اور اور اسباب بھی پیدا ہوگئے اور یہ اسباب اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے اصلی سبب سے کم نہ تھے، ان میں سب سے مقدم اور شدید الاثر ثار کا قانون تھا، یعنی جب کسی قبیلہ کا کوئی شخص کسی موقع پر قتل ہوجاتا تھا تو مقتول کے قبیلہ کو اس کا انتقام لینا فرض ہوجاتا تھا، گو سینکڑوں برس گزر جاتے تھے اور قاتل بلکہ اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا تاہم جب تک قاتل کے قبیلے کے ایک آدمی کو قتل نہیں کرلیتا تھا قومی فرض سے ادا نہیں ہوسکتا تھا، اسی کو ثار کہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی قتل پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک مسلسل لڑائیاں قائم ہوجاتی تھیں، اسی طریقہ کے ابطال کا

[1] یہ مصنف کی ذاتی تحقیق ہے جس کی تائید کتب لغت سے ہاتھ نہیں آئی۔ (س) [2] (ج۸، ص:۲٤٤)

آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع میں اعلان کیا تھا اور اپنے قبیلہ کے قاتلوں کا خون معاف کر دیا تھا، لیکن صحرانشین عربوں میں آج تک یہ طریقہ قائم اور ان کے قومی خصائص کا جزو اعظم ہے۔

ثار کے متعلق عجیب عجیب قسم کے معتقدات پیدا ہو گئے تھے، مثلاً: یہ کہ مقتول جب مر جاتا ہے تو اس کی روح پرند بن جاتی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا، مقام قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ "مجھ کو پلاؤ میں پیاسی ہوں" اس پرند کو صدیٰ یا ہامہ کہتے تھے۔

ابودواد ایادی کہتا ہے:

سلط الموت والمنون علیهم   فلهم فی صدی المقابر هام ❶

"ان پر موت مسلط ہوگئی اور مقبروں کے "صدیٰ" میں ان کے لئے "ہام" ہے۔"

ذوالاصبع العدوانی کا شعر ہے:

یا عمرو ان لا تدع شتمی ومنقصتی   اضربك حیث تقول الهامة اسقونی ❷

"اے عمرو! اگر تو مجھ کو گالی دینا اور میری تحقیر کرنا نہ چھوڑے گا تو میں تجھ کو اس طرح ماروں گا کہ ہامہ کہے گی کہ مجھ کو سیراب کرو۔"

ایک یہ خیال تھا کہ جس مقتول کا انتقام نہیں لیا جاتا اس کی قبر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے، عمرو بن معدی کرب کی بہن مقتول کی زبان سے کہتی ہے:

واترك فی قبر بصعدة مظلم ❸   خون بہا لو گے تو میں اندھیری قبر میں پڑا رہوں گا۔

اسی بنا پر خون بہا لینے کو عیب سمجھتے تھے، اسی شاعرہ کا مصرع ہے:

ومشوا باذان النعام المثلم ❹   اور خون بہا لینا ہے تو بوچے شتر مرغ کا کان پکڑ کر لے جاؤ۔"

غیرت اور حمیت کی بنا پر اس بات کو عیب سمجھتے تھے کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے:

ولا تراهم وان جلت مصیبتهم   مع البکاة علی من مات یبکونا ❺

"گو کتنی ہی بڑی مصیبت ہو لیکن ان کو مرنے والے پر روتا ہوا نہ دیکھو گے۔"

عمرو بن کلثوم

معاذ الا له ان ینوح نساء نا   علی هالك اوان نضجّ من القتل ❻

---

❶ لسان العرب، ج۳، ص:۸٤٦ لفظ هام دارلسان العرب بیروت۔ ❷ کتاب الاغانی ذکر ذی الاصبع العدوانی، الخ، ج۳، ص:۹۔ ❸ دیوان الحماسة، باب الحماسة جزء اول، ص:۷۱ شاعرہ کا نام کبشہ ہے۔

❹ ایضا، ص:۷۲۔ ❺ دیوان الحماسة، باب الحماسة جزء اول، ص:۷۲، مطبع سعادة مصر ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء یہ شعر بنی قیس بن ثعلبہ کے کسی شخص کا ہے۔

❻ شعراء النصرانیة، القسم الثانی فی شعراء نجد والحجاز، ص: ۲۰٤ بیروت: ۱۸۹۰ء۔

''اللہ نہ کرے کہ ہماری عورتیں مقتول پر نوحہ کریں یا ہم قتل سے گھبرا جائیں۔''

مقتول پر نوحہ کرتے تھے تو اس وقت کرتے تھے جب خون کا انتقام لے لیتے تھے:

من كان مسرورا بمقتل مالكٍ فليأت نسوتنا بوجه نهار

''جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا وہ دن کو ہماری عورتوں کے پاس آئے۔''

يجد النساء حوا سراً يندبنه يلطمن اوجههن بالاسحار ❶

''وہ دیکھے گا کہ عورتیں ننگے سر نوحہ کر رہی ہیں اور صبح کو اپنے چہروں پر دوہتر مار رہی ہیں۔''

ایک خیال یہ تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے اس کی روح زخم کی راہ سے نکلتی ہے، ورنہ ناک کی راہ سے نکلتی ہے اور یہ نہایت عیب سمجھا جاتا تھا، اسی بنا پر بیماری سے مرنے کو ''حتف انف'' کہتے تھے، یعنی ''ناک کی موت'' اور ایسے مرنے کو نہایت عار سمجھتے تھے:

وما مات منا سيد حتف انفه ولا طل مناحيث كان قتيل ❷

''ہمارا کوئی سردار ناک کی راہ سے نہیں مرا اور نہ ہمارے کسی مقتول کا خون ہدر ہوا۔''

رفتہ رفتہ عرب کے تمام قومی مفاخر اور اخلاق و عادات کا اصلی محور جنگ بن گیا۔ یعنی ان کے اوصاف و اخلاق میں جس چیز کا اصلی سبب تلاش کیا جائے یہی چیز نکلتی تھی، یہی چیز تھی جس نے ایک مدت تک قبائل عرب کو اسلام لانے سے باز رکھا۔ حضرت عمرو بن مالک رضی اللہ عنہ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ''بنو عقیل پر ہمارا اثار باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں۔'' چنانچہ اسی وقت بنو عقیل پر جو اسلام لا چکے تھے حملہ آور ہوئے اور خود حضرت عمرو بن مالک رضی اللہ عنہ نے اس میں شرکت کی گو پھر ان کو بہت ندامت ہوئی کہ ان کے ہاتھ سے ایک مسلمان مارا گیا۔ ❸

لوٹ کا مال

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، لڑائیوں کی اصل بنیاد ضرورت معاش سے شروع ہوئی تھی، اس لئے عرب کے نزدیک مال غنیمت سے زیادہ کوئی شے محبوب نہ تھی اور ذرائع معاش میں سب سے زیادہ حلال وطیب اسی کو سمجھتے تھے، یہ خیال اس قدر دلوں میں راسخ اور رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا کہ اسلام کے بعد بھی ایک مدت تک قائم رہا اور جس طرح شارع نے ممنوعات شرعیہ کو بتدریج حرام اور ممنوع کیا تھا غنیمت کے متعلق نہایت تدریج اور آہستگی سے کام لینا پڑا۔

شراب کو جب شارع نے حرام کرنا چاہا تو پہلے یہ آیت اتری:

---

❶ ديوان الحماسة، جزء اول، باب المراثى، ص: ٤١٣ یہ دونوں شعر ربیع بن زیاد کے ہیں۔

❷ ديوان الحماسة، جزء اول، باب الحماسة، ص: ٢٩ یہ شعر سموأل بن عادیا کا ہے۔

❸ اصابه فى تمييز الصحابه، ذكر عمرو بن مالك، ج٣، ص: ١٣، (س)۔

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ ﴾. (۲/ البقرۃ:۲۱۹)

''لوگ تجھ سے شراب اور قمار کی بابت پوچھتے ہیں کہہ دے کہ دونوں میں بڑا گناہ ہے۔''

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

اللھم بین لنافی الخمر بیانا شافیا۔ [1] ''اے اللہ شراب کے متعلق ہم کو صاف احکام بتا۔''

پھر یہ آیت اتری: ﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ (٤/ النسآء:٤٣) ''نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔''

چنانچہ نماز کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ کے حکم سے ایک شخص منادی پکارتا کہ کوئی شخص نشہ میں نماز کو نہ آئے۔

پھر یہ آیت اتری:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ ﴾

(٥/ المآئدۃ:٩٠۔٩١)

''مسلمانو! شراب، جوا، انصاب، فال کے تیر، یہ سب ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو کہ غالباً تم فلاح پاؤ گے، شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ شراب اور قمار کے ذریعہ سے تم لوگوں میں عداوت اور بغض ڈالے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روکے تو تم باز آؤ گے؟'' [2]

باوجود اس کے آنحضرت ﷺ نے شراب کی حرمت کے متعلق اس قدر تاکید وتصریح کی ضرورت خیال کی کہ جس قسم کے برتنوں میں شراب پیتے تھے تڑوا دیے۔ لوگوں نے عرض کی کہ شراب کا سرکہ بنالیں، اس سے بھی منع فرمایا، [3] ان سب باتوں پر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بعض لوگوں نے شرابیں پیں اور جب ان سے بازپرس کی گئی تو انہوں نے نیک نیتی سے کہا کہ نیک اور اچھے آدمیوں کے لئے شراب کہاں حرام ہے؟ قرآن مجید میں خود شراب کی حرمت کے بعد یہ تصریح موجود ہے:

﴿ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا ﴾ (٥/ المآئدۃ:٩٣)

---

[1] ابوداود، کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر: ٣٦٧٠۔ [2] مسند امام احمد بن حنبل، مطبوعہ مصر ج ١ ص: ٥٣ وابو داود، کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر ٣٦٧٠۔ (س)۔ [3] برتنوں کے استعمال کی ممانعت آپ نے قبیلہ عبدالقیس کے وفد کو کی تھی جس کا ذکر صحیح بخاری و مسلم کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔ دیکھو بخاری، کتاب الایمان، باب اداء الخمس من الایمان:٥٣ ومسلم، کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللہ ورسولہ الخ: ١١٥، ١١٦ برتنوں کے توڑنے کا ذکر صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر: ٥١٣٨ پر اور شراب کے سرکہ بنانے کی حرمت بھی مسلم کی اسی کتاب کے باب تحریم تخلیل الخمر (٥١٤٠) میں وارد ہے۔

''جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے انہوں نے جو کچھ کھایا (یعنی شراب پی) ان پر کچھ الزام نہیں۔''

اس موقع پر بہت سے صحابہ موجود تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف دیکھا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ ان صحابہ کی نسبت ہے جو شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے مر گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی اور ان لوگوں کو سزا دی۔ چنانچہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری میں مذکور ہے۔ ❶

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی چیز زمانہ دراز سے رسم و عادت میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے آثار اور مخفی نتائج مدتوں تک قائم رہتے ہیں اور غنیمت کا بھی یہی حال ہے۔

سب سے پہلے جنگ بدر میں قبل اس کے کہ مالِ غنیمت یکجا جمع کیا جاتا لوگ غنیمت میں مصروف ہو گئے۔ اس پر یہ آیت اتری:

﴿ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (۸/ الانفال:٦٨)

''اگر اللہ کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو جو کچھ کیا اس پر تم کو عذاب ہوتا۔''

چنانچہ صحیح ترمذی تفسیر انفال میں یہ واقعہ بہ تصریح مذکور ہے آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا تھا کہ ''جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا اس کا مال و اسباب قاتل کو ملے گا۔'' اس بنا پر لوگوں نے مسلوبہ مال کا دعویٰ کیا، جو صحابہ رضی اللہ عنہم خود لڑے نہ تھے بلکہ علم اور رایت کے محافظ تھے ان کا دعویٰ تھا کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے اس پر یہ آیت اتری:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ﴾ (۸/ الانفال:۱)

''لوگ تجھ سے غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے غنیمت اللہ اور رسول کی ہے۔'' ❷

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مجاہدین مالِ غنیمت کا خود دعویٰ نہیں کر سکتے اس کی تقسیم آنحضرت ﷺ کے اختیار میں ہے جس طرح آپ چاہیں تقسیم فرمائیں۔ اس سے اتنا ہوا کہ لڑائیوں میں ہر شخص خود لوٹ کر جو چیز چاہتا تھا، لیتا تھا، بند ہو گیا لیکن میدان جنگ کے علاوہ اور موقعوں پر لوٹ مار مدتوں موقوف نہیں ہوا۔ سنن ابی داؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے، بھوک کی سخت تکلیف ہوئی، اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں، ان کو لوٹ لائے اور ذبح کر کے ہانڈیاں چڑھا دیں آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ تشریف لائے اور کمان جو ہاتھ میں تھی اس سے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا کہ ''لوٹ کی چیز مردہ سے بڑھ کر حلال نہیں۔'' ❸

---

❶ ازالة الخفاء مقصد دوم، ص:۲۱۳ پر بھی بہ روایت حاکم مذکور ہے۔ ❷ سنن ابی داود، کتاب الجهاد، باب النفل: ۲۷۳۸، ۲۷٤۰۔ ❸ کتاب الجهاد، باب فی النهی عن النهبی: ۲۷۰۵۔

خیبر کی لڑائی ۷ ھ میں ہوئی اس وقت تک یہ حال تھا کہ امن کے بعد لوگوں نے یہودیوں کے جانور اور پھل لوٹ لئے اس پر آنحضرت ﷺ کو نہایت غصہ آیا، آپ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور فرمایا:

((ان اللّٰہ تعالٰی لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب نسائھم ولا اکل ثمارھم اذا اعطوکم الذی علیھم)). [1]

''اللہ نے تم لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں کیا کہ اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ (مگر بہ اجازت) اور نہ یہ کہ ان کی عورتوں کو مارو، نہ یہ کہ ان کے پھل کھا جاؤ، جب کہ وہ تم کو وہ ادا کریں جو ان پر فرض ہے۔''

آنحضرت ﷺ چاہتے تھے کہ غنیمت کے ساتھ لوگوں کا جو شغف ہے کم ہو جائے لیکن مدت تک غنیمت کی محبت اور وارفتگی نہ گئی۔ غزوۂ احد میں صرف اس وجہ سے شکست ہوئی کہ آنحضرت ﷺ نے اگرچہ تیراندازوں کو سخت تاکید فرمادی تھی کہ گولڑائی کی کچھ حالت ہو تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔ تاہم جو فتح ہوئی تو لوگ بے اختیار لوٹ میں مصروف ہو گئے، ان کا ہٹنا تھا کہ دشمن نے موقع پا کر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا حنین میں بھی شکست کی اصلی وجہ یہی تھی کہ قبل از وقت لوگوں نے غنیمت لوٹنی شروع کر دی تھی۔

''غنیمت'' اس قدر محبوب تھی کہ بعض صاحبوں کو کسی کافر کے مسلمان ہونے پر اس بنا پر رنج ہوا کہ اسلام لانے کی وجہ سے اس کا مال نہ مل سکا۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے ایک سریہ میں حملہ کرنا چاہا، قبیلہ والے روتے ہوئے آئے، انہوں نے کہا لا الہ الا اللہ کہو تو تمہاری جان اور مال بچ جائے گا، انہوں نے لا الہ الا اللہ کہا اور ان کو امن دے دیا گیا۔ جب یہ اپنے ساتھیوں میں آئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ

احرمتنا الغنیمۃ [2] ''تم نے ہم کو غنیمت سے محروم کر دیا۔''

آنحضرت ﷺ کے پاس جب یہ لوگ گئے تو آپ ﷺ نے ان صحابی کی تحسین کی اور فرمایا: ''تم کو ایک ایک آدمی کے بدلے (جس کو تم نے چھوڑ دیا) اس، اس قدر ثواب ملے گا۔''

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ مدت تک لوگ یہ سمجھے کہ غنیمت حاصل کرنا ثواب کا کام ہے۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد پر جانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کچھ مال ہاتھ آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔'' یہ جواب انہوں نے آ کر لوگوں سے بیان کیا تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور ان سے کہا کہ تم نے آنحضرت ﷺ کا مطلب نہیں سمجھا پھر جا کر پوچھو۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا اور وہی جواب ملا، لوگوں نے پھر ان کو بھیجا اور پھر

[1] سنن ابی داود، کتاب الخراج، باب فی تعشیر اهل الذمة اذا اختلفوا بالتجارة: ۳۰۵۰۔

[2] ابو داود، کتاب الادب، باب ما یقول اذا اصبح: ۵۰۸۰۔

آنحضرت ﷺ نے یہی فرمایا کہ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ [1]

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

جنگ میں وحشیانہ افعال

عرب میں لڑائیوں کی شدت اور وسعت نے نہایت وحشیانہ رسمیں قائم کر دی تھیں جن میں سے چند کی تفصیل یہ ہے:

① اسیران جنگ کو جب قتل کرتے تھے تو چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کرتے تھے بلکہ آگ میں جلا دیتے تھے۔

② غفلت یا نیند کی حالت میں دفعتہً دشمن پر جا پڑتے تھے اور قتل و غارت گری شروع کر دیتے تھے، یہ طریقہ عام اور کثرت سے رائج تھا۔ بہت سے بہادر اس خاص طریقہ میں زیادہ ممتاز تھے۔ اور ان کو فاتک یا فتاک کہتے تھے، تابط شرا، سلیک، ابن السلکہ اسی قسم کے لوگ تھے۔

③ زندوں کو آگ میں جلا دیتے تھے۔ عمرو بن ہند (عرب کا ایک بادشاہ تھا) کے بھائی کو جب بنوتمیم نے قتل کر دیا تو اس نے منت مانی کہ ایک کے بدلے سو آدمیوں کو قتل کروں گا۔ چنانچہ بنوتمیم پر حملہ کیا، وہ لوگ بھاگ گئے، صرف ایک بڑھیا رہ گئی تھی جس کا نام حمرا تھا، اس کو گرفتار کر کے زندہ آگ میں ڈال دیا، اتفاق یہ کہ ایک سوار جس کا نام عمار تھا آ نکلا، عمرو نے پوچھا: تو کیوں آیا؟، اس نے کہا: میں کئی دن کا بھوکا تھا، دھواں اٹھتے دیکھا تو سمجھا کھانا ہوگا، عمرو نے حکم دیا کہ وہ بھی آگ میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ جریر نے اپنے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے: [2]

واخزاکم عمرو کما قد خزیتهم   وادرك عمار اشقى البراجم

④ بچوں کو نشانہ بنا کر تیروں سے مارتے تھے، داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنوذبیان کے پاس اپنے بچے ضمانت کے طور پر رکھے تھے، حذیفہ نے جو بنوذبیان کا رئیس تھا۔ ان بچوں کو لیجا کر ایک وادی میں کھڑا کیا اور ان کو نشانہ بنا کر قدر اندازی کرتا تھا، اتفاق سے کوئی لڑکا نہ مرا تو دوسرے دن پر اٹھا رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن یہ تفریح انگیز چاند ماری پھر شروع ہوتی تھی [3] اور لوگ یہ تماشہ دیکھتے تھے۔

⑤ قتل کا ایک یہ طریقہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔ غطفان اور عامر کی لڑائی میں اسی خوف سے حکم بن الطفیل نے اپنے آپ کو خود گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ جیسا کہ عقد الفرید میں بہ تفصیل مذکور ہے۔ [4]

عرینہ کے لوگ جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بظاہر اسلام لا کر آنحضرت ﷺ کے غلام کو پکڑ

[1] ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا: ۲۵۱۶۔ [2] مجمع الامثال کرمانی، مطبوعہ آقائے میر محمد باقر طہرانی، ایران: ۱۲۹۰ھ، ص: ۲۴۳۔ [3] مجمع الامثال، ص: ٤٧٧۔ [4] ج ۳، ص: ۵۲، ۵۳۔

لے گئے تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے، پھر ان کی آنکھوں اور زبان میں کانٹے چبھوئے یہاں تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ ❶

⑥ مرنے کے بعد بھی انتقام کا جوش طرح طرح کی نفرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا، مردوں کے ہاتھ، پاؤں، کان اور ناک وغیرہ کاٹ لیتے تھے، ہند نے جنگ احد میں اسی رسم کے موافق حضرت حمزہ اور دیگر شہداء رضی اللہ عنہم کے اعضاء کاٹ کر ہار بنایا اور گلے میں پہنا تھا۔ ❷

⑦ منت مانتے تھے کہ دشمن پر قابو ہاتھ آئے گا تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔ سلافہ کے دو بیٹے جنگ احد میں عاصم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، اس بنا پر سلافہ نے منت مانی کہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پیئے گی۔ ❸ یہ بھی معمول تھا کہ مقتول کا کلیجہ نکال کر کھا جاتے تھے، ہند نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ جو نکال کر چبالیا تھا، اس کا حال اوپر گزر چکا ہے۔

⑧ حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر ڈالتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ عامر بن طفیل عرب کا مشہور بہادر اور رئیس ہوازن کہتا ہے:

بقرنا الحبالی من شنوءۃ بعد ما   خبطن بفیف الریح نهدا و خثعما ❹

غزوات نبوی ﷺ کے اسباب اور انواع ❺

تفصیل مذکورہ بالا کے بعد اب ہم اس واقعہ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ غزوات نبوی کن اسباب سے وجود میں آئے اور شارع علیہ السلام نے طریقہ قدیم میں کیا اصلاحیں فرمائیں۔ مؤرخین نے ''غزوہ'' کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ امن وامان قائم رکھنے کے لئے دو چار آدمی بھی کہیں بھیج دیے گئے تو اس کو بھی انہوں نے غزوہ میں شمار کر لیا۔ غزوہ کے علاوہ ایک اور لفظ ہے یعنی ''سریہ'' غزوہ اور سریہ میں لوگوں کے نزدیک یہ فرق ہے کہ غزوہ میں کم سے کم آدمیوں کی ایک خاص تعداد ضروری ہے، سریہ میں کوئی قید نہیں۔ ایک آدمی بھی کہیں لڑائی کی دیکھ بھال کو بھیج دیا گیا تو یہ بھی سریہ ہے، بعضوں کے نزدیک غزوہ کے لئے یہ شرط ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بہ نفس نفیس اس میں شرکت کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جن واقعات کو مؤرخین سریہ کہتے ہیں وہ چند قسموں پر منقسم ہے:

① محکمہ تفتیش یعنی دشمنوں کی نقل وحرکت کی خبر رسانی۔

❶ یہ واقعہ تمام کتب حدیث میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول ص ۶۷ سے ماخوذ ہے۔ مسلم، کتاب القسامۃ والمحاربین، باب حکم المحاربین والمرتدین: ۴۳۵۳، ۴۳۵۴؛ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قصۃ عکل وعرینۃ: ۴۱۹۲۔ ❷ زرقانی، ج ۲، ص: ۵۴۔

❸ طبقات ابن سعد، ج ۲، قسم اول، ص: ۳۹ (سریۃ مرثد بن ابی مرثد) (س)

❹ کتاب دیوان عبید وعامر ذکر عامر بن طفیل، ص: ۱۲۱ مطبع بریل لیڈن: ۱۹۱۳ء

❺ یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ بحث تمام تر تاریخی حیثیت سے ہے، جہاد کی اصل حقیقت پر بحث کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گی۔

② دشمنوں کے حملہ کی خبر سن کر مدافعت کے لئے پیش قدمی کرنا۔

③ قریش کی تجارت کی روک ٹوک، تاکہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو حج وعمرہ کی اجازت دیں۔

④ امن وامان قائم کرنے کے لئے تعزیری فوجیں بھیجنا۔

⑤ اشاعتِ اسلام کے لئے لوگ بھیجے گئے اور حفاظت کے خیال سے کچھ فوج ساتھ کر دی گئی اس صورت میں تاکید کر دی جاتی تھی کہ تلوار سے کام نہ لیا جائے۔

غزوہ کی صرف دو صورتیں تھیں:

1 دشمنوں نے دارالاسلام پر حملہ کیا اور ان کا مقابلہ کیا گیا۔

2 یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں اور پیش قدمی کی گئی۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو لڑائیاں واقع ہوئیں یا اس قسم کے جو واقعات پیش آئے انہی مختلف اغراض سے تھے۔

آنحضرت ﷺ جب مکہ سے چلے آئے تو قریش نے فیصلہ کر لیا کہ اسلام کو مٹا دیا جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اسلامی تحریک قائم رہی تو ایک طرف ان کے مذہب کو صدمہ پہنچے گا دوسری طرف تمام عرب میں ان کا جو تفوق اور اثر اور مرجعیت عام ہے سب جاتا رہے گا۔ اس بنا پر ایک طرف تو قریش نے خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، دوسری طرف تمام قبائل عرب کو بھڑکایا کہ یہ نیا گروہ اگر کامیاب ہو گیا تو تمہاری آزادی بلکہ ہستی بھی فنا ہو جائے گی۔

بیعتِ عقبہ میں جب انصار آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ایک انصاری نے کہا ''برادران من! جانتے ہو کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب وعجم سے اعلان جنگ ہے۔'' اوپر ہم مسند دارمی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو تمام عرب مدینہ پر حملہ کے لئے تیار ہو گیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینہ میں مہاجرین اور انصار رات کو سوتے تو ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے (بحوالہ ابوداؤد) کہ قریش نے عبداللہ بن ابی کو پیغام بھیجا تھا کہ ''محمد (ﷺ) کو وہاں سے نکال دو ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمد (ﷺ) دونوں کا فیصلہ کر دیں گے۔'' [1]

محکمہ تفتیش

ان واقعات کی بنا پر ضروری تھا کہ اسلام اور دارالاسلام کی حفاظت کے لئے ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں، اس سلسلہ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ خبر رسانی اور جاسوسی کا انتظام وسیع پیمانہ پر کیا جائے چنانچہ ابتدا ہی سے آنحضرت ﷺ نے اس انتظام پر توجہ کی، وقتاً فوقتاً کثرت سے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے یہ ٹکڑیاں گو محض خبر رسانی کے لئے جاتی تھیں، لیکن حفاظت کی غرض سے مسلح اور

[1] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في خبر النضير: ٣٠٠٤۔

جمعیت کی صورت میں جاتی تھیں۔

یہی واقعات ہیں جن کو مؤرخین ''سرایا'' سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس کا مقصد کسی قافلہ کا لوٹنا یا کسی جماعت پر بے خبری کی حالت میں جاپڑنا ہوتا تھا۔ ایک بڑا قرینہ اس بات کا یہ کہ ان دستوں کے بھیجنے سے حملہ کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا یہ ہے کہ دستے اکثر دس دس بارہ بارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے سے آدمی لڑنے کے لئے نہیں بھیجے جاسکتے تھے، مثلاً:

سریہ ابن جحش

۲ھ میں آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ مکہ کی طرف بھیجا اور ایک سربہ مہر تحریر دی کہ دو دن کے بعد اس خط کو کھولنا دو دن کے بعد انہوں نے کھولا تو اس میں یہ الفاظ تھے:

فَسِر حتّٰی تنزل نخلة بين مكة والطائف فترصد بها قريشا وتعلم من اخبارهم۔ [1]

''برابر چلے جاؤ یہاں تک کہ نخلہ میں جا کر ٹھہرو جو مکہ اور طائف کے بیچ میں ہے اور قریش کی دیکھ بھال کرتے رہو اور ان کی خبریں دریافت کرو۔''

مدافعت

اس انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کوئی مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تو فوراً خبر ہو جاتی اور پیش دستی کر کے فوجیں بھیج دی جاتیں۔ اکثر سرایا اسی قسم کے تھے اور چونکہ ہم سرایا کا ذکر زیادہ تر قلم انداز کر آئے ہیں، اس لئے مثال کے طور پر چند سرایا کا ذکر کرتے ہیں اور قدمائے اہل سیر کی تصریحات سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہمات مدافعت کی غرض سے تھیں:

سریہ غطفان ۲ھ

وذلك انه بلغ رسول الله ﷺ ان جمعا من بنی ثعلبة ومحارب بذی امرقد تجمعوا يريدون ان يصيبوا من اطراف رسول الله ﷺ جمعهم رجل منهم يقال له دعثور بن الحارث۔ الخ [2]

''اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ قبیلہ بنو ثعلبہ اور محارب کی ایک فوج ذوامر میں اس غرض سے جمع ہوئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف حملہ کرے، اس فوج کو ایک شخص نے فراہم کیا جس کا نام دعثور ہے۔''

سریہ ابو سلمہ، ۳ھ

وذلك انهٗ بلغ رسول الله ﷺ ان طليحة وسلمة ابنى خويلد قد سارا فى

---

[1] طبری، ج۳، ص:۱۲۷۴۔ [2] طبقات، ابن سعد، جزء ثانی قسم اول، جلد مغازی: ۲۳۔

قومها ومن اطاعهما يدعو نهم الى حرب رسول الله......الخ ❶

''اس سریہ کی یہ وجہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ طلحہ اور سلمہ (پسران خویلد) دونوں اپنی قوم اور اپنے پیروں کو لے کر آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔''

سریہ عبداللہ بن انیس بغرض قتل سفیان بن خالد ۳ھ

وذلك انه بلغ رسول الله ﷺ ان سفيان بن خالد الهذلي ثم اللحياني وكان ينزل عرنة وما والاها في ناس من قومه وغيرهم قد جمع الجموع لرسول الله ﷺ۔ ❷

''ابن انیس اس لئے بھیجے گئے تھے کہ آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ سفیان بن خالد اپنے قبیلہ کو اور باہر کے لوگوں کو آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے جمع کر رہا ہے۔''

غزوۂ ذات الرقاع ۵ھ

فاخبر اصحاب رسول الله ﷺ ان انمارا و ثعلبة قد جمعوا لهم الجموع۔ --- فمضى۔ ❸

''ایک جاسوس نے آ کر صحابہ ﷺ کو اطلاع کی کہ انمار اور ثعلبہ وغیرہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے فوجیں جمع کر رہے ہیں آپ چل کھڑے ہوئے۔''

غزوۂ دومۃ الجندل ۵ھ

قالوا بلغ رسول الله ﷺ ان بدومة الجندل جمعًا كثيرًا و انهم يريدون ان يدنوا من المدينة۔ ❹

''رواۃ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں ایک گروہ کثیر جمع ہے اور مدینہ پر بڑھنا چاہتا ہے۔''

غزوۂ مریسیع ۵ھ

انّ بني المصطلق من خزاعة وهم من حلفاء بني مدلج وكان رأسهم وسيدهم الحارث بن ابي ضرار فسار في قومه ومن قدر عليه من العرب فدعاهم الى حرب رسول الله ﷺ فاجابوه۔ ❺

---

❶ ابن سعد، جزء ثانی، قسم اول، جلد مغازی: ۲۳۔ ❷ ایضًا، ص:۳۶۔
❸ ابن سعد، جلد مغازی، ص:۴۳۔ ❹ ابن سعد، جلد مغازی، ص:۴۴۔
❺ ابن سعد، جزء ثانی، قسم اول، ذکر مغازی، ص:۴۵۔

’’قبیلہ بنو مصطلق خزاعہ کی شاخ ہے اور یہ لوگ بنو مدلج کے حلیف ہیں اور ان کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا، وہ اپنی قوم کو نیز اور لوگوں کو جو اس کے قابو میں تھے لیکر چلا اور لوگوں کو رسول اللہ ﷺ سے لڑنے کی دعوت دی اور لوگوں نے منظور کی۔‘‘

سریہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، بطرف فدک، ۶ھ؁

بلغ رسول اللہ ﷺ ان لھم جمعا یریدون ان یمدوا یھود خیبر۔

’’آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا کہ بنو سعد فدک میں یہود خیبر کی کمک کے لئے فوج جمع کر رہے ہیں۔‘‘ ❶

سریہ بشیر بن سعد، شوال ۷ھ؁

بلغ رسول اللہ ﷺ ان جمعا من غطفان بالجناب قد واعد ھم عیینۃ بن حصن لیکون معھم لیزحفوا الی رسول اللہ ﷺ۔ ❷

’’آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ غطفان کا ایک گروہ مقام جناب میں جمع ہے اور ان سے عیینہ بن حصن نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر رسول اللہ ﷺ پر حملہ آور ہوگا۔‘‘

سریہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ذات سلاسل ۸ھ؁

یہ مقام مدینہ سے ۸ منزل ہے۔

بلغ رسول اللہ ﷺ ان جمعا من قضاعۃ قد تجمعوا یریدون ان یدنوا من اطراف رسول اللہ ﷺ۔ ❸

’’آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ قضاعہ کا ایک گروہ جمع ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف بڑھے۔‘‘

قریش کی تجارت کی روک ٹوک

بخاری کے حوالہ سے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ (قریش اور مسلمانوں میں جنگ چھڑنے سے پہلے) ابوجہل نے حضرت معاذ انصاری رضی اللہ عنہ سے کعبہ میں یہ کہا تھا کہ ’’اگر تم لوگ محمد (ﷺ) کو نکال نہ دو گے تو تم کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے۔‘‘ انہوں نے جواب دیا تھا کہ ’’تم نے اگر ہم کو کعبہ میں آنے سے روکا تو ہم تمہاری شام کی تجارت روک دیں گے۔‘‘ ❹ (مکہ سے شام کو جو قافلہ جاتا تھا مدینہ اس کی راہ میں پڑتا تھا) کعبہ

---

❶ ابن سعد، جزء ثانی، قسم اول ذکر مغازی، ص: ۶۵۔

❷ ایضاً، ص: ۸۷۔ ❸ ایضاً، ص: ۹۵۔

❹ بخاری، کتاب المغازی، باب ذکر النبی ﷺ من یقتل ببدر: ۳۹۵۰۔

مسلمانوں کی خاص چیز تھی کیونکہ جس نے تعمیر کیا تھا مسلمان اسی کے دین (ابراہیمی) کے پیرو تھے باوجود اس کے قریش نے مسلمانوں کو عموماً حج اور عمرہ سے روک دیا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا کاروانِ تجارت روک دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دے دیں۔

بعض سرایا قبل حدیبیہ

سرایا کے ذکر میں اکثر جگہ اہل سیر لکھتے ہیں کہ'' یتعرض لعیر قریش ''یعنی'' اس لئے فوجیں بھیجی گئیں یا خود آنحضرت ﷺ تشریف لے گئے کہ کاروانِ قریش کی روک ٹوک کی جائے۔'' یہ تمام مہمات اسی غرض کے لئے تھیں چونکہ قریش تجارت کے لئے بھی ہتھیار بند ہو کر نکلتے تھے اور کم از کم سو دو سو کی جمعیت ساتھ لے کر جاتے تھے، اس لئے روک ٹوک میں کبھی کبھی مقابلہ پیش آ جاتا تھا اور جب قریش شکست کھا کر بھاگ جاتے تھے تو مال تجارت غنیمت میں ہاتھ آتا تھا۔ اہل سیر غلطی سے ان واقعات کو اس پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا ہی اصلی مقصد تھا۔

یہی روک ٹوک جس کی بنا پر قریش نے بالآخر حدیبیہ کی صلح کر لی جس کی رو سے مسلمانوں کو چند خاص پابندیوں کے ساتھ حج کی اجازت مل گئی، قریش پر کاروان تجارت کی روک ٹوک کا اس قدر اثر پڑتا تھا کہ (حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے مکہ میں جب اپنے اسلام کا اعلان کیا اور قریش نے اس جرم میں ان کو مارنا پیٹنا شروع کیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غفار کا قبیلہ تمہارے کاروانِ تجارت کے سرِ راہ واقع ہے، تمہاری اس حرکت سے برہم ہو کر وہ راستہ نہ روک دے، تو یہ تدبیر پوری کارگر ہوئی اور انہوں نے ڈر کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا) صلح حدیبیہ کے بعد قریش کی خواہش کے مطابق جب یہ طے ہوا کہ آنحضرت ﷺ مکہ کے نومسلموں کو واپس دیدیں گے اور ان نومسلموں نے مکہ سے بھاگ کر شام کی راہ میں اپنا ایک مستقر قائم کر لیا (اور قریش کی تجارت کی راہ کو غیر مامون کر دیا) تو قریش نے بالآخر اجازت دے دی کہ جو مسلمان چاہے مکہ سے مدینہ چلا جائے، ان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی (پھر آیندہ سال انہوں نے مسلمانوں کو حج وعمرہ کی بھی اجازت دیدی، اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں نے قریش کے کاروانِ تجارت سے تعرض نہیں کیا، بلکہ خود اس کی حفاظت کے لئے فوج بھیجتے تھے۔) [1]

امن وامان قائم کرنا

اوپر گزر چکا ہے کہ عرب میں اس سرے سے اس سرے تک مطلق امن وامان نہ تھا، تمام قبائل باہم لڑتے رہتے تھے، یہاں تک کہ محترم مہینوں میں بھی بہانے نکال کر مہینوں کے نام بدل دیتے تھے اور لڑتے تھے، تجارت بالکل غیر محفوظ تھی، قافلوں کا لوٹ لینا عام بات تھی۔ جیسا کہ بدقسمتی سے آج بھی بدو قافلوں کو

[1] فتح الباری، ج۸، ص:٦١۔

لوٹتے رہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے اس لئے بھیجا تھا کہ نہ صرف وعظ و پند بلکہ دست و بازو سے بھی تمام عرب بلکہ تمام دنیا میں امن و امان قائم کریں، کیونکہ خونریزی اور قتل سے زیادہ کوئی چیز اللہ کو ناپسند نہیں۔

﴿ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ﴾ (٥/ المآئدۃ:٣٢)

''اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک جان کو بغیر معاوضہ (یا زمین میں فساد) کے قتل کر دیا، اس نے تمام عالم کو قتل کر دیا۔''

﴿ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝﴾ (٢/ البقرۃ:٢٠٥)

''اور جب وہ پھر کر جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''

﴿ اِنَّمَا جَزٰۗؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُـقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ﴾ (٥/ المآئدۃ:٣٣)

''جو لوگ اللہ اور رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا پھانسی دیے جائیں یا ان کا ایک ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے یا جلاوطن کر دیے جائیں۔''

احادیث میں ہے کہ جب عدی رضی اللہ عنہ (حاتم طائی کے بیٹے) اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ ''اللہ اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک شتر سوار صنعاء سے لیکر حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو اللہ کے سوا یا بھیڑیے کے سوا (کہ اس کی بکریاں نہ اٹھا لے جائے) اور کسی کا ڈر نہ ہوگا۔'' یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں، [1] صحیح بخاری میں ہے کہ ''اللہ اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور آ کر کعبہ کی زیارت کرے گی اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔'' حضرت عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کر کے حرم تک آتی ہے اور اس کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ [2]

---

[1] كتاب الجهاد، باب في الاسير يكره على الكفر: ٢٦٤٩۔

[2] كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الاسلام: ٣٥٩٥ (صحیح بخاری، میں یہ حدیث کئی طرح سے آئی ہے حضرت خباب بن ارت سے جو روایت ہے اس میں بعینہ وہی الفاظ ہیں جو ابوداود (ج ا ص:٥١٠) کے ہیں اور عدی بن حاتم کی روایت میں وہ الفاظ ہیں جو آگے مصنف نے نقل کیے ہیں لیکن اس میں مزید تفصیل بھی ہے یعنی خزائن کسریٰ کی فتح وغیرہ کا ذکر ہے۔

بہت سے واقعات ہیں جن کو اہل سیر سرایا میں شمار کرتے ہیں وہ محض تجارت کی آزادی اور عام امن و امان قائم کرنے کی غرض سے تھے۔ دو تین مثالیں ہم درج کرتے ہیں:

سریہ زید بن حارثہ

۶ھ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ مال تجارت لے کر شام گئے۔ واپس آتے ہوئے جب وادی قریٰ کے قریب پہنچے تو بنوفزارہ کے لوگوں نے آ کر ان کو مارا پیٹا اور تمام مال و اسباب چھین لے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے تدارک کے لئے تھوڑی سی فوج بھیجی جس نے ان لوگوں کو سزا دی۔ [1]

اسی سال میں اس سے پہلے حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ جن کو آنحضرت ﷺ نے خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا تھا، شام سے واپس آ رہے تھے جب حِسمیٰ پہنچے تو ہُنَید نے چند آدمیوں کے ساتھ ان پر ڈاکہ ڈالا اور جو کچھ ان کے پاس تھا سب چھین لیا صرف بدن کے کپڑے (وہ بھی جو پرانے اور پھٹے تھے) چھوڑ دیے آنحضرت ﷺ نے اس کے تدارک کے لئے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ [2]

سریہ دومۃ الجندل

۴ھ میں آنحضرت ﷺ کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں جو مدینہ منورہ سے شام کی جانب پندرہ منزل پر ہے ایک بڑا گروہ جمع ہو گیا ہے جو تاجروں کو ستاتا ہے۔ اس کے تدارک کے لئے آپ خود تشریف لے گئے مجمع منتشر ہو چکا تھا لیکن آپ ﷺ نے چند روز تک وہاں قیام کیا اور انتظام کے لئے تمام اطراف میں فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بھیج دیں۔ [3]

(یہ حالت کچھ مسلمان تاجروں کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد کفار قریش کے کاروان تجارت کی بھی اسی طرح حفاظت کی جاتی تھی۔)

سریہ خبط یا سیف البحر

(۸ھ میں قریش کا کاروان تجارت شام سے واپس آ رہا تھا، قبیلہ جہینہ کی طرف سے اطمینان نہ تھا، آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی سرداری میں تین سو مسلمانوں کی جمعیت جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی داخل تھے، مدینہ سے ۵ دن کی مسافت پر روانہ فرمایا۔ مسلمانوں نے اس فرض کو اس طرح انجام دیا کہ کھانے کو کچھ نہ رہا تو ایک ایک چھوہارے پر تمام دن بھر گزارا دیا۔ [4]

صحیح مسلم [5] میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے لیکن اس سریہ کی غرض مختلف راویوں نے مختلف بیان کی ہے،

---

[1] طبقات ابن سعد، جزء ثانی، قسم اول، ص: ٦٥، جلد غزوات۔ [2] ابن سعد، جلد غزوات، ص: ٦٣۔
[3] ابن سعد، ص: ٤٤ جلد غزوات۔ [4] ابن سعد، جزء مغازی سریہ خبط، ص: ٩٥۔
[5] صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب اباحۃ میتۃ البحر: ٥٠٠٢؛ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ سیف البحر: ٤٣٦٠ تا ٤٣٦٢ میں بھی یہ روایتیں ہیں۔

اصل راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہیں جو اس واقعہ میں شریک تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ جہینہ سے لڑنے کو یہ مہم بھیجی گئی تھی کتب مغازی میں بھی یہی مذکور ہے، دوسری روایتوں کے الفاظ یہ ہیں:

(۱) نتلقی عیر قریش ''قافلۂ قریش سے ملنے کے لئے۔''

(۲) نرصد عیر قریش ''قافلۂ قریش کی دیکھ بھال کے لئے۔''

اس سے مقصود عام طور سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ قافلۂ قریش کے لوٹنے کے لئے، لیکن یہ صریح غلطی ہے کیونکہ یہ زمانہ تو صلح حدیبیہ کا تھا، اس بنا پر ان الفاظ کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ مہم قافلۂ قریش کی حفاظت اور جہینہ کو روکنے کے لئے بھیجی گئی تھی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی تحقیق ہے۔ [1]

غزوۂ غابہ

عرب کی جسارت اور رہزنی کی عادت کا یہ حال تھا کہ اگرچہ ہر دفعہ ان کو سخت سے سخت سزائیں ملتی تھیں تاہم وہ کسی طرح جرائم سے باز نہیں آتے تھے۔ یہاں تک کہ غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا، ڈاکے ڈالتے تھے۔ ۵ھ میں قبیلہ فزارہ کی آبادی میں قحط پڑا، عیینہ بن حصن جو یہاں کا رئیس تھا، آنحضرت ﷺ نے فرط کرم سے اس کو اجازت دی کہ اسلامی حدود میں جو سیراب تھے مویشی چرائے، لیکن ۶ھ میں اسی عیینہ نے غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا حملہ کیا اور آنحضرت ﷺ کی بیس اونٹنیاں لوٹ لیں، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے بیٹے جو چراگاہ کے محافظ تھے ان کو قتل کر دیا، [2] چنانچہ ارباب سیر اس واقعہ کو غزوۂ غابہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

عرب کا تمام ملک جو اسلام کا دشمن ہو گیا اور اخیر فتح مکہ تک کفار سے جو لڑائیاں جاری رہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ عرب کی معاش کا بڑا ذریعہ رہزنی، قطاع الطریقی اور قتل و تاراج تھا اسلام ان چیزوں کو مٹاتا تھا، اس لئے عرب اسلام سے بڑھ کر کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھ سکتے تھے۔

بے خبری میں حملہ کرنے کا سبب

عرب کے قبائل دو قسم کے تھے ایک وہ جو کسی خاص مقام پر مستقل سکونت رکھتے تھے، دوسرے وہ جو خیمہ نشین اور بادیہ گرد تھے، ان کا کوئی خاص مستقر نہ تھا، جہاں چشمہ یا سبزہ زار دیکھا خیمے ڈال دیے۔ جب وہاں بھی پانی نہ رہا تو خبر رساں کسی اور مقام کی خبر لائے اور وہاں چل دیے ان قبائل کو عربی میں اصحاب الوبر کہتے ہیں۔ زیادہ تر جو قبائل ڈاکے ڈالا کرتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اسی قسم کے قبائل تھے، ان کا انتظام اور ان کی روک ٹوک سخت مشکل تھی ان کی تعزیر کے لئے فوجیں جاتی تھیں تو یہ پہاڑوں پر بھاگ جاتے تھے اور قابو میں نہیں آتے تھے، اس لئے مجبوراً جو فوجیں ان پر بھیجی جاتی تھیں، غفلت میں بھیجی جاتی تھیں کہ وہ بھاگ نہ جانے پائیں۔

اکثر سرایا کے بیان میں اہل سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کچھ فوجیں بھیجیں جو راتوں کو چلتی

---

[1] فتح الباری، ج۸، ص: ٦١، ٦٢۔ [2] طبقات ابن سعد، ذکر مغازی، ص:٥٨۔

تھیں اور بے خبری کی حالت میں موقع پر پہنچ کر حملہ کرتی تھیں اور قبائل کو لوٹ لیتی تھیں۔ اس قسم کے واقعات تمام کتابوں میں کثرت سے منقول ہیں اور انہی واقعات سے یورپ کے لوگوں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ اسلام نے دشمن پر ڈاکہ ڈالنا اور لوٹ مار کرنا جائز رکھا ہے، اسی بنا پر مارگولیتھ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ''چونکہ بہت دنوں تک مسلمانوں کے پاس معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ قبائل پر بے خبری میں حملہ کر کے مال واسباب لوٹ لایا کرتے تھے۔''

لیکن جب زیادہ تفحص اور استقرا اور کد وکاوش سے تمام واقعات بہم پہنچائے جائیں تو ثابت ہوگا کہ اچانک حملہ انہی قوموں پر کیا جاتا تھا جن کی نسبت یہ احتمال ہوتا تھا کہ ان کو خبر ہوگی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا کسی اور مقام پر بھاگ جائیں گے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ان لوگوں کو خبر ہوئی اور وہ کسی طرف چل دیے۔ اس قسم کے چند واقعات ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں ان میں سے بعض میں آپ خود تشریف لے گئے اور بعض میں کچھ دستے بھیج دیے۔

غزوۂ بنو سلیم ۳ھ

واغذ السير ...... فوجد هم قد تفرقوا في ميا ههم فرجع. [1]

''اور بہت تیزی سے بگ ٹُٹ گئے لیکن وہ لوگ اپنے چشموں کی طرف چل دیئے تھے۔'' (اس لئے لوٹ آئے)

غزوۂ ذات الرقاع ۴ھ

وهربت الاعراب الى رؤس الجبال. [2]

''اور اعراب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔''

سریہ عکاشہ، ۶ھ

وجه رسول الله ﷺ عكاشة بن محصن الى الغمر في اربعين رجلا فخرج سريعا يغذالسير فهربوا. [3]

''آنحضرت ﷺ نے عکاشہ بن محصن کو ۴۰ آدمیوں کے ساتھ بھیجا، وہ بگ ٹُٹ گئے لیکن وہ لوگ بھاگ گئے۔''

سریہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، الی بنی سعد ۶ھ

فبعث اليهم على بن ابى طالب فى مائة رجل فسار الليل وكمن النهار حتى انتهى الى الهمج فاغاروا عليهم فاخذوا خمس ما ئة بعير والفى شاة

---

[1] ابن سعد، مغازی، ص: ۲۴۔ [2] ایضا، ص:۴۳۔ [3] ایضا، ص: ۶۱۔

وھربت بنو سعد بالظعن۔ ❶

''آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سو آدمیوں کے ساتھ بھیجا، وہ راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ رہتے تھے یہاں تک کہ مقام ہج پہنچ گئے، پھر ان لوگوں پر حملہ کیا اور پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں لوٹیں اور بنوسعد مستورات کو لے کر بھاگ گئے۔''

غزوۂ بنولحیان، ٦ھ

فسمعت بھم بنو لحیان فھربوا فی رؤوس الجبال۔ ❷

''بنولحیان نے ان کی آمد کی خبر سنی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔''

سریہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بطرف تربہ ٧ھ

فکان یسیر اللیل و یکمن النھار فاتی الخبر ھوازن فھربوا وجاء عمر بن الخطاب محالھم فلم یلق منھم احدًا۔ ❸

''راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے، ہوازن کو خبر لگ گئی تو وہ فرار ہو گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پڑاؤ پر پہنچے تو کسی کو نہ پایا۔''

سریہ کعب بن عمیر، ربیع الاول ٨ھ

اس سریہ کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پندرہ اشخاص کو شام کی طرف بھیجا، ذات اطلاح پہنچ کر ان لوگوں کو ایک بڑی جماعت نظر آئی، ان لوگوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے انکار کر دیا اور ان پر تیراندازی شروع کی، مجبور ہو کر یہ لوگ بھی لڑے اور بالآخر سب شہید ہوئے۔ صرف ایک صاحب بچے، انہوں نے آ کر خبر دی۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے انتقام لینا چاہا لیکن وہ لوگ یہ مقام چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ ابن سعد میں یہ الفاظ ہیں:

وھَمَّ بالبعث الیھم فبلغہ انھم قد ساروا الی موضع آخر۔ ❹

''ان پر فوج بھیجنے کا ارادہ کیا، پھر معلوم ہوا کہ وہ اور کہیں چلے گئے۔''

اشاعت اسلام

(ان اغراض کے علاوہ جو سرایا بھیجے گئے، ان کی غرض اشاعت اسلام ہوتی تھی، لیکن چونکہ ملک میں امن وامان نہ تھا اور نیز دشمنوں نے اس سرے سے اس سرے تک آگ لگا رکھی تھی لیکن دعوت اسلام کے لئے جو سرایا جاتے تھے ان کی زندگی ہمیشہ معرض خطر میں رہتی تھی۔

❶ ایضًا، ص:٦٥۔ ❷ ایضًا، ص:٧٥۔

❸ ایضًا، ص:٨٥۔ ❹ ایضًا، ص:٩٢۔

سریہ بیر معونہ

صفر ۴ھ میں ستر (۷۰) داعیانِ اسلام کی جماعت قبیلۂ کلاب میں رئیس قبیلہ کی دعوت پر اشاعت اسلام کی غرض سے بھیجی گئی لیکن بیر معونہ کے قریب قبائل رعل و ذکوان کے ہاتھ سے کل کی کل شہید ہوئی۔ صرف ایک صاحب بچ گئے تھے جنہوں نے مدینہ میں آ کر خبر کی۔ ❶

سریہ مرثد

اسی زمانہ میں یعنی صفر ۴ھ میں قبیلۂ عضل وقارہ نے تعلیم وارشاد کے لئے دعاۃ اسلام کے بھیجنے کی درخواست کی۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عاصم، حضرت خبیب، حضرت مرثد بن ابی مرثد رضی اللہ عنہم وغیرہ دس صاحبوں کو اس غرض کے لئے روانہ فرمایا، مقام رجیع میں پہنچ کر بنولحیان نے ان پر حملہ کیا اور ایک کے سوا کل صاحب شہید کر دیے گئے۔ ❷

غزوہ بنی لحیان

۶ھ میں بنولحیان کی تعزیر کے لئے مہم گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی، وہ سن گن پا کر بھاگ گئے تھے)۔ ❸

سریہ ابن ابی العوجاء

۷ھ میں آنحضرت ﷺ نے داعیوں کی ایک جماعت جس میں پچاس آدمی شامل تھے قبیلہ بنی سلیم کے پاس بھیجی۔ اس گروہ کے سردار ابن ابی العوجاء تھے، انہوں نے بنوسلیم کو دعوت دی لیکن ان لوگوں نے انکار کیا اور تیراندازی شروع کی یہ لوگ بھی لڑے لیکن پچاس آدمی قبیلہ کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رئیس فوج یعنی ابن ابی العوجاء کے سوا سب شہید ہوئے۔ ❹

سریہ کعب بن عمیر

ربیع الاول ۸ھ میں آنحضرت ﷺ نے کعب بن عمیر رضی اللہ عنہ غفاری کو پندرہ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ دعوت اسلام کے لئے ذات اطلاح کی طرف روانہ کیا، یہ مقام شام کے حدود میں وادی القریٰ سے اس طرف ہے، ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی لیکن جواب وہی تیغ وسنان تھا، یہاں تک کہ یہ جماعت بھی کل کی کل شہید ہوئی صرف ایک صاحب بچ گئے جنہوں نے آ کر مدینہ میں خبر کی۔ ❺

(اس بناپر اکثر دعوتِ اسلام کے لئے جو سرایا بھیجے جاتے تھے ان کے ساتھ حفاظت کی غرض سے کچھ فوج بھی ساتھ کر دی جاتی تھی لیکن اس صورت میں بہ تصریح افسروں کو کہہ دیا جاتا تھا کہ صرف اشاعت اسلام مقصود ہے لڑائی بھڑائی کی اجازت نہیں، مثلاً: فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد بن

---

❶ طبقات ابن سعد، ذکر مغازی، ص:۳۷۔ ❷ ایضاً، ص:۳۹، ۴۰۔ ❸ ایضاً، ص:۵۷۔
❹ ایضاً، ص:۸۹۔ ❺ طبقات ابن سعد، جلد مغازی، ص:۹۲۔

ولید رضی اللہ عنہ کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا اور ۳۰ آدمیوں کی جمعیت ساتھ کر دی تو صاف فرما دیا کہ صرف دعوت اسلام مقصود ہے لڑائی مقصود نہیں۔ چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں:

بعثه الى بنى جزيمة داعيًا الى الاسلام ولم يبعثه مقاتلا۔ ❶

آنحضرت ﷺ نے خالد رضی اللہ عنہ کو بنو جزیمہ کی طرف بھیجا، دعوت اسلام کے لئے، نہ کہ لڑنے کے لئے۔

علامہ طبری اس موقع پر لکھتے ہیں:

قد كان رسول الله ﷺ بعث فيما حول مكة السرايا تدعو الى الله عزو جل ولم يامرهم بقتال۔ ❷

آنحضرت ﷺ نے مکہ کے اطراف میں سرایا بھیجے، دعوت اسلام کے لئے اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا۔

باوجود اس کے بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تلوار سے کام لیا اور آنحضرت ﷺ نے سنا تو آپ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رو ہو کر کہا: ''اے اللہ! خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں۔'' تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ جنہوں نے ایک ایک بچہ کا یہاں تک کہ کتوں کا خون بہا ادا کیا اور اس پر مزید رقم دی ❸ یہ واقعہ باختلاف الفاظ حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔

اسی طرح ۱۰ھ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب ۳۰۰ سواروں کے ساتھ یمن بھیجا تو آپ نے فرمایا:

((فاذا نزلت بساحتهم فلا تقاتلهم حتى يقاتلوك))۔ ❹

''جب تم وہاں پہنچ جاؤ تو جب تک تم پر کوئی حملہ نہ کرے تم نہ لڑنا۔''

اسی سلسلہ میں وہ سرایا بھی داخل ہیں جو فتح مکہ کے بعد بت شکنی کے لئے اطراف ملک میں روانہ کئے گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عرب میں مختلف قبیلوں کے الگ الگ بت خانے تھے فتح مکہ کے بعد جب عام طور سے قبائل نے اسلام قبول کر لیا تو بتوں کی عظمت اور جباری کا جاہلانہ اور وہم پرستانہ تخیل بعض قبائل سے دفعتاً نہ مٹ سکا۔ اب گو وہ ان کو لائق پرستش نہیں سمجھتے تھے تاہم ان کے دلوں پر ان اصنام کی وراثتاً ایک مدت سے جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اس سے یہ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان باطل پرستیوں کے مرکز کو خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیں۔ جاہلوں کو یقین تھا کہ ان مقدس پتھروں کا ایک ریزہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، مصائب اور بلاؤں کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔

❶ طبقات ابن سعد، جلد مغازی، ص:۱۰۶۔ ❷ تاریخ طبری، ج۳، ص:۱۶۴۹۔
❸ تاریخ طبری، ج ۳، ص: ۱۶۵۱۔ ❹ ابن سعد، مغازی، ص:۱۲۲۔

اہل طائف نے بیعت کرتے ہوئے شرط پیش کی تھی کہ ان کا بت خانہ ایک سال تک ڈھایا نہ جائے گا اور جب آنحضرت ﷺ نے یہ منظور نہ فرمایا تو دوسری شرط پیش کی ہم ان کو اپنے ہاتھ سے نہ توڑیں گے۔ بعض اور نومسلم قبائل بھی اس ادائے فرض میں جھجکتے تھے، اس بنا پر ان مقامات میں چند راسخ العقیدہ اور صحیح الفہم مسلمان بھیجے گئے کہ وہ ان کی طرف سے اس فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ سریہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بت خانہ عزیٰ، سریہ عمرو بن العاص بت خانہ سواع، سریہ سعد بن زید اشہلی بت خانہ منات، سریہ ابوسفیان و مغیرہ بن شعبہ بت خانہ لات، سریہ جریر بت خانہ ذی الخلصہ [1] سریہ طفیل بن عمرو دوسی بت خانہ ذی الکفین اور سریہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، بت خانہ فلس کے توڑنے کو روانہ کئے گئے۔ [2]

جنگی اصلاحات

جنگ افعال انسانی کا بدترین منظر ہے اور عرب کی جنگ تو ظلم، توحش، قساوت، سفاکی، بے دردی اور درندہ پن کا تماشا گاہ تھی۔ لیکن اعجاز نبوت سے یہی چیز تمام نقائص سے پاک ہو کر ایک مقدس فرضِ انسانی بن گئی۔ کسی ملک میں جب ہزاروں برس سے ظلم و غارت گری متوارث چلی آتی ہے تو شروع شروع میں مہذب سے مہذب حکومت کو بھی چند روز قدیم اصول اور طرز عمل کو اختیار کرنا پڑتا ہے جس کو طبی اصطلاح میں علاج بالمثل کہہ سکتے ہیں، آغاز اسلام میں حملہ آور جنگ کے وقت بعض واقعات اس قسم کے ملتے ہیں جو پہلے سے رائج تھے، مثلاً جاہلیت میں دستور تھا کہ دشمن پر بے خبری کی حالت میں جا پڑتے تھے اور قتل و قید کرتے تھے اسلام نے اس طریقہ کو مٹایا لیکن ابتدا ہی میں اگر اس پر عمل کیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ دشمن ہمیشہ دفعتہً حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو قتل کیا کرتے اور مسلمان اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکتے یا کرتے تو پہلے ان کو خبر کرتے جس کے بعد وہ کہیں ٹل جاتے یا اپنی حفاظت کا سامان کر لیتے لیکن جس قدر اسلام کو زور و قوت حاصل ہوتی گئی اسی قدر وہ قدیم طریقے مٹتے گئے، یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب کا خاتمہ ہو گیا۔ اسلام سے پہلے جنگ کا جو طریقہ تھا اور جس قسم کے وحشیانہ افعال عمل میں آتے تھے ان کو ہم تفصیل سے اوپر لکھ آئے ہیں، ان صفحات کو دوبارہ سامنے رکھ لو اور اس کے مقابلہ میں دیکھو اسلام نے کیا کیا اصلاحیں کیں؟ اس بات کو قطعاً روک دیا کہ عورتیں، بوڑھے، بچے، صغیر السن، نوکر، خادم لڑائیوں میں قتل کیے جائیں، آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب کسی مہم پر فوج بھیجی جاتی تو سردار فوج کو جو احکام دیے جاتے ان میں ایک یہ لازمی حکم بھی ہوتا [3] ابوداؤد میں یہ حکم ان الفاظ میں مذکور ہے:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ ذی الخلصۃ: ۴۳۵۵، ۴۳۵۶۔

[2] اس باب میں تمام تر واقعات ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہیں۔ (زرقانی، ج ۲ کے آخر میں ۴۰۰ تا ۴۰۲ پر بھی بعض سرایا اور بت خانوں کا ذکر ہے۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب تأمیر الامام الامراء علی البعوث ..... الخ: ۴۵۲۲۔

((لا تقتلوا شيخا فانيا ولا طفلا ولا صغيرا ولا امرأة))۔ ❶

"کسی کہن سال کو، بچے کو کمسن کو، عورت کو قتل نہ کرو۔"

غزوات میں بھی کسی عورت کی لاش آپ کی نظر سے گزرتی تو آپ نہایت سختی سے منع فرماتے، صحیح مسلم میں متعدد حدیثیں اس کے متعلق مذکور ہیں۔ ❷

اسلام سے پہلے معمول تھا کہ دشمنوں کو گرفتار کر لیتے تو کسی چیز سے باندھ کر اس کو تیروں کا نشانہ بناتے یا تلوار سے قتل کرتے، عربی میں اس طریقہ کو "صبر" کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روک دیا۔

ایک دفعہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے (عبدالرحمٰن) نے ایک لڑائی میں چند آدمیوں کو گرفتار کر کے اسی طرح قتل کرایا تھا، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے سنا تو کہا: "میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا وہ اس سے منع فرماتے تھے، خدا کی قسم! میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا۔" عبدالرحمٰن نے اسی وقت کفارۂ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کیے۔ ❸

لڑائیوں میں عہد کی کچھ پابندی نہ تھی، جنگِ معونہ وغیرہ میں کفار نے مسلمانوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا یعنی قول وقسم لے کر مسلمانوں کو ساتھ لے گئے اور گھر لے جا کر قتل کر ڈالا، قرآن مجید میں انہی واقعات کی طرف اشارہ ہے:

﴿لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ﴾۔ (۹/ التوبۃ:۱۰)

"کسی مسلمان کے متعلق وہ نہ کسی قسم کا لحاظ رکھتے ہیں نہ ذمہ داری کا اور یہ لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہیں۔"

آنحضرت ﷺ نے سخت تاکید کی کہ جو عہد کیا جائے ہر حال میں اس کی پابندی کی جائے۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق جابجا تاکیدی اور صاف احکام ہیں، عہد نبوت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں پابندیٔ عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے تو بہت سے صحابہ مجبوریوں کی وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے، ان میں حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور ان کے والد بھی تھے، جنگ بدر کے موقعہ پر حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور ان کے والد کہیں سے آ رہے تھے، کفار نے ان کو پکڑ لیا کہ تم مدینہ جا کر پھر ہمارے مقابلہ کو آؤ گے، انہوں نے کہا: ہمارا مقصد صرف مدینہ جانا ہے، کفار نے ان سے عہد لے کر چھوڑ دیا، یہ لوگ مقام بدر میں

---

❶ كتاب الجهاد، باب فى دعاء المشركين: ٢٦١٤ ابوداؤد میں یہ باب کتاب الجہاد میں مکرر (۳۵۱ اور ۳۵۴ پر ہے یہاں پہلا باب مراد ہے)۔ (س) ج۱، ص:۳۵۲۔ ❷ كتاب الجهاد، باب تحريم قتل النساء والصبيان فى الحرب: ٤٥٤٧، ٤٥٤٨؛ ابوداود، كتاب الجهاد، باب فى قتل النساء: ٢٦٦٨ تا ٢٦٧٢ میں بھی اس مفہوم کی کئی روایتیں ہیں۔

❸ ابو داود، باب قتل الاسير بالنبل: ٢٦٨٧۔

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور یہ دیکھ کر کہ رسول اللہ ﷺ کفار سے مصروف جنگ ہیں، خود بھی اس سعادت کی آرزو کی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو باز رکھا کہ تم معاہدہ کر چکے ہو۔ [1]

ابورافع کو قریش نے قاصد بنا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا بارگاہِ نبوت میں آ کر ان پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان ہو گئے اور عرض کہ اب میں کافروں میں واپس نہ جاؤں گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم قاصد ہو اور قاصد کو روک لینا عہد کے خلاف ہے اس وقت واپس جاؤ پھر آ جانا۔'' [2]

صلح حدیبیہ میں جب حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ پابہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قریش مجھ کو قید کر کے اس طرح ستاتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں لیکن قریش سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ آئے گا تو ہم قریش کے پاس بھیج دیں گے۔'' اس پر حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ نے رو کر تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا، لوگ جوش رقت سے بے قرار ہو گئے اور قریب تھا کہ قابو سے باہر ہو جائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے تاب ہو گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بار بار جاتے تھے، یہ سب کچھ تھا لیکن پابندی عہد کی قیمت ان سب خطرات سے زیادہ تھی، حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کو پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔ [3]

اسلام سے پہلے قاصدوں کا قتل کر دینا ممنوع نہ تھا۔ صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرت ﷺ نے قریش کے پاس جو قاصد بھیجا تھا قریش نے اس کی سواری کے اونٹ کو مار ڈالا اور قاصد کو بھی قتل کر دینا چاہا لیکن باہر والوں نے بچا لیا۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کیے جائیں، مسیلمہ نے جب قاصد بھیجا اور اس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''قاصد کا قتل کرنا دستور نہیں ورنہ تو قتل کر دیا جاتا۔'' [4] مؤرخین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس دن سے یہ ایک قاعدہ بن گیا کہ قاصد قتل نہیں کیے جاتے تھے۔

اسیران جنگ کے ساتھ عرب نہایت برا سلوک کرتے تھے اور تمام قوموں میں بھی یہی طریقہ جاری تھا جنگِ صلیبی میں یورپین سلطنتیں جب مسلمانوں کو لڑائیوں میں گرفتار کرتی تھیں تو ان سے جانوروں کی طرح کام لیتی تھیں۔

علامہ ابن جبیر جب حروب صلیبیہ کے زمانہ میں سسلی سے گزرے ہیں تو یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے چنانچہ لکھتے ہیں:

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الوفاء بالعهد: ٤٦٣٩ واسد الغابة، ج١، ص:٣٩١۔

[2] ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الامام یستجن به فی العهود:٢٧٥٨۔ (س)

[3] ابوجندل کے واقعہ کا ذکر اجمالا صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الحدیبیة: ٤١٨٠، ٤١٨١ پر ہے۔ نیز دیکھیں کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد: ٢٧٣١، ٢٧٣٢ اور اجمالاً ہی صحیح مسلم، باب صلح الحدیبیة: ٤٦٣١، ٤٦٣٢ پر بھی ہے لیکن تفصیل اسد الغابة، ج٥، ص:١٦١ اور اصابه، ج٧، ص:٣٣ پر ملاحظہ ہو۔

[4] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الرسل:٢٧٦١۔

ومن الفجائع التي يعاينها من حل بلادهم اسرى المسلمين يرسفون في القيود ويصرفون في الخدمة الشاقة والاسيرات المسلمات كذالك في اسواقهن خلاخيل الحديد فتنفطر لهم الافئدة۔ ❶

''اور منجملہ ان دردانگیز حالات کے جوان شہروں میں نظر آتے ہیں، اسیران اسلام ہیں جو بیڑیاں پہنے نظر آتے ہیں اور جن سے سخت محنت شاقہ لی جاتی ہے اور اسی طرح مسلمان عورتیں پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے پہنے، سخت محنت شاقہ سے کام کرتی ہیں جن کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے اسیرانِ جنگ کی نسبت تاکید کی کہ ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے، اسیرانِ بدر کو جب آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے حوالہ کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے، چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کر لیتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے ❷ غزوۂ حنین میں چھ ہزار اسیر تھے، سب چھوڑ دیے گئے اور آپ نے ان کے پہننے کے لئے چھ ہزار جوڑے (مصر کے کپڑے کے) عنایت فرمائے ❸ چنانچہ ابن سعد نے اس واقعہ کی تصریح کی ہے۔

حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی تو آپ نے عزت وحرمت سے مسجد کے ایک گوشہ میں اس کو مقیم کیا اور فرمایا کہ کوئی تمہارے شہر کا آجائے تو میں اس کے ساتھ تم کو رخصت کردوں، چنانچہ چندروز کے بعد سفر کا سامان کر کے ایک شخص کے ساتھ یمن بھجوا دیا۔ ❹

قرآن مجید میں جہاں خدا نے بندگان خاص کے اوصاف بتائے ہیں، وہاں فرمایا ہے:

﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ ﴾. (٧٦/ الدهر:٨)

''اور یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکین کو، یتیم کو اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

معمول تھا کہ جب کسی قوم پر حملہ ہوتا تو اہل فوج چاروں طرف دور دور پھیل جاتے، جس سے راستے بند ہو جاتے، گھروں میں آنا جانا مشکل ہو جاتا، راہ گیروں کا مال ومتاع لٹ جاتا، یہ طریقہ ایک مدت سے چلا آتا تھا، ایک لڑائی میں قدیم دستور کے مطابق یہی حرکتیں لوگوں سے سرزد ہوئیں، آپ نے منادی کرادی کہ جو شخص ایسا کرے گا اس کا جہاد جہاد نہیں۔

ابوداؤد میں (حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے:

غزوت مع نبي الله ﷺ غزوة كذا وكذا فضيق الناس المنازل وقطعوا الطريق

---

❶ رحله ابن جبير مطبوعه ليڈن، ١٩٠٧ء صفحه: ٣٠٧۔ ❷ ابن هشام، ج١، ص:٣٩٤۔
❸ طبقات ابن سعد في ذكر مغازي، قسم اول، جزء ثاني، ص:١١٠ تا ١١٢۔
❹ تاريخ طبري، ج٤، ص:١٧٠٨۔

فبعث نبی اللہ منادیا ینادی فی الناس ان من ضیق منزلا وقطع طریقا فلا جهاد له۔ ❶

''میں فلاں غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جا کر ان کو تنگ کیا، لوٹا مارا، آپ ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اس کا جہاد قبول نہیں۔''

ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب یہ حکم دیا کہ لوگ ادھر ادھر پھیل نہ جایا کریں تو لوگ اس طرح سمٹ کر پڑاؤ ڈالتے تھے کہ ایک چادر تان دی جاتی تو سب اس کے نیچے آ جاتے۔ ❷

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مال غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا، اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا، جاہلیت میں تو غنیمت محبوب ترین چیز تھی، تعجب یہ ہے کہ اسلام میں بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے تھے، ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا:

رجل یرید الجهاد فی سبیل اللہ وهو یبتغی عرضا من عرض الدنیا فقال النبی ﷺ ((لا اجر له)) فاعظم ذالك الناس وقالوا: للرجل عد لرسول اللہ ﷺ فلعلك لم تفهمه۔ ❸

''ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔'' یہ امر لوگوں کو بہت عجب معلوم ہوا اور لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر جا کر پوچھ، غالباً تم نے آنحضرت ﷺ کا مطلب نہیں سمجھا۔''

بار بار لوگ دوبارہ دریافت کرنے کے لئے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا فرمایا ہوگا، بالآخر جب آپ نے تیسری دفعہ بھی یہی فرمایا کہ ((لا اجر له)) یعنی ''اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔'' تب لوگوں کو یقین آیا۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چند صحابہ کو ایک قبیلہ کے مقابلہ کے لئے بھیجا، ان میں سے ایک صاحب صف سے آگے نکل گئے، قبیلہ والے روتے ہوئے آئے، انہوں نے کہا: لا الٰه الا اللّٰه کہو تو بچ جاؤ گے، لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور حملہ سے بچ گئے، اس پر ساتھیوں نے ان کو ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا۔ ابوداؤد میں صحابی کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے:

---

❶ ابو داود، کتاب الجهاد، باب ما یؤمر من انضمام العسکر: ۲۶۲۹۔ (س)

❷ ابو داود، کتاب الجهاد، باب ما یؤمر من انضمام العسکر: ۲۶۲۸۔ (س)

❸ ابو داود، باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا: ۲۵۱۶۔ (س)

فلامنی اصحابی وقالوا احرمتنا الغنیمۃ۔

''مجھ کو میرے ساتھیوں نے ملامت کی، تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا۔''

جب لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے آ کر ان کی شکایت کی تو آپ نے اس کی تحسین کی اور فرمایا: ''تم کو ایک ایک آدمی (جو چھوڑ دیے گئے) کے بدلے اتنا اتنا ثواب ملے گا۔'' ❶

قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت ''متاع دنیوی'' کا لفظ آتا تھا اور اس کی طرف انہماک اور وارفتگی پر ملامت کی جاتی تھی۔ جنگ احد میں جب اس بنا پر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے تو یہ آیت اتری:

﴿ مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ۚ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۲)

''تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلبگار تھے اور کچھ آخرت کے۔''

جنگ بدر میں لوگوں نے جب اجازت سے پہلے غنیمت لوٹنی شروع کر دی، (یا) بقول بعض مفسرین فدیہ کی خواہش سے لوگوں کو گرفتار کیا تو یہ آیت اتری:

﴿ تُرِيۡدُوۡنَ عَرَضَ الدُّنۡيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ؕ ﴾ (۸/ الانفال:۶۷)

''تم لوگ دنیا کی پونجی چاہتے ہو اور خدا آخرت چاہتا ہے۔''

باوجود ان تمام تصریحات اور بار بار کی تاکید کے غزوۂ حنین میں جو ۸ ھ میں واقع ہوا تھا، اس وجہ سے شکست ہوئی کہ لوگ غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے، صحیح بخاری غزوۂ حنین کے ذکر میں ہے:

فاقبل المسلمون علی الغنائم واستقبلونا بالسہام۔ ❷

''تو مسلمان غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور کافروں نے ہم کو تیروں پر رکھ لیا۔''

اس بنا پر موقع بہ موقع آنحضرت ﷺ اس مسئلہ کو زیادہ تصریح سے بیان فرماتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے لئے، کوئی اظہار شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے، کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا؟'' آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا)) ❸

''جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔''

بالآخر آپ ﷺ نے یہ فرما دیا کہ ''گو جہاد کسی نیت سے کیا جائے لیکن اگر مجاہد مال غنیمت قبول کرتا

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب ما یقول اذا اصبح:۵۰۸۰۔

❷ بخاری نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: فاکبینا علی الغنائم فاستقبلنا بالسہام۔ کتاب المغازی، باب قول اللّٰہ تعالیٰ:﴿ یوم حنین ﴾:۴۳۱۷۔

❸ بخاری، کتاب الجہاد، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا :۲۸۱۰ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ تعالیٰ:۴۹۱۹ تا ۴۹۲۰۔ (س)۔

ہے تو دو تہائی ثواب کم ہو جاتا ہے، پورا ثواب اسی وقت ملتا ہے جب غنیمت کو مطلق ہاتھ نہ لگائے۔" صحیح مسلم میں آنحضرت ﷺ کے خاص الفاظ یہ ہیں:

((ما من غازية تغزو فی سبيل الله فيصيبون الغنيمة الا تعجلوا ثلثی اجرهم من الاخرة ويبقى لهم الثلث وان لم يصيبوا غنيمة تم لهم اجرهم)) [1]

"جو غازی خدا کی راہ میں لڑتا ہے اور مال غنیمت لیتا ہے وہ آخرت کے ثواب کا دو ثلث یہیں لے لیتا ہے اور آخرت میں اس کا حصہ صرف ایک تہائی رہ جاتا ہے، البتہ اگر غنیمت مطلق نہ لے تو اس کو آخرت میں پورا اجر ملے گا۔"

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ غنیمت جو سب سے محبوب چیز تھی دلوں سے اُتر گئی اور جہاد صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود رہ گیا، واقعۂ ذیل سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، آنحضرت ﷺ جب تبوک کی مہم پر روانہ ہوئے تو ان کے پاس سامان نہ تھا، مدینہ میں آواز دیتے پھرے کہ "کوئی ہے جو ایسے شخص کو سواری دے کہ جو کچھ مال غنیمت ہاتھ آئے گا اس میں برابر کا شریک ہوگا۔ ایک انصاری نے سواری اور خوراک سب اپنے ذمہ لی، اس مہم میں کئی اونٹ ہاتھ آئے، حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ واپس آ کر سب اونٹ انصاری کے پاس لے گئے اور کہا: یہ وہ اونٹ ہیں جن کی نسبت میں نے شرط کی تھی کہ آپ بھی اس میں حصہ دار ہوں گے، انہوں نے کہا: "ان کو تم ہی لو، میرا شرکت سے کچھ اور ارادہ تھا۔" (یعنی اونٹ میں نہیں، بلکہ جہاد کے ثواب میں شرکت مقصود تھی) [2]

دوران جنگ میں دشمن کے مال اور جائیداد کا لوٹنا بھی عام رواج تھا، خصوصاً جب کہ رسد ٹھہر جاتی تھی اور کھانے پینے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا تو ہر حال میں یہ فعل جائز سمجھا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ نے اس کی سخت ممانعت کی اور سرے سے اس طریقہ کو روک دیا، ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے اور غایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی، اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا، سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی آپ ﷺ موقعہ پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا اور ہانڈیاں ابال کھا رہی تھیں، آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، آپ نے اس سے ہانڈیاں الٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا: "لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے۔" [3]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب بيان قدر ثواب من غزافغنم، الخ:٤٩٢٥ وابو داود، كتاب الجهاد، باب فی السرية تخفق: ٢٤٩٧ ـ(س)

[2] ابو داود، كتاب الجهاد، باب فی الرجل يكری دابته علی النصف اوالسهم:٢٦٧٦، (س)

[3] ابو داود، كتاب الجهاد، باب فی النهی عن النهبی اذا كان فی الطعام قلة:٢٧٠٥ (س)

لڑائی عبادت بن گئی

اسلام نے جہاد کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے اس قدر پاک اور منزہ کر دیا کہ وہ افضل ترین عبادت بن گئی، جہاد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مظلوموں کو ظلم سے بچائے، جابر اور ظالم، کمزور آدمیوں پر دست ستم دراز نہ کرنے پائیں:

﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۹، ۴۰)

''جن لوگوں سے لوگ لڑائی کرتے ہیں ان کو اس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ ان پر ظلم کیا گیا اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے، وہ لوگ جو اپنے گھروں سے صرف اس بنا پر نکال دیے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔''

ملک میں جو ہمیشہ فتنہ و فساد برپا رہتا تھا اور لوگ امن و امان سے بسر نہیں کر سکتے تھے، جہاد اس غرض سے تھا کہ فساد کو مٹا دے اور امن قائم کر دے:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾. (۸/ الانفال:۳۹)

''اور ان سے لڑو، تاکہ فتنہ نہ رہے۔''

جو لوگ خدا پر اور جزا و سزا پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اس وجہ سے ان کے نزدیک ہر قسم کے ظلم و ستم جائز تھے اور ان کو جائز و ناجائز کی کچھ تمیز نہ تھی، جہاد سے ان کا زیر کرنا اور ان لوگوں کو ان کے ظلم سے بچانا مقصود قرار دیا گیا:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾.

(۹/ التوبۃ:۲۹)

''ان لوگوں سے لڑو جو نہ اللہ پر اعتقاد رکھتے ہیں نہ قیامت پر اور جن کاموں کو اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہے اس کو حرام نہیں سمجھتے۔''

جہاد میں فتح پانے اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں قرار دیا گیا کہ فاتح مال و دولت اور حکومت کا لطف اٹھائیں بلکہ یہ غرض قرار دی گئی کہ لوگوں کو عبادت، وریاضت اور فقرا کی دستگیری کی تلقین کریں اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برے کاموں سے لوگوں کو روک دیں:

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ ﴾. (۲۲/ الحج:۴۱)

''وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دیں تو وہ نماز کے پابند ہوں گے، زکوۃ ادا کریں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔''

کسی ملک کی فتح سے جو مال و دولت ہاتھ آتا تھا وہ فاتح کا خاص حصہ ہوتا تھا جس کو وہ اپنے مصارف عیش میں استعمال کرتا تھا اور دربار کے امراء درجہ بدرجہ اس سے مستفید ہوتے تھے لیکن اس کا مصرف یہ قرار دیا:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ (٨/ الانفال:٤١)

''اور جان لو کہ تم کو جو کچھ مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں ❶ حصہ اللہ کا ہے اور رسول کا اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا۔''

جہاد نہ صرف حقیقت کے لحاظ سے بلکہ صورتاً بھی عبادت بنا دیا گیا، مجاہدین کو تاکید تھی کہ عین جنگ کے وقت بھی خدا کا نام لیتے رہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾.

(٨/ الانفال:٤٥)

''مسلمانو! جب کسی گروہ سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ تم کامیاب ہو گے۔''

نماز میں جس طرح اٹھتے بیٹھتے تکبیر و تسبیح یعنی اللہ اکبر اور سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہیں جہاد میں بھی یہی حکم تھا، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم جب کسی بلندی پر چڑھتے تھے تو اللہ اکبر کہتے تھے اور جب نیچے اترتے تو سبحان اللہ کہتے تھے، بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تو تین دفعہ اللہ اکبر کہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ جہاد پر جا رہے تھے، صحابہ زور زور سے تہلیل کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اس قدر شور سے نہیں کہنا چاہیے کیونکہ خدا جس کو تم پکارتے ہو وہ بہرا نہیں ہے۔'' ❷ بعینہٖ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نماز میں پکار کر قرآن پڑھنے سے منع فرمایا تھا۔ ❸

نکتہ

ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جہاد میں دستور تھا کہ چڑھائیاں آتی تھیں تو تکبیر کہتے تھے اور اتار آتا تو تسبیح پڑھتے تھے، ❹ نماز بھی اسی اصول پر قائم کی گئی یعنی سر اٹھاتے ہیں تو اللہ اکبر اور سجدہ میں جاتے ہیں تو سبحان اللہ کہتے ہیں اس روایت میں ادائے مطلب میں ذرا فرق آ گیا ہے، جہاد کے اصول پر نماز نہیں قائم کی گئی، بلکہ جہاد میں نماز کا طریقہ ملحوظ رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ نماز ابتدائے

❶ اس پانچویں حصہ کے سوا باقی تمام مال غنیمت مجاہدین کا حق ہے۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب مایكره من رفع الصوت في التكبير: ٢٩٩٢۔

❸ مسند احمد، ج ١، ص: ٩٧ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور جلد دوم میں کئی جگہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اس مفہوم کی روایتیں ہیں۔ ❹ ابوداود، كتاب الجهاد، باب مايقول اذا سافر: ٢٥٩٩ اصل عبارت یہ ہے: وكان النبي ﷺ وجيوشه اذا علوا الثنايا كبروا واذا هبطوا سبحوا فوضعت الصلوة على ذلك۔

اسلام سے وجود میں آئی اور جہاد کی تاریخ ہجرت کے بعد سے شروع ہوتی ہے، بہر حال اس روایت سے اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ نماز اور جہاد دونوں میں ایسی مشابہت تھی کہ ایک کو اصل اور دوسرے کو اس کی نقل سمجھتے تھے۔ غرض وہی جنگ جو ہر طرح کے ظلم وستم اور جہالت ووحشت کا مجموعہ تھی اسلام کی تعلیم ربانی نے اس کو اعلائے کلمۃ اللہ، قیام امن، رفع مفاسد، نصرت مظلوم اور تسبیح وتہلیل کی صورت میں بدل دیا۔

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز

جہاد کے معرکوں میں آپ ﷺ کے ہاتھ میں گو تیغ وسپر اور جسم مبارک پر خود ومغفر ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا تھا۔ عین اس وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آرہی ہیں، عین اس حالت میں آنحضرت ﷺ کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے، جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سر مبارک سجدہ نیاز میں ہے، معرکۂ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ عین شدت جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔ [1] فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا، فاتح بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھا لیتا ہے اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے، دفعتاً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ [2] حنین میں دشمن نے دفعتاً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے ۱۲۰۰۰ ہزار آدمیوں میں سے ایک [3] بھی پہلو میں نہیں سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے آرہے ہیں لیکن مرکز حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پر جلال آواز آرہی ہے:

انا النبی لا كذب [4] ''میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں۔''

عین اس وقت جبکہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آجاتا ہے، دفعتاً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار، امام نماز ہے، فوجیں صفوف نماز میں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند کر رہی ہیں، جوش وخروش، تہور وجانبازی، غیظ وغضب، اب عجز ونیاز، تضرع وزاری اور خضوع وخشوع بن جاتا ہے، صفیں دو دو رکعت ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں، ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں، یہ دو رکعت ادا کر کے پھر اپنی پہلی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں اور مشغولین جنگ آ کر بقیہ نماز پوری کر لیتے ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں، امام (رسول) اول سے آخر تک عبادتِ الٰہی

---

[1] طبقات ابن سعد، ذکر مغازی، ص:١٧۔ [2] طبقات ابن سعد، جلد غزوات، ص:١٠٩، ١١٣۔

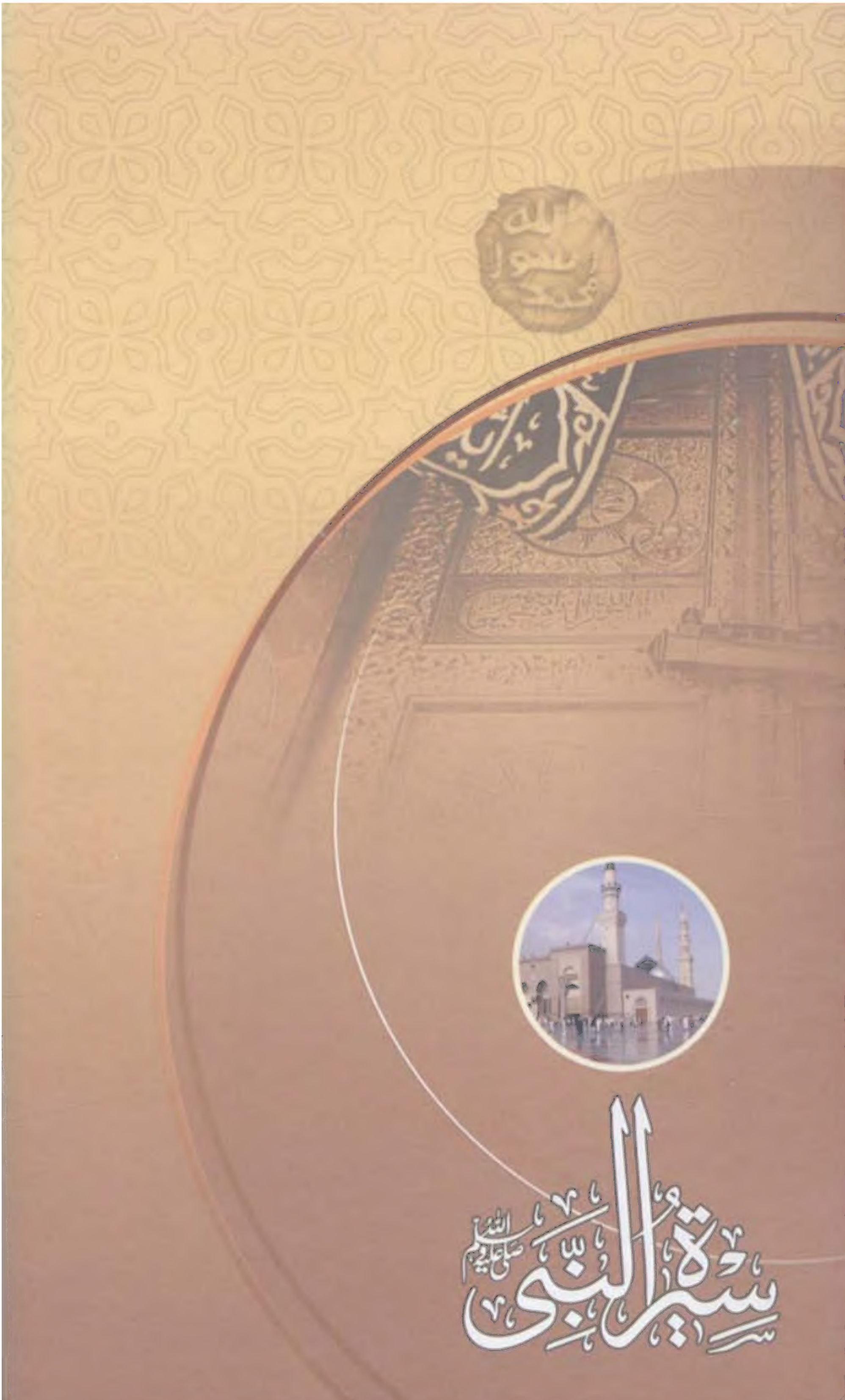
[3] چند خاص رفقا کے سوا (س) [4] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة حنين:٤٦١٧ وصحيح بخاری، کتاب المغازی، باب قول الله: ﴿ويوم حنين﴾ الخ:٤٣١٧۔

میں مصروف ہے۔

تعلیم وارشاد، ہدایت وتلقین، تہذیب وتزکیہ کا کام ہروقت جاری ہے، عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں چور ہیں، مال غنیمت فروخت ہورہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہورہی ہیں، ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوش مسرت میں کہتے ہیں: ''یارسول اللہ ﷺ! آج میں نے مال غنیمت سے جس قدر نفع اٹھایا، کبھی نہیں اٹھایا تھا، پورے تین سو اوقیہ ہاتھ آئے۔'' (اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ''میں اس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں؟'' وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں کیا؟ ارشاد ہوتا ہے: ''نماز فرض کے بعد دو رکعتیں۔'' [1]

تَمَّ الْمُجَلَّدُ الْاَوَّلُ مِنَ السِّيْرَةِ النَّبَوِيَّةِ عَلٰی صَاحِبِهَا الصَّلٰوةُ وَالتَّحِيَّةُ.

[1] ابوداود، کتاب الجهاد، باب التجارة فی الغزو: ٢٧٨٥۔


سیرۃ النبی ﷺ